مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان

کا

افاداتِ گیلانیؒ نمبر

بیادگارِ

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہٗ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قیمت ——— دو روپیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

۱۔ دلی افسوس ہے کہ یہ نمبر جس کو پہلے اعلان کے مطابق ۱۵ مئی کو شائع ہو جانا چاہیے تھا، جولائی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو رہا ہے، گویا دوسرا اعلان جو ۳۰ جون کا کیا گیا تھا اس سے بھی ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی۔ یہ دوسرے اعلان کی خلاف ورزی شائقین پر بیحد شاق گزری ہوگی۔ مگر قضا و قدر پر کسی کا بس نہیں۔ راقم سطور جو ۲۲ جون تک بالکل صحتمند تھا ۲۲ جون سے یکایک انفلوئنزا کی وبا کی لپیٹ میں آگیا۔ جس نے مکمل ایک ہفتہ معطل رکھا اور اس طرح سوچا سمجھا سارا پروگرام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اگر یہ مجبوری پیش آجاتی تو پوری امید تھی کہ نمبر وقت پر نکل جاتا۔ صرف اسی مجبوری کے باعث ایک ہفتہ کی یہ مزید تاخیر ہوئی۔ امید ہے کہ ناظرین زحمت انتظار کی ناگواری اس اطلاع کے بعد معاف فرما دیں گے۔

۲۔ یہ نمبر اپنی ضخامت کے لحاظ سے چار اور مواد کے اعتبار سے پانچ ماہ سے بھی زائد کا ہے،[لہ] مگر اس کو صرف تین ماہ کے شماروں کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، یعنی شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ۔ اس طور پر یہ اس سال کا آخری شمارہ بھی ہے۔ گویا الفرقان کی چوبیسویں جلد اس نمبر پر تمام ہو گئی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ اب اس کے بعد والا شمارہ پچیسویں جلد کا پہلا شمارہ (بابت ماہ محرم سنہ ۷۶ھ) ہوگا جو انشاء اللہ تعالیٰ ۱۵ اگست کو شائع ہوگا۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی
۳۰ جون ۵۶ء

لہ ناظرین اگر غور فرمائیں گے تو محسوس ہوگا کہ نمبر کے ہر صفحہ میں عام شماروں کے تقریباً ڈیوڑھ صفحے کا مضمون آیا ہے۔

جلد (۲۴) | بابت ماہ شوال، ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق جولائی ۱۹۵۷ء | شمارہ ۱۰-۱۱-۱۲

اگر اس ◯ دائرہ میں سُرخ نشان لگا ہے

تو اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۱۴ر تاریخ تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ر تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۵ر تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں اگلے رسالہ کے ساتھ مکرر بھیجدیا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ گیلانی (ضلع پٹنہ، صوبہ بہار) کے ایک متمول اور ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد کافی عرصہ ٹونک رہے، اور پھر اس سلسلہ کی تکمیل دارالعلوم دیوبند پہونچ کر کی۔ دارالعلوم میں ان کا جوہر استعداد کافی نمایاں ہو چکا تھا۔ جس کی وہاں کے اہل نظر ارباب اختیار نے مختلف طریقوں سے قدر شناسی کی۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں دینیات کے استاذ کی حیثیت سے ہو گیا۔ جس سے ترقی کر کے وہ شعبہ کی صدارت تک پہونچے۔ بالآخر ۴۹ء میں پنشن پا کر گیلانی تشریف لے آئے۔ پنشن کے بعد کے دور میں جو فرصت میسر آئی تو وہ ہمہ تن تحریر و تصنیف کی طرف متوجہ ہو گئے اور ۵۳ء تک (تقریباً پانچ سال) ان کا دریائے علم و تحقیق مجلاتی مقالات اور بعض ضخیم تصنیفات کی شکلوں میں خوب خوب روانی اور جولانی دکھاتا رہا۔ ۵۳ء کے اخیر میں مولانا پر قلبی شکایت کا حملہ ہوا — افاقہ ہو گیا۔ مگر ۵۴ء میں چند ماہ بعد پھر شکایات نے عود کیا اور اس کا حملہ بڑا سخت بھی تھا اور طویل بھی۔ مولانا کا قلم جو پہلے حملے سے صحت پا کر پھر چل کھڑا ہوا تھا اب بالکل رک گیا۔ کئی مہینے علاج معالجہ کے سخت اور اعلیٰ ترین اہتمامات کے بعد (جو ان کے محب و محبوب بھائی سید مکارم احسن صاحب کی بلند ہمتی کا نتیجہ تھے) شکایات کی شدت میں گو تخفیف ہو گئی مگر گزری ہوئی شدت نے اب انھیں کام کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ معالجین کی طرف سے بھی قطعی ممانعت تھی۔

تعطل کا یہ دور تقریباً دو سال کھنچا جس میں صحت اور مرض میں برابر کشمکش ہوتی رہی۔ اس دور کے لیے انھوں نے اُس زمانہ کے بعض خطوط میں "برزخی دور" کی تعبیر استعمال کی ہے۔ اور اس کے طول پر ایک مرتبہ

ایک گرامی نامہ میں اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر بھی رقم فرمایا:

کمزور رہی میری صحت بھی کمزور رہی مری بیماری
اچھا جو رہا، کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

آخر کار وہ جس گھڑی کے لیے بے چین تھے ۵ رجون ۱۹۵۶ء کو وہ آپہونچی اور انھوں نے اس جذب و مستی اور اس شوق لقا کے ساتھ دار البقاء کی طرف رحلت فرمائی جو خاصان خدا کی علامت اور عشاق ازلی کی پرانی رسم ہے۔ برّد اللہ مضجعہ ونوّر ضریحہ وقدّس سرّہٗ ــــ ویرحم اللہ عبدا قال آمینا

مرحوم اپنے وقت کے فرد فرید اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے بظاہر خاتم تھے۔ ان کا علم ہمہ جہت تھا اور قلم ہر دم رواں دواں چنانچہ ان کے قلم سے اسلامی لٹریچر میں جو گرانقدر اضافہ ہوا ہے ممکن نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جاسکے۔ ابو ذر غفاری۔ النبی الخاتم۔ الدین القیم۔ اسلامی معاشیات۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی۔ اور تدوین حدیث۔ ان کی ایسی تصنیفات ہیں، جن سے مدتوں علم و تحقیق کے چراغ روشن ہوتے رہیں گے ــــ ان مستقل تصنیفات کے علاوہ ہندوستان کا کوئی مشہور علمی و دینی مجلہ ایسا نہیں ہے جس کے صفحات پر اُن کے نقوش قلم ثبت نہوں۔ اور جس کا دامن مولانا کے نتائج فکر سے خالی رہا ہو۔ الفرقان بھی کوئی تیرہ سال تک اس ذات گرامی سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اور اس درجہ خصوصیت رہی کہ درمیان میں ایک سال مولانا نے اپنی اعزازی ادارت کا فخر بھی الفرقان کو بخشا۔

ایسی عظیم المرتبت اور ناقابل فراموش ہستی کی یاد میں ایک خاص نمبر کی اشاعت دل کا ایک قدرتی تقاضہ تھا، خیال ہوا کہ اگر یادگاری نمبروں کے عام طریقہ سے ہٹ کر اس نمبر کی نوعیت یہ رکھی جائے کہ مولانا کے مضامین و مقالات میں سے جو چیزیں کتابی شکل میں نہیں آسکی ہیں ان میں سے اہم چیزوں کا انتخاب کر کے صرف انھیں سے یہ نمبر ترتیب دیدیا جائے تو اس بہانے ان منتخبات کو بھی کتابی شکل مل جائے گی، چنانچہ اس نمبر کی نوعیت یہی ہے کہ الفرقان میں شائع شدہ مولانا کے مضامین و مقالات میں سے چند کو منتخب کر کے یہ نمبر ترتیب دیا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ان منتخبات کا تعارف کرایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الفرقان میں شائع شدہ مولانا کے مضامین و مقالات کی پوری فہرست کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے تاکہ مولانا کے افادات کا جو خزانہ الفرقان میں محفوظ ہے اسکی ایک فہرست لوگوں کے ہاتھ میں آجائے اور کسی وقت کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکے۔

۱۔ مولانا کا سب سے پہلا مقالہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر "الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ" الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا۔ اس کا تعارف آگے اس نمبر کے شذرات کے ذیل میں آئے گا۔

۲۔ اس مقالہ کے بعد اسی سنہ کے آخری شمارہ (بابت ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ) سے مولانا کا دوسرا مضمون "دار العلوم دیوبند" پر شروع ہوا جو صفر ۱۳۵۸ھ کے شمارہ میں تیسری قسط پر تمام ہوا۔ یہ مضمون دراصل دار العلوم دیوبند کے متعلق ایک استفسار کا جواب ہے جو حکومت آصفیہ (حیدرآباد) کے ایک تعلیمی افسر کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اس میں مولانا نے اپنے خاص تحریری اسلوب کے بجائے نہایت سادہ اور معروف انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ـــــــ یہ مضمون ۴۴ صفحات پر ہے، اور اسے ہم دار العلوم، اس کے مقاصد اور منافع کا بہترین تعارف قرار دے سکتے ہیں ـــــــ اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ دار العلوم کے مولانا گیلانی جیسے بالغ نظر، دقیقہ رس فرزند جلیل کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔

۳۔ مجدد الف ثانی نمبر میں مولانا کا جو مقالہ شائع ہوا تھا وہ ناتمام رہ گیا تھا۔ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ کے شمارہ میں اس مقالہ کی دوسری قسط شائع ہوئی۔ مگر افسوس کہ اس پر بھی یہ مقالہ ناتمام ہی رہا۔

۴۔ ۱۳۵۸ھ ہی میں شوال و ذیقعدہ کے مشترک شمارہ سے مولانا کا نہایت اہم علمی مقالہ "امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" شروع ہوا۔ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ میں اسکی دوسری قسط شائع ہوئی اور صفر و ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کے مشترک شمارہ میں تیسری قسط۔ یہ کل ۵۴ صفحات ہیں۔ الفرقان میں تو یہ سلسلہ نہ معلوم کیوں اتنے صفحات پر رک گیا لیکن بعد میں یہ چند قطرے بڑھ کر دریا بنے اور چار سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب تیار ہو گئی جو اسی نام (امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی) سے کراچی سے شائع ہوئی۔ اور اُسے ان کی تصانیف میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

۵۔ مجدد نمبر کے بعد ۱۳۵۹ھ میں الفرقان کا دوسرا عظیم الشان خاص نمبر "شاہ ولی اللہ نمبر" شائع ہوا۔ اس میں مولانا گیلانی کا مجدد صاحب کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ پر دوسرا معرکۃ الآرا مقالہ آیا۔ یہ مقالہ ایک پورا رسالہ ہے جو باریک قلم کے ۱۲۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور کتب خانہ الفرقان نے اس نمبر کے بعد علٰحدہ بھی شائع کیا تھا۔ یہ بھی مولانا کی وسعتِ نظر اور دقتِ فکر کا شاہکار ہے، اور جیسا کہ اُن کے مقالات کا عموماً انداز ہوتا ہے، معلومات کا ایک بحرِ مواج ہے جو قلم کو قابو میں نہیں رہنے دیتا اور ہر ہر ضمنی بات پر بھی بہتا ہوا وہ بار بار اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اصل موضوع کی طرف واپسی تک ضمنی معلومات کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اس میں بھی مولانا نے مجدد صاحب والے مقالہ کی طرح پہلے بڑی تفصیل کے ساتھ اس تاریک ماحول اور طوفانی عہد کا نقشہ کھینچا ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی اور جس میں آپ کی ابتدائی زندگی گزری

کہ ـــ اجمالاً خود مولانا ہی کے الفاظ میں۔

"اس وقت ہر چہار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جاتا تھا۔ شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھی جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا "اعزّہ" کو "اذلّہ" بنانے میں بیدردی سے سرگرم تھا۔ دونوں قوتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مآثر و نشانات، ان کے نام لیواؤں اور وابستوں کا بالکلیہ قلع قمع کرنے پر دونوں اُدھار کھائے بیٹھے تھے، تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں ـــ اور یہ تو بیرونی فتنے تھے، اندر ایرانیوں اور تورانیوں پھر ان کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض و مقاصد کی کش مکش سے "اسلامی حکومت ہند" کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔ ان سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ صوفیا کے غلط تصوف، اور فقہاء کے غلط تفقہ، حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہلی حمیت نے امت کے شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا ـــ اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء اور شعراء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماء ارباب فکر و نظر اور تعلیم و تدریس، و تصنیف و تالیف کے نظام پر پڑ رہا تھا۔ اسکی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق، قرآن و حدیث، تحقیقی فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر بے معنی لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث کے گورکھ دھندوں میں الجھ الجھ کر "خسر الدنیا والآخرہ" کی صورت پیدا کر رہا تھا کہ ان لاحاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ان کو دنیا میں مل سکتا تھا نہ آخرت میں ...."

اسی اجمال کی تفصیل ہے جو اس مقالہ کے تقریباً ۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس میں مولانا کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا بصیرت افروز منظر دیکھ کر اسلامی ہند کی تاریخ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے کہ "ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی، کیسے ان باریک گوشوں تک پہونچی" اور خیال کرنے لگتا ہے کہ "اگر ان کی تعلیم خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخ ہند ہو بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مورخ ہندوستان

میں نہ ہوتا۔"

اس تفصیل کے بعد ولی اللّٰہی کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ نے اسلام کی کشتی کو اس منجدھار سے نکالنے کے لیے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کیا کیا کام کس طریقے سے انجام دلائے۔

۶۔ شاہ ولی اللہ نمبر کے بعد سنہ ۶۰ھ کے فائل میں مولانا گیلانی کا کوئی مضمون نہیں ہے۔ سنہ ۷۱ھ کی جلد میں البتہ چار چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ جن میں سے دو تو مولانا کی مشہور تصنیف "الدین القیم" کے دو حصے ہیں جو کتاب کی اشاعت سے قبل مولانا نے الفرقان کے لیے عنایت فرما دیے تھے۔ باقی دو میں سے ایک عید الاضحیٰ پر ہے، "بقر عید یا علمی اسلام کا پہلا دن" کے عنوان سے۔ دوسرا معراج پر ہے جس کا عنوان ہے "عالم غیب کا طویل سفر"۔ یہ درحقیقت ایک ریڈیائی تقریر ہے۔ دونوں مضمون مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور مولانا کی خاص علمی شان کے مظہر ہیں۔

۷۔ مولانا کی ایک اہم کتاب "اسلامی معاشیات" ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا بار تو ادارۂ الفرقان اپنے وسائل کی قلت کی وجہ سے نہ اٹھا سکا مگر اس کے مضامین کی نقاب کشائی کا فخر ادلاً الفرقان ہی کے حصہ میں آیا۔ الفرقان صفر و ربیع الاول سنہ ۶۲ھ میں اس کا ایک پورا باب ۴۴ صفحہ پر شائع ہوا اور کوئی سال بھر تک اس کے مختلف حصے الفرقان میں مسلسل نکلتے رہے، اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا بڑا حصہ پہلے الفرقان میں شائع ہوا۔

۸۔ سنہ ۴۷ء میں تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور جان و مال کی تباہی کا طوفانی عہد گزر جانے کے بعد مستقبل میں دین کی حفاظت اور باعزت زندگی کے دو اہم سوال مسلمانوں کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ ہر حساس اور صاحب فکر مسلمان نے وقت کے ان اہم مسائل سے تعرض کیا، مولانا بھی کیسے بے تعلق رہ سکتے تھے چنانچہ شوال سنہ ۶۶ھ کے الفرقان میں "چند تجاویز" کے عنوان سے مولانا کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا جس کا خاص تعلق پہلے مسئلہ سے ہے، اور اگلے ہی شمارہ میں دوسرا مضمون "ان دیکھی قوت کا ایک گم شدہ خزانہ" آیا جس کا رُخ "باعزت زندگی" کے سوال کی طرف تھا۔ افسوس ہے کہ یہ مضمون ادھورا رہ گیا، ورنہ اگر پورا ہو جاتا تو بڑی مفید اور پُر از معلومات چیز ہوتی۔ اس میں مولانا نے تمہیدی باتوں کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سے مثالیں پیش کر کے یہ بتانا چاہا تھا کہ اخلاق اور سیرت کی مضبوطی ایسی موثر قوت ہے کہ ظاہری قوت سے محرومی کے باوجود اس قوت کے حاملین ہر جگہ جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس پہلی قسط میں صرف ہندوستان اور چین کی مثالیں آئی تھیں پتہ نہیں آگے مولانا ہی نہ لکھ سکے یا کیا ہوا۔ بہر حال الفرقان میں اس مضمون کو نامکمل پا کر افسوس ہوا۔

۹۔ سنہ ۶۷ھ میں ادارۂ الفرقان کو حج کے موقع پر الفرقان کا حج نمبر نکالنے کا خیال ہوا۔ مضمون کے لیے مولانا سے بھی عرض کیا گیا۔ چنانچہ مولانا کا ایک ۳۴ صفحے کا مقالہ حج کی حقیقت پر آیا۔ عنوان تھا "حج کیا ہے؟" یہ اس نمبر کا خاص مقالہ تھا۔ یہ چونکہ پیش نظر نمبر میں بھی شامل ہے اس لیے اس کا تعارف آگے ذرا تفصیل سے آئے گا۔

۱۰۔ سنہ ۶۸ھ مطابق سنہ ۴۹ء میں مولانا چونکہ حیدرآباد سے پنشن لے کر مستقل طور سے اپنی "کہنی قیام گاہ" گیلانی

میں قیام فرما ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کے لیے کمل فرصت میسر آگئی تھی، لہٰذا ذی الحجہ سنہ ۶۸ھ کے شمارہ سے مولانا کا سب سے زیادہ طویل مضمون "دجالی فتنہ اور سورہ کہف" شروع ہوا جو ۱۰ قسطوں میں ۲۷۰ صفحات پر جمادی الاخری سنہ ۷۱ھ کے الفرقان میں پورا ہوا۔ یہ مضمون بھی اس نمبر میں شامل ہے، بلکہ نمبر کا سہرا دراصل اسی مضمون کے سر ہے اس لیے اس کا تعارف بھی آگے مندرجات کے ذیل میں کرایا جائے گا۔

۱۱۔ سنہ ۶۸ھ کے بعد سنہ ۶۹ھ سنہ ۷۰ھ میں بھی الفرقان کا حج نمبر نکلا۔ سنہ ۶۹ھ کے حج نمبر میں مولانا کا مضمون "دربار نبوت کی حاضری" شائع ہوا جو مولانا کے سفر مدینہ کی سرگزشت تھی۔ سنہ ۷۰ھ کے حج نمبر میں مدینہ سے مکہ تک کا سفرنامہ آیا جس کا عنوان تھا "راہ کعبہ کے احساسات و واردات"۔ سنہ ۷۰ھ کے بعد حج نمبر کے عنوان سے الفرقان کا خاص نمبر تو نہیں نکلا البتہ قیام مکہ اور حج کے جو حوال مولانا کی روداد سفر میں سے باقی رہ گئے تھے رمضان شوال سنہ ۷۱ھ کے شمارہ میں "اللہ کے گھر پہ چکر" کے عنوان سے مولانا نے وہ بھی سپرد قلم فرما دیئے۔ اور اس طرح تین قسطوں میں مولانا کا سفرنامہ حجاز شائع ہو گیا۔

۱۲۔ رمضان شوال سنہ ۷۱ھ کے شمارہ سے پہلے شعبان کے شمارہ میں رمضان کی مناسبت سے مولانا کا ایک مضمون "روزہ اور قرآن" بھی شائع ہوا تھا جس میں خالص قرآنی نقطۂ نظر سے روزہ کی حقیقت اور اسکے رموز و اسرار پر روشنی ڈالی گئی تھی، اور روزہ کی حکمتوں کے بارے میں متجددانہ نقطۂ نظر پر تنقید کی گئی تھی۔

۱۳۔ ذی الحجہ سنہ ۷۱ھ سے مولانا نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جس کا عنوان تھا "ھادم اللذات" (یعنی موت) اس عنوان کے تحت، مولانا کا ارادہ (خود مولانا ہی کے الفاظ میں) یہ تھا کہ

"ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے، ان ہی کا ذکر اس عنوان کے تحت ان شاء اللہ کیا جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ابتدا میں تو چند خاص استثنائی حوادث کا تذکرہ کیا جائے گا۔ بعد کو ارادہ یہی ہے کہ اللہ اسے پورا کرے کہ، مرتے ہوئے، مرنے والوں پر جو کچھ گزری اتفاقاً کتابوں میں اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے حتی الوسع اسی کو جمع کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ آئندہ وہ کوئی کتاب ہی بن جائے۔" (الفرقان ذی الحجہ سنہ ۷۱ھ)

چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی اور دوسری قسط (صفر سنہ ۷۲ھ تک) میں تو مولانا نے چند ایسے استثنائی واقعات پیش فرمائے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والوں کی روح زندوں کے ساتھ تعلق قائم کر سکتی ہے۔ بعد کے مضامین میں اچھی اور بری زندگی گزار کر مرنے والوں کی موت کے وقت کی تصویر کشی کا سلسلہ شروع کیا اور

اس کے لیے انداز ایسا اختیار کیا جس سے ان واقعات کے بیان پر "ہادم اللذات" کا عنوان بالکل مناسب آگیا۔ اچھی زندگی گزار کر مرنے والوں کی موت کے وقت کا تذکرہ تو مولانا نے کہیں کہیں صرف ضمناً آ گیا اصل مقصود صرف غفلت وطغیان اور لذت کوشی کی زندگی گزارنے والوں کی موت کا تذکرہ تھا کہ موت کے پنجہ نے کس طرح چشم زدن میں انھیں ساری شوخی اور لذت کوشی بھلا دی اور خود انھیں کی زبان سے اعتراف کرا دیا کہ وہ بڑے خسارے میں ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا تذکرہ عضد الدولہ دیلمی کا ہے کہ وہ کیا تھا، قدرت کی عنایت سے کیا بنا، افلاس کی گود میں پلا تھا بڑے ہو کر تخت حکومت پر پہونچا خوب گلچھرے اڑائے۔ سر بام کبریائی پر کمندیں ڈالیں مگر کتنے دن صرف چند سال یہ قصہ رہ سکا یکایک موت کے پنجے نے آدبایا۔ اور اسکی زبان سے اعتراف کرایا کہ "آج مجھ سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا جس کی دنیا بھی برباد ہوئی اور اپنی ابلہی کا شکار ہو کر اپنے دین کو بھی وہ کھو بیٹھا۔"

اسی طرح مولانا نے بنوامیہ کے تین گورنروں۔ یزید۔ حجاج، اور خالد تینوں کی زندگیوں کو اسی سلسلہ کے الگ الگ مضامین میں بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ اور ان کے ظلم وطغیان اور اقتدار کی مستی کی مکمل تصویر دکھانے کے بعد دکھایا کہ انھیں کیسی موت سے واسطہ پڑا اور موت کے وقت ان پر کیا گزری اور کیا کہتے ہوئے وہ مرے ـــ یہ دنیا کی بے ثباتی کے بڑے عبرت انگیز مرقعے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون جسکا تعلق حجاج کی موت سے ہے سلسلہ "ہادم اللذات" کے نمونہ کے طور پر اس نمبر میں بھی شامل کیا گیا ہے جسکا عنوان ہے "وفاشعاری کے دو نادر نمونے"۔ اس میں مولانا نے حجاج کے بالمقابل ایک اور صالح شخصیت کی موت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جنھوں نے فقہ حنفی کے بانی حضرت امام ابراہیم نخعیؒ کی زندگی بچانے کے لیے اپنی جان حجاج کے ظلم کی نذر کر دی۔

۱۴۔ اس سلسلہ کے بعد مولانا کے دو مضمون اور شائع ہوئے۔ (جنھیں چاہا جائے تو اس سلسلہ میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے) ایک شیر شاہ سوریؒ کے عہد حکومت سے متعلق تھا، دوسرا حضرت مولانا قاری عبد الرحمن پانی پتیؒ کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر۔ شیر شاہ سوری سے متعلق مضمون مولانا کی خاص تحقیقی شان اور ذہانت کا مظہر ہے۔ مولانا نے شیر شاہ کے پنج سالہ عہد حکومت کے کارناموں کو ایک "پنج سالہ اسکیم" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور دکھایا ہے کہ مرحوم بادشاہ نے اس تھوڑی سی مدت میں رفاہ عامہ اور امن وامان کے سلسلہ میں کیسے پائیدار اور وسیع وعریض کام کیے کہ ان سے آج "پنج سالہ اسکیموں" کے دور میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ـــ ساتھ ہی شیر شاہ کے دینی مقام کو بھی آشکارا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

یہ ہے الفرقان میں شائع ہونے والے مولانا کے مضامین کی مختصر فہرست۔ اور اس میں وہ مضامین درج نہیں کیے گئے ہیں جو دوسری جگہ اشاعت کے بعد مولانا کی فرمائش پر یا بغیر فرمائش کے الفرقان میں نقل کیے گئے۔

اب آیئے مولانا کے اُن افادات کے متعلق خصوصی طور پر کچھ عرض کر دیا جائے جو اس نمبر میں شامل کیے گئے ہیں۔

یہ چار مضامین ہیں (۱) الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ (۲) حج کیا ہے؟ (۳) دجالی فتنہ اور سورۂ کہف (۴) وفاشعاری کے دو نادر نمونے۔

الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ مولانا کا یہ مقالہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر ہے۔ الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ مولانا کے یادگار مقالات میں سے ہے۔ اس کی اشاعت ہوئی تو علمی حلقوں میں ایک دھوم مچ گئی اور آج تک اس کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مولانا کے انتقال کے بعد جہاں کہیں ان پر کچھ تفصیل سے لکھا گیا اور ان کے علمی کارنامے گنائے گئے، اس مقالہ کو سرِ فہرست جگہ ملی۔ اس کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اسلئے نہیں کہ چونکہ یہ مقالہ بالکل نامکمل حالت میں ہے اور پھر بھی پچاس صفحات سے زائد کا ہے اس لیے اسے من وعن درج نہیں کیا گیا ہے، بلکہ جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کو تکلیف دے کر اس کی تلخیص کرائی گئی تھی یہی تلخیص اس نمبر میں شامل ہے۔ فریدی صاحب نے تمہید میں اس مقالہ کا اچھا تعارف بھی کرا دیا ہے اسی لیے اسکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ یہاں مزید کچھ عرض کیا جائے۔

حج کیا ہے؟ یہ مقالہ الفرقان کے حج نمبر (۱۳۶۰ھ) میں شائع ہوا تھا، جو لوگ اس کو غور سے پڑھیں گے امید ہے کہ وہ اس کی قدر و قیمت کے ہماری طرح قائل ہوں گے۔ اور انھیں بڑے نوادر اسکے مطالعہ سے ہاتھ آئیں گے۔ اس میں مولانا نے پہلے یہ دکھایا ہے کہ کعبہ، جو اعمالِ حج کا محور ہے اس کا تعلق عالم ارضی سے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نباتی اور انسانی وحیوانی حقائق پر نظر ڈال کر انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ جس طرح نباتات کا قیام وبقا، ان کا نشو ونما اور ان کا سلسلۂ برگ وبار، بیج اور گٹھلیوں کے اندر کے ایک انکھوے سے وابستہ نظر آتا ہے جسے نباتات اور ان کی تمام پیداواروں کا مرکزی نقطہ کہا جا سکتا ہے۔ یا انسان وحیوانی اجسام کے قیام و بقا اور ان کے نشو ونما کا دار ومدار دل پر ہے۔ کیا اسی طرح مٹی کا یہ تودہ جسے زمین یا دھرتی کہتے ہیں اور جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی اور انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں۔ یہ (زمین) بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز نہیں رکھتی جسے اس کی ان تمام پیداواروں کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا کوئی دل نہیں ہے، جس سے ان پیداواروں کی رگوں میں نشو ونما اور ارتقاء و بقا کا خون دوڑ رہا ہو؟ یہ سوال اٹھا کر مولانا نے قرآن کی آیتوں سے اس کا جواب دیا ہے کہ بے شک زمین کا بھی دل اور ایک مرکزی نقطہ ہے اور وہ ہے "کعبہ"!۔

اس موقع پر آیات کے الفاظ سے مولانا کا استشہاد بس دیکھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھیں آیات سے سینکڑوں بار ہم گزرتے ہیں، اور ان الفاظ کے وہی معنی ہم بھی جانتے ہیں جو مولانا نے بیان فرمائے ہیں، مگر مولانا انھیں مشہور معانی سے وہ بات پیدا کر دیتے ہیں جو کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ اور لطف یہ کہ بات بالکل دل لگتی۔ یہ مولانا کے انتقالِ ذہنی کا کمال ہے جو ان کا خاص امتیاز ہے۔

اسی ذیل میں مولانا نے کعبے کی قدامت اور اس کے وسط ارض میں واقع ہونے کو بھی تاریخی بیانات اور صحف قدیمہ اور جغرافیائی حقائق سے ثابت کیا ہے۔ جو اس کی مرکزیت کا اقتضاء ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ خالق کائنات نے جب انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا فیصلہ فرمایا تو اس کے قیام وبقا، نشو ونما اور امن وارتقاء کے لیے

کعبہ کو مرکز قرار دیا۔ اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لیے الرحمٰن عرش پر مستوی ہوا، اسی طرح کرۂ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لیے کعبہ کو اس نے اپنی تجلّی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا ــــــ پس ذاتِ حق کی تجلّی گاہِ خاص ہونے کی وجہ سے وہ "بیت اللہ" ہو۔ اور یہی بنیاد ہو کعبہ کے ساتھ انسانوں کے ان روحانی تعلقات کی جو اسلام قائم کراتا ہو۔ جن میں سے ایک تعلق کی عملی شکل نماز ہو اور دوسرے کی حج۔

یہاں پہنچ کر مولانا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تعلقات کی ان دو شکلوں میں اس قدر اختلاف کیوں ہو، کہ ایک میں تو انتہائی صفائی، ستھرائی، وقار و سنجیدگی اور متانت و سکنت ہو کہ ہر بار منہ، ہاتھ، پاؤں دھوؤ، معقول لباس پہنو، دوڑ کر مت آؤ، اور خاموش رہو، اور دوسرے میں جتنا زیادہ میلے کچیلے، دیوانہ وش اور پراگندہ حال رہو۔ جتنا زیادہ دوڑ دھوپ کرو اور شور مچاؤ اتنی ہی سرخروئی حاصل کرو ـــ؟

مولانا فرماتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف انسان قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہتا ہو اور ساری کائنات کو قدرتی قوانین کی پابندی ہی کے ذریعہ ترقی اور کامیابی کے مراحل طے کرتا ہوا دیکھتا ہو تو وہ اپنی کامیابی کا راز بھی انھیں پابندیوں میں پوشیدہ سمجھتا ہے، انسانی فطرت کے اس اندرونی تقاضہ کی تکمیل نماز کے ذریعہ کی گئی ہو۔ مگر اسی کے ساتھ انسان کی فطرت میں جمال پرستی اور حُسن پسندی بھی ہو اور اسی پر اس کے زمی امتیاز کی بنیاد قائم ہو۔ تلاشِ حُسن اور جستجوئے جمال کے جذبہ کے ساتھ وہ پیدا بھی ہوتا ہو اور اسی جذبہ کو ساتھ لیے وہ مرتا ہے۔ بہتی ہوئی نہروں، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں، سرسبز وادیوں کے نشیب و فراز، اور شگفتہ و نیم شگفتہ پھولوں، الغرض جمادی اور نباتی سانچوں میں حُسن و جمال کی تجلیاں جب ڈھل کر سامنے آتی ہیں تو ان کو دیکھ کر گدھے گھوڑے اور بکرے نہیں، صرف آدم کے بچے اور حوّا کی بچیاں ہی کیف و سرور اور وجد و نشاط میں سرمست ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حُسن پرستی اور تلاشِ جمال کا ایک غیر معمولی جذبہ موجود ہو اور اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کائنات کے اندر حُسن و جمال کی جو لہریں مختلف مظاہر میں پائی جاتی ہیں ان کا آخری سرچشمہ وہی ہے جو ہر خوبی و کمال کا مبدا و منتہیٰ ہے، یعنی اللہ۔ حج اسی جمالِ مطلق اور حُسنِ ازل کی جستجو کی عملی شکل ہے، جو اس کے سارے عملی ڈھانچہ میں جھلکتی ہو، اور اسے نماز کے ڈھانچہ سے بالکل مختلف نوعیت بخشتی ہے۔

انھیں حقائق کو مولانا نے اپنے خاص انداز میں ۲۰۔۲۱ صفحے میں بیان فرمایا ہے۔ اصل مضمون میں تو آگے اور بھی کچھ چیزیں تھیں، مگر ہم نے آگے کے وہ صفحات اس انتخاب میں حذف کر دیے ہیں اور صرف اتنا ہی حصہ یہاں لیا ہے جس کا تعلق موضوع سے ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہو کہ اختتام پر کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے، مگر آگے کے چند جملے جو آخری پیراگراف کی تکمیل کرتے ہیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کی کتابت میں

کچھ غلطی ہو گئی ہے جس سے ناظرین کو الجھن پیش آتی اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پیراگراف چند جملے پیشتر ہی ختم کر دیا جائے، کیونکہ بات بہرحال پوری ہو جاتی ہے۔

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

سچ پوچھیے تو یہی مضمون اس خیال کا محرک بنا کہ بجائے مولانا کے متعلق مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کے خود ان کے مضامین کا مجموعہ (یعنی بجائے گیلانی نمبر کے افادات گیلانی نمبر) شائع کیا جائے۔ مولانا نے اس مضمون میں سورۂ کہف کی تفسیر ایک نئے انداز سے کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت پر انھوں نے ایک خاص نقطۂ نظر سے مدتوں غور کیا تھا اور اسی غور و فکر کے سرمایہ کو اس مضمون میں پیش کیا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اتنی طویل چیز جو ایک کتاب کی شکل میں شائع کی جانی چاہیے تھی ایک ماہنامہ کے صفحات میں شائع ہوئی۔ الفرقان کی ضخامت ہی کیا ہے، پھر بھی کافی لمبی لمبی قسطیں کرنے کے باوجود یہ مضمون اکیس قسطوں میں پورا ہو سکا۔ اور درمیانی ناغوں کی وجہ سے ڈھائی سال میں یہ قسطیں شائع ہو سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناظرین کے سامنے تو یہ سلسلہ کہیں درمیان سے آیا۔ اور شروع کی کڑیاں سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کوئی دلچسپی نہ لے سکے۔ اور جن کے سامنے یہ مضمون ابتداء سے آیا وہ بھی ماہناموں کے عام ناظرین کی عادت کے مطابق عام طور پر اسکی طوالت سے اکتانے سے لگے۔ الغرض بہت کم لوگ نکلے جو دلجمعی کے ساتھ اس مختلف قسم کے مواد سے بھرپور مضمون سے فائدہ اٹھا کر اس کی قدر شناسی کا ثبوت دیتے رہے۔ اس کا مولانا کو بھی قلق تھا اور ادارۂ الفرقان کو بھی افسوس رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون تدبر قرآن کی ایک نئی راہ کھولتا ہے اور چاہے مولانا کے نتائج فکر سے پورا اتفاق نہ کیا جائے مگر زمانہ کے نت نئے حالات و مسائل میں قرآن سے ایک زندہ کتاب کی طرح استفادہ کرنے کا ایک ڈھنگ ضرور اسکے مطالعہ سے ہاتھ آتا ہے۔ اسی لیے خود مولانا کی جتنی خواہش ہوگی وہ تو ظاہر ہے، خود ہماری خواہش تھی کہ لوگوں کے لیے اسکے مطالعہ کی کوئی بہتر صورت نکالی جاتی۔ مولانا کے سانحۂ ارتحال کے بعد جب ان کی یاد میں الفرقان کا ایک خاص نمبر نکالنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی وقت یہ ذہن میں آیا کہ یہی موقع اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے غالباً سب سے زیادہ مناسب ہے، اور مرحوم کی روح کو شاد کرنے کا شاید یہی سب سے اچھا ذریعہ ہو گا۔

اس مقصد کے لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس مضمون کی کچھ خدمت کی جائے، اور اپنی جیسی پوری کوشش کر کے ایسی صورت کر دی جائے کہ لوگ آسانی سے اس مضمون سے مستفید ہو سکیں کیوں کہ مولانا کے لکھنے کا انداز تو یہ تھا، جیسا کہ انھوں نے خود مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ

"ایک بار جو نک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اسکی نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہوتی ہے۔ میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کرلیں۔"

(معارف مارچ ۵۷ء ص ۱۸۴)

"خرافات" کا لفظ تو خیر مولانا کی کسر نفسی ہے۔ البتہ مولانا کے یہاں بات میں بات بہت نکلتی ہے۔ یہ ضمنی باتیں اگرچہ بذاتِ خود سب نہایت کارآمد اور پُراز معلومات ہوتی ہیں مگر عام ناظرین کے لیے بعض وقت یہ بھول بھلیاں بن جاتی ہیں جس سے انھیں موضوع سے تعلق قائم رکھنا مشکل ہوجاتا ہے، اور ذہن میں ایک انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ مولانا نے شاید اسی قسم کی چیزوں کو خرافات سے تعبیر کردیا ہے۔

بہر حال عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے ضروری معلوم ہوا کہ اولاً غیر متعلق باتوں سے پیدا ہونے والی مضمون کی طوالت اور اسکے پیچ وخم کو ممکن حد تک کم کردیا جائے۔ دوسرے جتنے حصے سے مضمون کا مقصد پورا ہوجاتا ہے بس اتنے ہی حصہ پر اکتفا کیا جائے اور باقی حصہ میں سے بغیر کسی تسلسل کے صرف خاص خاص افادات لے لئے جائیں۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے جب مضمون پر کام کیا گیا تو ۲۰۶ صفحات میں سے کوئی ۱۵۰ صفحے رہ گئے جو اس نمبر کے سطر کی تبدیلی (یعنی سطروں کی تعداد اور لمبائی میں اضافہ) اور کتابت کے گٹھاؤ کی وجہ سے صرف ۱۱۲ صفحے میں آگئے۔

حذف کے علاوہ کہیں لفظی ترمیم بھی کی گئی ہے، عبارت کو سہل الفہم بنانے کے لیے ضرورت محسوس ہوئی تو کہیں کوئی لفظ یا جملہ بڑھا بھی دیا گیا۔ اور اسکے علاوہ بعض حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔

مزید برآں دو کام اور کیے گئے ہیں (۱) ایک تو یہ کہ مضمون کو مختلف مناسبتوں سے چھ حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے اور ہر حصہ پر مناسب عنوان قائم کردیا گیا ہے، کہ یہ چیز خود نفسیاتی طور پر ایک طویل مضمون کے مطالعہ کا بار ذہن سے ہلکا کرتی ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ مضمون بغلی سرخیوں سے بھی یکسر خالی تھا جو کہ فہم میں بڑی آسانی پیدا کرتی ہیں اور قاری کے ذہن میں مباحث کے انضباط کا ذریعہ بنتی ہیں۔ راقم مرتب نے جہاں جہاں ممکن ہوا یہ بغلی سرخیاں قائم کردی ہیں، جن کی تعداد غالباً کئی سو ہوگی۔

بہر حال یہ محنت صرف اس لیے کی گئی ہے کہ عام ناظرین سہولت کے ساتھ اس مضمون سے مستفید ہوسکیں اور مولانا مرحوم کی یہ محنت کم از کم ان کے بعد ہی ٹھکانے لگ جائے۔

اس مضمون میں کیا کچھ ہے؟ اب اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی تو ان صفحات میں زیادہ گنجائش رہی نہیں۔ مختصراً اتنا ضرور عرض کردینا چاہیے کہ اس کے بعض مباحث مثلاً عیسائیوں کا عقیدۂ ولدیت اور اسکے آثار بڑے

نادر اور اچھوتے مباحث ہیں۔ مولانا کی وسعت معلومات اور ان کی ممتاز ذکاوت و ذہانت اور دقیقہ رسی کی غیر معمولی صلاحیت نے قطروں کو لے کر سمندر کر دیا ہے۔ جو لوگ توجہ سے اس کا مطالعہ کر لیں گے وہ کتنے ہی موضوعات پر اپنا دامن بیش بہا معلومات سے بھر لیں گے۔

وفاشعاری کے دو نادر نمونے

یہ اس مجموعہ کا آخری مضمون ہے اس کا تعلق چونکہ بعض تاریخی واقعات سے ہے اس لیے اس کے تعارف میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ایک سادہ سا تذکیری مضمون ہے جو واقعات سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مولانا کے آخری سلسلۂ مضمون کی ایک کڑی ہونے کی بنا پر مناسب معلوم ہوا کہ اسی کو افادات مندرجہ کی آخری کڑی بنا دیا جائے۔

مولانا کے افادات کے علاوہ اس نمبر میں دو مضمون اور ہیں۔ ایک سب سے پہلا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ جو مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک جامع تعارف اور ان کی خصوصیات اور فضائل و کمالات پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔۔۔ دوسرا مختصر مضمون مدیر الفرقان مدظلہ، کا ہے جس سے مولانا گیلانیؒ اور الفرقان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

کچھ مولانا کے اسلوب نگارش کے متعلق

راقم مرتب نے چاہا تھا کہ اس نمبر میں ایک مضمون مولانا کی انشائی خصوصیات اور ان کے اسلوب پر ہو جائے۔ مگر افسوس ہے کہ خیال دیر سے آیا چنانچہ جن حضرات سے اس کیلئے عرض کیا گیا ان کا جواب معذرت میں ملا۔ افسوس ہو کہ یہ بڑی کمی رہ گئی۔ ورنہ مولانا کے افادات سے استفادہ میں ناظرین کو اور زیادہ سہولت ہو جاتی۔ میں خود کو اس موضوع پر لکھنے کا اہل تو نہیں پاتا مگر ضرورت کے احساس کے تحت چند اشارات یہاں کیے جاتے ہیں شاید کچھ مفید ہو سکیں۔ واضح رہے کہ یہاں مولانا کے صرف انہیں مضامین کو سامنے رکھ کر کچھ لکھا جا رہا ہو جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ نیز مولانا کے طرز انشاء پر کوئی تبصرہ اور انکی تمام خصوصیات کا احصاء مقصود نہیں ہو بلکہ صرف تسہیل کے نقطۂ نظر سے چند باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۱۔ مولانا کے اسلوب کی سب سے پہلی خصوصیت کا آئینہ دار انکی تحریر کا شروع ہوتا ہو۔ بعض مرتبہ تو وہ مضمون اسی طرح شروع کرتے ہیں جس طرح لکھنے کا عام اور مانوس طرز ہے، مگر بعض مرتبہ وہ اس انوکھے ڈھنگ سے بات شروع کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہو وہ شروع سے نہیں بلکہ بیچ سے کہیں مضمون پڑھنے لگا ہو۔ مثلاً "وفاشعاری کے دو نادر نمونے" میں انہیں مضمون اس بات سے شروع کرنا تھا کہ حجاج مروانی حکومت سے منسلک ہونے سے پہلے طائف کے ایک مکتب میں پڑھایا کرتا تھا۔ اس پیشہ کی آمدنی اس کی ضروریات کیلئے ناکافی ہوتی تھی۔ چنانچہ دمشق پہونچا اور عبدالملک کے وزیر کے باڈی گارڈ میں بھرتی ہو گیا اور یہاں سے اس پر ترقیوں کا دروازہ کھلا۔ اس بات کو دیکھئے وہ کس ڈھنگ سے کہتے ہیں:۔

> "طائف کے مکتب خانے میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ لیکن معلم الصبیانی کے اس پیشہ سے اتنی آمدنی جو ضروریات کو کافی ہوتی نہیں ہوتی تھی، پھر کیا کیا جائے، طائف سے اٹھا، دمشق پہونچا، وقت کے حکمران کا جو وزیر یا تدبیر تھا اسکے باڈی گارڈ کے سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا۔ وزیر کا نام روح بن زنباع تھا مروانی حکومت کے پہلے حکمراں عبدالملک بن مروان نے روح کو اپنا وزیر بنا لیا تھا بھرتی ہونیوالا یوسف ثقفی باشندہ طائف کا لڑکا تھا، نام اس کا حجاج تھا۔"

۲۔ دوسری خصوصیت مولانا کی تحریر کی، بات میں بات کی ہے، وہ ایک بات سے دوسری بات کی طرف اس طرح نکل جاتے ہیں کہ جیسے پہلی بات ہو ہی نہیں رہی تھی۔ اسی مضمون میں دیکھئے اوپر جو اقتباس دیا گیا ہے اسکے بعد اگر مولانا دوسری بات کی طرف منتقل نہ ہو جاتے تو یہ بتلاتے کہ حجاج کس طرح آگے بڑھا کر اسے بدنام زمانہ چیرہ دستیوں کا موقع ملا۔ مگر حجاج کا نام آنے پر مولانا کے قلم کا رُخ اس طرف مڑ گیا کہ کون حجاج؟ وہی

"جسکی یاد کو مسلمان اپنے حافظہ سے مٹانا چاہتے ہیں، لیکن بجائے مٹنے کے وہ تازہ ہی ہوتی رہتی ہے ...."

اور پھر اسی ذیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول نقل کر کے کہ "دنیا کی ہر قوم اپنے اپنے فرعونوں کو لیکر کھڑی ہو تو مقابلہ میں مسلمانوں کا یہ فرعون سب پر بھاری ہو جائے گا۔" مولانا نے اسی سے یہ گفتگو شروع کر دی کہ حجاج ظلم و ستم آئینی طور پر کرتا تھا یا غیر آئینی طور پر۔ اور پورا ایک صفحہ اس پر صرف کرنے کے بعد پھر اُس اصل بات پر آئے کہ وزیر کے باڈی گارڈ سے بڑھ کر وہ گورنری تک کیسے پہونچا۔۔۔

جی چاہتا تھا کہ اسکی اور چند مثالیں پیش کر دی جائیں تاکہ ناظرین اس اسلوب سے اچھی طرح واقف ہو جاتے مگر جگہ کی تنگی اجازت نہیں دیتی۔

۳۔ مولانا کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مختلف مباحث کو اس طرح باہم پیوست کر دیتے ہیں کہ عموماً کسی متعین نقطہ پر ان باہم مختلف قسم کی باتوں کے درمیان کوئی خط فاصل نہیں کھینچا جا سکتا۔ اسکی مثالیں انکے مضامین میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر حج پر جو ان کا مضمون ہے اسمیں دیکھئے کہ وہ کعبہ کی مرکزیت اور اسکی وسطیت پر گفتگو کر رہے تھے کہ یکایک اسکی قدامت کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس عنوان پر دلائل و شواہد پیش کرنے لگے اور اسطرح متوجہ ہوئے کہ کافی دور تک کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دوسری بات کہنے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کر کے یہ لکھنے کے بعد کہ یہ اشارہ کعبہ کی اسی برکاتی مرکزیت کیطرف ہے جسے قرآن میں "مبارکا" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہو، آگے عبارت یوں شروع ہو جاتی ہے۔

"بلکہ بجائے "مکہ" کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا لفظ یعنی "بکہ" کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے" الخ

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزیت ہی کے سلسلہ میں مولانا کوئی نکتہ لا رہے ہیں مگر تھوڑی دور چلکر پتہ چلتا ہے کہ نہیں، یہاں سے ایک نئی بات شروع ہو گئی۔

۴۔ مولانا کے طرز انشاء کی ایک سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت ان کے جملوں کی بے ساختگی و برجستگی اور ان کی البیلی ترکیب ہے۔ ان کے جملوں کی ترکیب کی خصوصیت ظاہر کرنے کیلئے "البیلے پن" سے زیادہ مناسب شاید کوئی اور لفظ نہ ہو۔ جملوں کے اجزاء کی ترتیب میں وہ کسی قاعدہ اور ضابطہ کے پابند نہیں ہیں۔ بس جو جزو بے ساختہ قلم سے پہلے نکل گیا، وہ پہلے ہو گیا جو بعد میں نکلا وہ بعد میں ہو گیا۔ پھر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جملہ پورا نہیں ہونے پاتا کہ ایک جملہ معترضہ شروع ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ناتمام جملہ کے بقیہ اجزاء بھی اسی میں گم ہو جاتے ہیں جن لوگوں کو مولانا کے مضامین سے نیا نیا سابقہ پڑتا ہے وہ تو کچھ گھبرا سے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ مولانا کے اسلوب سے آشنا ہو چکے ہیں انھیں اس انداز میں بڑا مزا آتا ہے اور خشک موضوع بھی دلچسپ بن جاتا ہے۔

مولانا کے طرز انشاء کی ان چند خصوصیات کو اگر پہلے سے ذہن میں رکھ لیا جائے گا تو امید ہے کہ عام ناظرین بھی خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

نقوش و تاثرات

(از، مولانا سیّد ابو الحسن علی، ندوی)

اپنے زمانہ کی کسی مشہور و جلیل القدر ہستی کے متعلق یہ بتانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ اس کا نام سب سے پہلے کب کان میں پڑا تھا جب خیال کیجئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام ہمیشہ سے مانوس اور یہ ہستی ہمیشہ سے معروف و محبوب ہے۔

میری طالب علمی کا زمانہ اور میرے لکھنے پڑھنے کی عمر کا بچپن تھا، اور مولانا کے علم و تصنیف کی عمر کا سن کہولت، میرے برادر معظم ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب ان کے دوست بھی تھے اور معالج بھی، مولانا اکثر حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی جاتے ہوئے اپنے رفیق کار اور مخلص دوست مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی معیت میں لکھنؤ اتر جاتے اور ایک دو روز قیام کر کے بہار کے سفر پر روانہ ہوتے، اس عرصہ میں کبھی ہمارے گھر کو بھی رونق بخشتے اور کبھی ہم مولانا عبد الباری صاحب کے دولت کدہ (شبستان سعادت) پر حاضر ہو کر ان کی زیارت و صحبت کی سعادت حاصل کرتے، اس دو روزہ زمانہ قیام کے صرف دو تاثرات باقی رہ گئے ہیں، ایک ان کی شیریں گفتاری، شگفتہ بیانی، دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجیب دل آویزی اور دل کشی پیدا کر دی تھی، اور کسی طرح انکی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی، قدیم مشرقی سوانح نگار اور ادیب اسی کو "سبک روحی" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسکی مقابل صفت کو "گراں جانی" کہتے ہیں؛ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے محبوب اور

اور اپنے حلقۂ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے، اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی

اسی اثنا میں اگر نماز کا وقت آجاتا تو مولانا حاضرین یا صاحبِ خانہ کے اصرار سے مصلّے پر تشریف لے جاتے، اُن کی قرأت میں بڑا سوز اور حلاوت تھی، قلب پر اس کا اثر پڑتا اور جی چاہتا کہ قرأت طویل ہو،

اس دوران قیام میں جو علمی مذاکرے ہوتے ان کی تو اس وقت کچھ زیادہ سمجھ نہ تھی اور نہ وہ محفوظ ہیں بس اتنا یاد ہو کہ ان کی باتوں سے یہ احساس نہیں ہونے پاتا تھا کہ کوئی شخص علم کے فلک چہارم سے اہل زمین کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی عالم نشستگاہ کو درس گاہ تصور کرکے سامعین کو درس دے رہا ہو، ان سے مل کر ہم کو وہ دوری اور پستی نہ محسوس ہوتی جو مبتدی طالب علموں کو بڑے علماء و اساتذہ سے مل کر محسوس ہوا کرتی ہے، دیکھنے میں یہ بات معمولی ہے مگر بڑی غیر معمولی ہے، جس طرح بعض (نو دولت) حکام کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ یہاں تک کہ اپنے گھر میں اور اپنے بے تکلف احباب کے حلقہ میں بھی اپنے کو حاکم سمجھتے رہتے ہیں، اسی طرح بعض علماء اور ادبا، اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر وقت اپنے کو معلم و مصلح یا ادیب و نقاد سمجھنے لگے ہیں، اور درسگاہ اور مسند درس کا تصور اُن سے کبھی جدا نہیں ہوتا، مولانا کی مجلس میں بڑا انبساط تھا، اور علمی و درسی اصطلاح میں "تنزل" بھی تھا، لطائف بھی تھے، واقعات بھی تھے اور چیدہ و منتخب اشعار بھی، اور وہ بھی ترنم کے ساتھ، دل نوازی و شفقت بھی تھی، اور علمی و تحقیقی شان بھی اور یہ سب اُسی لطافت روح اور ربک جانی کا نتیجہ تھا جو اُن کو عطا ہوئی تھی، اور اس بات کا ثبوت کہ علم اُن کا ایسا جزو بدن ہو گیا تھا کہ اُن کو اس کا احساس باقی نہیں رہا تھا اس لیے اس کے موقع بے موقع اظہار کی ضرورت نہ تھی۔

اسی عرصہ میں مجھے تفسیر کے تفصیلی مطالعہ کا شوق ہوا، بھائی صاحب نے ارادہ فرمایا کہ مجھے کچھ عرصہ کے لیے مولانا کے پاس حیدرآباد بھیج دیں، مولانا نے بھی اس پر مسرت کا اظہار فرمایا، لیکن اب یاد نہیں کن اسباب و موانع کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا، لیکن مولانا نے مشفقانہ و مربیانہ اور میں نے شاگردانہ و نیاز مندانہ تعلق آخر تک قائم رکھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے میری خط و کتابت سنہ ۱۳۸۱ھ میں ہوئی، جب مجھے اپنی کسی علمی یا تصنیفی ضرورت سے مولانا کے اس مقالہ سے استفادہ کی ضرورت پیش آئی جو انھوں نے جمع و ترتیب قرآن پر تحریر فرمایا تھا، اس کی تاریخ یہ ہے کہ اجمل خاں صاحب نے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق ایسے مشککانہ خیالات کا اظہار کیا تھا جن سے قرآن مجید کی موجودہ جمع و ترتیب بلکہ اس کی محفوظیت مشتبہ ہو جاتی ہے، یہ چند عامیانہ و سطحی خیالات کا مجموعہ تھا جن کی کوئی علمی و تحقیقی اہمیت نہ تھی لیکن ایک بڑے فتنہ کا آغاز تھا، مولانا کے

علم وحمیت میں اس نے حرکت وجنبش پیدا ہوئی اور انھوں نے نفس مسئلہ جمع وترتیب قرآن پر ایک محققانہ وعالمانہ مضمون تحریر فرمایا جو اسی زمانہ میں "مدینہ" بجنور میں شائع ہوا، مولانا کے علمی مقالات کی بڑی خوبی یہ ہو کہ اس میں یکجا اتنا منتشر مواد جمع فرما دیتے ہیں جو آسانی سے کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا، دوسرے منقولات کے ساتھ وہ بہت سی ایسی نئی باتیں لکھ دیتے ہیں جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا نکتہ رس اور نکتہ آفرین ذہن عطا فرمایا تھا، قرآن مجید کی وہی آیات اور صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسوں بار پڑھ چکے ہیں، مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کر دیتے اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکالتے کہ حیرت ہوتی[1]، اس مضمون میں بھی یہی شان ہو، قرآن مجید کے من جانب اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو، اور عہد رسالت ہی میں اس کے مرتب وجمع ہو جانے کو انھوں نے قرآن مجید کے الفاظ و نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اس خیال کی بالکل بنیاد ہی منہدم ہو جاتی تھی کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع ومرتب ہوا اور اس کی ترتیب حضرت ابو بکر یا حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد کا نتیجہ ہے، اس مضمون کا محرک اور اس کی شان کیا تھی اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:-

> "آپ کو شاید میرے جنون کا حال معلوم نہیں، اچل نامی پروفیسر کے نام "مدینہ" میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا، غصہ آ رہا تھا، دبا نہ سکا، رات کو قلم لیا، پراگندہ خیالات سمیٹے لکھ کر بھیج دیا، مسودہ تیار ہی کب تھا، وہی مسودہ وہی مبیضہ تھا، طبع ہونے کے بعد ایک کاپی آئی تھی، یاروں نے اسے بھی ختم کر دیا، سنہ تو یاد نہیں لیکن جس سنہ میں شائع ہوا مارچ کا مہینہ غالباً، اگر مارچ تھا ہو سکے تو جناب مجید حسن سے مانگیے، شیر محمد[2] صاحب کے پاس ہوگا؟ اس کا کیسے یقین کروں، کیا آج کل اس سلسلہ میں کوئی کام ہو رہا ہے، کاش! قرآن کے ساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی تاریخی حالت بھی تحقیق کے ساتھ لکھ دی جاتی تو
>
> لاریب فیہ
>
> کی تفسیر ہو جاتی[3]"

مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے النبی الخاتم پڑھی، کتاب عجب البیلے انداز میں لکھی گئی ہو، صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش وبرجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل وجذب کی

---

[1] اسکا بہترین نمونہ انکی تصنیف "تدوین حدیث" ہو [2] مولانا ابو اللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند [3] خط پر تاریخ نہیں ہے ڈاکخانہ کی مہر سے اکتوبر ۱۹۵۰ء کی

لطیف آمیزش حسب معمول معمولی و مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں، اور وہ احساس حسرت وکثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہو کہ

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشاپردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

ان سے جب زیادہ ملنا ہوا اور کچھ دن ساتھ رہنا ہوا تو اس حقیقت کی تصدیق ہوئی، اور حیدرآباد کے قیام میں خود انھوں نے اپنے بعض واقعات سنائے جن سے بارگاہ رسالت سے خصوصی تعلق و مناسبت اور اس کتاب کی مقبولیت و تاثر کا راز معلوم ہوا۔

ان کا دوسرا نقش قلم جو نظر سے گزرا، اور نقش ہو گیا، وہ ان کا مضمون "الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" ہے جو الفرقان کے مجدد نمبر میں شائع ہوا تھا، اور وہ انکی بہترین و موثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مجدد الف ثانی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس مضمون سے بڑھ کر ان کی تجدیدی عظمت کو آشکارا کرنے والا کوئی مقالہ یا تصنیف اس وقت تک نظر سے نہیں گزری، اس مضمون میں بھی انھوں نے یہی کیا ہو کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ سے لے کر ایسے اقتباسات جمع کر دیے ہیں کہ عہد اکبری کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والے کو اس خطرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اس ملک میں اسلام کو درپیش تھا، پھر ان تاریک و مایوس کن حالات میں الف ثانی کے مجدد کا تجدیدی کام شروع ہوتا ہے جو بالآخر اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی (نور اللہ مرقدہ و اعاد ایامہ) کو لے آتا ہے اگر یہ مضمون اسی پرواز کے ساتھ جس سے وہ شروع ہوا تھا، مکمل ہو جاتا تو نہ صرف حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی بہترین سیرت تیار ہو جاتی بلکہ ہندوستان کے اسلامی انقلاب کی ولولہ انگیز تاریخ مرتب ہو جاتی۔

اس وقت تک میرے ان کے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ میں ان کے علم و تحریر کے ہزاروں مداحوں میں سے ایک مداح تھا، ان کے مضامین و تصنیفات کو شوق سے پڑھتا، اور کبھی کبھی استفادۃً خط و کتابت بھی کر لیتا، ان کو بھی میرے حالات اور علمی مشاغل سے بزرگانہ دلچسپی تھی، لیکن ایک ایسی تقریب پیش آئی جس نے مجھے ان سے زیادہ قریب ہونے کا موقع دیا، اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنی اہم تصنیف "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کے زمانہ تصنیف میں والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحئی کی تصنیف "نزہۃ الخواطر" کا دوسرا حصہ جو درر کامنہ کے ذیل کے طور پر دائرۃ المعارف نے شائع کیا تھا پڑھا، وہ اسکو پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد مرحوم کی چیزوں سے یوں تو مجھے بچپن ہی سے خاص دلچسپی رہی ہے، لیکن نزہۃ الخواطر کی قدر و قیمت مجھ پر اپنی اس کتاب کے لکھنے وقت جتنی ظاہر ہوئی، اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، اللہ کے اس مخلص بندے نے کمال کر دیا ہو، ہمہ ولی کو کھنگال گئے، لیکن پتہ بھی چلنے نہیں دیا، خدا کرے کہ ان کی محنت سے استفادہ کا موقع دنیا کو مل جائے، ایک انقلابی کام ہے جسے وہ کر کے چلے گئے ہیں، اب یہ ہم لوگوں کی توفیق کی بات ہے کہ اس سے خود مستفید ہوں اور دوسروں کے مستفید ہونے کے مواقع پیدا کریں گے۔"

(۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء)

انھوں نے دائرۃ المعارف سے اس کتاب کے مکمل طبع ہونے کی تحریک کی، ایک محضر مرتب کیا جس پر ہندوستان کے اکثر اکابر علماء کے دستخط کرائے، یہ غالباً حیدری صاحب کا زمانۂ وزارت تھا اور وہ مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے، بڑی کوششوں اور سلسلہ جنبانی سے اس کتاب کی طباعت کی منظوری ہوئی، اور میں نے پہلا حصہ صاف کرا کے بھیج دیا، ریاست کے دوسرے کاموں کی طرح اس کتاب کی طباعت میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مصلحت یہ معلوم ہوئی کہ میں خود حیدرآباد جاؤں اور اس کے آخری مراحل طے کرانے کی کوشش کروں، چنانچہ سنہ ۴۶ء میں غالباً جولائی کا مہینہ تھا کہ میں حیدرآباد حاضر ہوا، مولانا کے سوا کہاں ٹھیرتا؟ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا عبدالباری صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہو کر لکھنؤ تشریف لے گئے تھے، جامعہ عثمانیہ کے قریب سیتاپھل منڈی میں مولانا کا قیام تھا، قریب ہی ایک مسجد تھی جس کی تاریخ مولانا نے المسجد الاقصیٰ نکالی تھی اور وہ مسجد کے دروازے پر کندہ ہے اور اس لحاظ سے مناسب حال ہے کہ مسجد بلدہ کے بالکل ایک سرے اقصی البلد پر واقع ہے، اس قیام میں مولانا کے شب و روز دیکھنے اور گھنٹوں پاس بیٹھنا ہوا، وہاں ٹھیر کر مولانا کا تصنیفی انہماک اور علمی استغراق دیکھا، پہلے کا حال تو یہ تھا کہ بعض دن رات رات بھر لکھتے رہتے، دوسرے کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات سلسلۂ گفتگو شروع فرماتے اور میں کسی ضرورت سے اٹھ جاتا مگر مولانا سلسلہ جاری رکھتے پھر اچانک سر اٹھا کر دیکھتے اور اس وقت معلوم ہوتا کہ میں موجود نہیں ہوں، طبیعت کی شگفتگی کا وہی عالم تھا "مسجد اقصیٰ" کے مؤذن ایک دلچسپ بزرگ تھے جن سے مولانا اکثر مطائبہ فرماتے اور ان کی سادگی سے لطف لیتے، مولانا نے ان کا نام "امام مفرح القلوب" رکھا تھا، اکثر مولانا کے ساتھ ہی جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف جانا ہوتا اور بعض مرتبہ ان کے درجہ میں بھی (جو اپنی دینی عظمت کی وجہ سے جامعہ کی سب سے بالائی منزل میں تھا) بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

مولانا سے ملنے میں دو باتوں کا ضرور احساس ہوتا، ایک ان سے عزیزانہ قربت کا جو ایک خاندان کے افراد ہونے سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ خواہ نسبی اشتراک ہو (اشتراک بعید سہی) خواہ انکی طبیعت کی افتاد جس کے خمیر میں محبت و شفقت تھی، دوسرے ذوقی و علمی مناسبت، مولانا عالموں میں عالم تھے، ادیبوں میں ادیب،

مورخوں میں مورخ فقیہوں میں فقیہہ، محدثوں میں محدث، مفسروں میں مفسر، فارسی اردو کا ان کو یکساں مذاق تھا، شعر و شاعری کا ذوق اور سخن شناسی و سخن سنجی دونوں سے حصہ وافر ملا تھا، غرض وہ ہندوستان کی اس گزشتہ تہذیب و ثقافت کی یادگار تھے جب فقیہہ و محدث کے لیے خشک ہونے، اور عالم کے لیے شعر کو غیر موزوں پڑھنے کی شرط نہ تھی، وہ علماء کی اس صف کے آدمی تھے جس کے اولین کرسی نشینوں میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا صدر الدین خاں آزردہ اور مولانا امام بخش صہبائی اور متوسطین میں مولانا حالی، مولانا شبلی اور حکیم سید عبدالحئی (صاحب گل رعنا) اور متاخرین میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوبکر جونپوری تھے، اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کے باوجود میرا نشاء و نما اسی ماحول میں ہوا اس لیے مولانا سے ایسی مناسبت محسوس ہوئی جو ان کے بہت سے معاصروں سے محسوس نہیں ہوتی تھی، اور اس میں بہت کچھ دخل انکی اس جامعیت، ادبی ذوق اور لطف مجلس کو تھا جس کی بنا پر کہنا پڑتا تھا کہ

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

سنہ ۴۸ء میں مولانا کا تعلق حیدرآباد سے ختم ہو گیا اور وہ وظیفہ لے کر گیلانی آگئے جس کو وہ اپنی کنج قیام گاہ کہتے تھے، حیدرآباد کے واقعات نے ان کے حساس و دردمند دل کو بڑا صدمہ پہونچایا تھا، وہ لکھ پڑھ کر اپنا دل بہلاتے تھے، اسی زمانہ میں انکی بعض اہم تصنیفات اور طویل سلسلۂ مضامین شایع ہوئے۔

سنہ ۴۹ء میں راقم الحروف اور رفیق مکرم مولانا عبدالسلام ندوی نے ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف سے ایک پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" جاری کیا جس کا اصل مقصد مسلمانان ہند کی اس افسردگی اور احساس کہتری اور مایوسی کو دور کرنا تھا جو ۴۷ء کے انقلاب اور نئے حالات نے ان پر طاری کر دی تھی، مولانا نے اس اخبار سے پورا تعاون فرمایا اور اپنے بعض مضامین سے سرفراز کیا، مولانا کا ایک دیرینہ خیال یہ تھا کہ اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں کے بجائے جن کا ایک زمانہ میں ہندوستان میں عام مذاق پیدا ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی بہترین تنظیمی و عملی و مالی صلاحیتیں ان پر صرف ہوئیں اس وقت اسلامی اقامت خانوں کی ضرورت ہے جن میں وہ مسلمان طلبا قیام کریں جو مختلف سرکاری و غیر سرکاری مسلمان اور غیر مسلم درسگاہوں سے وابستہ ہوں اور ان کے اندر اسلامی و دینی فضا اور غذا مہیا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اپنی درسگاہوں کے لادینی ماحول اور تعلیم کے اثرات سے امکانی حد تک محفوظ اور اسلامی افکار و اخلاق سے متاثر ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تجویز "کم خرچ بالا نشیں" کے مرادف اور اسلامیہ کالجوں و اسکولوں سے (جن کی افادیت اب بہت مشتبہ ہو گئی ہے اور جو اب انقلاب حکومت سے اپنی خصوصیات کھوتے چلے جا رہے ہیں) کہیں بہتر نتائج و ثمرات پیدا کر سکتی ہے اور جدید تعلیم کے غیر اسلامی اثرات سے بچانے اور نئی اسلامی نسل کو جس کا جدید

تعلیم حاصل کرنا ایک طے شدہ حقیقت اور ایک ناگزیر ضرورت ہو) مسلمان باقی رکھنے کی واحد شکل ہے، اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کو (جن کی زمام اختیار قدرتی طور پر اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے) الحاد و زندقہ کے دوراہہ پر کھڑا کر دیا ہے اور ایک سخت ذہنی انتشار و کش مکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنا دیا ہے مولانا کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی کہ انھوں نے اسلامی اقامت خانوں کی تجویز پیش کی جو کم سے کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک عملی اور معقول حل ہے، مولانا نے تعمیر کو اس دعوت کا ترجمان بنانا چاہا اور اس سلسلہ میں ان کے متعدد مکاتیب و مضامین شایع ہوئے، افسوس ہے کہ انکی اس تحریک کو کسی بڑے ادارے یا انجمن نے نہیں اپنایا، اور اس کو تحریک و دعوت نہیں بنایا گیا، ورنہ وہ نہ صرف کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں بلکہ ان یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ مفید اور انقلاب انگیز ثابت ہوتی، جن پر مسلمانوں کی بہترین طاقتیں اور عظیم قومی سرمائے صرف ہوئے، مولانا کے انتقال کے بعد ان کے شریک کار اور یار غار مخدومی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے "صدق" کے ذریعہ اقامت خانوں کے قیام کی دعوت پیش کی اور اس کے لیے عملی قدم بھی اٹھایا، خدا کرے مستقبل قریب میں یہ تخیل عالم وجود میں آجائے اور ہندوستان و پاکستان میں اس کا تجربہ شروع کیا جائے۔

وہ اگرچہ اپنے نزدیک ایک "کہف" میں گوشہ نشین و پناہ گزیں تھے، مگر باہر کی دنیا سے باخبر رہتے تھے اور باخبر رہنا چاہتے تھے، مطالعہ و تصنیف و تحریر کا سلسلہ قوت کے ساتھ جاری تھا، راقم سطور کا معمول تھا کہ اس کی کوئی چیز شائع ہوتی تو خصوصی مناسبت و تعلق کی بنا پر مولانا کی خدمت میں ضرور بھیجتا، اور مولانا اس پر اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار فرماتے، ان تاثرات سے ان کے درد مند دل کا پورا اظہار ہوتا اور معلوم ہوتا کہ "امت" کے حالات سے ان کو کیا تعلق ہے، ۱۹۵۱ء میں یہ ناچیز جب حجاز و شرق وسطیٰ کی سیاحت سے واپس آیا، تو بعض دوستوں نے ان ریڈیائی تقریروں کا جو دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھیں ترجمہ شایع کر دیا میں نے وہ کتابچہ مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا، مولانا نے ان الفاظ میں اسکی رسید عنایت فرمائی۔

> "کتنے ذوق و شوق کے ساتھ آپ کی کتاب مشرق وسطیٰ والی اپنے ہاتھ میں لی، لینے کے ساتھ پڑھ گیا، لیکن آپ نے پیاس بھڑکا دی، امیدوار بنا کر چھوڑ دیا، کاش! آپ کا روزنامچہ شایع ہو جاتا، تاہم جو کچھ بھی اس میں آگیا غنیمت ہے، فلسطین کے اس پیر مرد کی بات دل کو بہت بھائی کہ سمندر کی مچھلیوں میں اگر جنگ ہو تو انگریز کی شرارت سمجھو، اپنا خیال بھی یہی ہے، اسی لیے اس دور کو "کہفی دور" سمجھے ہوئے ہوں، تا اینکہ ملا میندا الشیطان کا دور ختم ہو۔

آپ نے اس سفر میں زیادہ تر ندوی الطبع حضرات سے ملاقات کی، دیوبندی الفطرت بشکل دو ایک سے زیادہ نہ ملے، میری آرزو یہ تھی کہ حضرت شہید کے کچھ نمونوں کی تلاش کرنے میں بھی آپ کامیاب ہوئے ہوں گے، مگر شاید پیداوار کا سلسلہ اس راہ میں غالباً بند ہوچکا ہے۔" (۲۰ فروری ۱۹۵۳ء)

بالآخر وہ عربی روزنامچہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" بھی شایع ہوگیا، اور حسب معمول مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا، مولانا عربی ممالک کے دینی زوال اور جذبۂ اسلامی کے ضعف کے واقعات سے بڑے متاثر وغمگین ہوئے اور کتاب پڑھتے ہی یہ مکتوب گرامی ارسال فرمایا جو درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

آپ کا ہدیہ سنیہ یعنی عربی سفرنامہ کئی دن ہوئے موجب سرفرازی ہوا چونکہ "الفرقان" میں اس سفرنامہ کی متعدد قسطیں ترجمہ ہوکر شائع ہو چکی تھیں، خیال گزرا کہ وہی مضامین عربی زبان میں ہوں گے، تاہم پڑھنا شروع کیا، اب خدا جانے میرے حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ تھا، یا کیا تھا کہ مجھے تو اب آپ کی اس کتاب کی ہر ہر سطر نئی معلوم ہوتی چلی جاتی تھی بڑھتا جاتا تھا اور استغراق و انہماک بڑھتا جاتا تھا، شاید دو دن میں ختم ہوا، ختم کیا ہوا، ایسا معلوم ہوا کہ میں خود ختم ہوگیا، پرانے ناسور جو دل میں پڑے ہوئے تھے تر و تازہ ہوتے چلے جاتے تھے، چند دن ایسے حال میں گزرے کہ گویا ایک قسم کا جنون مسلط ہوگیا ہے، عرب مصر، سوریہ، سوڈان کے مسلمانوں کا حال جب اس حد تک خراب ہو چکا ہے تو پھر اب غریب اسلام کہاں پناہ لے گا؟ مرحوم ڈاکٹر اقبال کا شعر بار بار زبان پر جاری تھا۔

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ
اس عہد میں اب تیرا مسلمان کدھر جائے

زیادہ سے زیادہ امید کی کچھ کرنوں کا سراغ آپ کے بیان کے مطابق الاخوان میں ملتا تھا لیکن آپ ہی نے ان کے لیے جو ہدایتی راستہ متعین فرما دیا تھا[1]، اس راہ پر وہ بھی تو نہ چلے، حال کے واقعات سے[2] اس کی تصدیق ہی ہوگئی، گویا تا دہ برآمد[3] کے مصداق درحقیقت وہ بھی تھے، بس تڑپ رہا ہوں، کراہ رہا ہوں، کیا ہوگا

---

[1] اشارہ ہو راقم سطور کے رسالہ ارید ان اتحدث الی الاخوان کی طرف [2] اخوان کی عملی سیاست میں شرکت

اور ورطہ سے دین کا سفینہ کیسے نکلے گا، بھلا جب اپنے ہاتھوں سے مسجدوں میں مسلمان تصویریں لٹکانے لگے[1] اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز[2] کے علماء نے اعفاء اللحی[3] کا ترجمہ عفت الدیار محلہا و مقامہا کی روشنی میں کر کے اسی پر اجماع منعقد فرما لیا ہو تو دین کو اب ہم کہاں ڈھونڈیں؟ کیا عرض کروں سنہ پیچھے آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد پڑا ہوا ہوں ام حسبت ان اصحاب الکہف والرقیم کانوا من آیتنا عجبا معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اندر کوئی پڑھ رہا ہو فلعلک باخع نفسک علی آثارہم ان لم یومنوا بہذا الحدیث اسفا، کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے، عقیدۂ ولدیت کے آثار[4] کے آخر بڑھتے ہوئے کہاں تک پہونچ چکے ہیں؟ بھروسہ اسی پر ہو کہ قرآن کے بعد نہ کوئی کتاب ہی نازل ہونے والی ہے اور نہ محمد رسول اللہ کے بعد کوئی رسول آنے والا ہے، مسلمانوں کا حشر جو کچھ بھی ہو لیکن "الاسلام" کو خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا سے کون نکال سکتا ہے؟

(۱۰ر نومبر ۱۹۵۳ء)

دسمبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کا حادثۂ ارتحال پیش آیا، ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک ایسا سنجیدہ علمی اجتماع منعقد کیا جائے جس میں سید صاحب کے مختلف علمی کمالات اور دینی و تصنیفی خدمات پر علمی مقالات پڑھے جائیں، ہم لوگوں کو سید صاحب مرحوم اور مولانا مناظر صاحب کا باہمی تعلق و ارتباط معلوم تھا، عرصہ سے مولانا لکھنؤ بھی تشریف نہیں لائے تھے اور ان کے احباب و علمی تلامذہ ان کی تشریف آوری اور لطف صحبت کے آرزومند تھے، میں نے آپ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور یہ عرض کیا کہ خواہ مجھے خود حاضر ہونا پڑے لیکن یہ زحمت آپ کو نیازمندوں کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی، مولانا کی صحت عرصہ سے کمزور تھی وہ پہلے سے سفر کے بارے میں بڑے کمزور اور ضعیف الارادہ واقع ہوئے تھے، قلبی شکایت نے ان کو اور بھی محتاط بنا دیا تھا اور وہ سفروں کے سلسلہ کو بالکل بند کر چکے تھے، اندیشہ تھا اور ان کے دوستوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ سفر پر آمادہ نہ ہو سکیں گے، مگر خلاف توقع انھوں نے یہ دعوت قبول فرمالی، اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس جلسہ کی نسبت ان کے ایک محبوب دوست اور فاضل معاصر سے تھی جو اس وقت دنیا میں نہیں ہے زحمت اٹھا کر اور صحت کو خطرہ میں ڈال کر بھی اس میں شرکت کرنا ان کے نزدیک شرافت اور حق کے اعتراف کی دلیل تھی اور ان کی فطری سیادت ان کی متقاضی تھی، حقیقت میں شرافت علو نفس اور مکارم اخلاق کے ظہور کے یہی مواقع ہوتے ہیں، بہت سے اکابر و مشاہیر تو ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے نامور معاصر اور دیرینہ رفیق کے انتقال

---

[1] سوڈان میں بعض مسجدوں میں وہاں کے مشہور شیخ طریقت السید علی میرغنی پاشا کی تصویریں آویزاں ہیں۔ [2] جامعہ ازہر مصر
[3] اعفاء کے معنی چھوڑنے اور بڑھانے کے ہیں، عفا یعفو کے معنی مٹنے کے ہیں، یہ مصرعہ لبید کے معلقہ کا ہے۔ [4] مولانا کا مستقل خیال تھا کہ موجودہ مغربی تمدن مسیحیوں کے عقیدہ ولدیت کا نتیجہ ہے ملاحظہ ہو سلسلۂ مضامین دجالی فتنہ "الفرقان"

کے بعد زبان پر ان کا ذکر لانا بھی اپنی عظمت و خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں، مولانا کا یہ مکتوب (جس میں انھوں نے سفر کی آمادگی ظاہر کی ہے) لفظاً بلفظ پڑھنے کے قابل ہے اور ان کی شرافت نفس علو فطرت اور لطیف جذبات و احساسات کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس کو ان کا سوانح نگار کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء
گیلانی (بہار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

سلیل الکرام البررہ برادر عزیز محترم مولانا سید ابو الحسن علی صاحب وفقکم اللہ لما یحب و یرضی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ جی ہاں! نوازش نامہ کے جواب ہی کی فکر میں تھا کہ اچانک اس دینی و علمی حادثہ کی خبر نے دل و دماغ میں ہلچل ڈال دی۔ مرحوم نور اللہ ضریحہ کے ساتھ دل کے تعلق کی صحیح کیفیت کا علم اب ہوا ہو کافی مدت گزر چکی ہے، لیکن شاید ہی کوئی گھنٹہ بیداری تک کا ایسا گزرتا ہو جس میں ان کا خیال سامنے نہ آجاتا ہو، اور خیال کیا، کہنے کو کہہ سکتا ہوں کہ ان کا طیف نہیں بلکہ شاید وہی سامنے آجاتے ہیں، اس واقعہ کی توجیہ اب سمجھ میں آئی ہے، آخری حج سے واپس ہونے کے بعد۔ اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب مرحوم نے ارقام فرمایا تھا کہ "میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اچانک میری نظر پڑی کہ "تو طواف کر رہا ہے" خیال آیا کہ وہ آتا تو مجھ سے ضرور ملتا، آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ میں خود ملنے کے لیے تیری طرف لپکا لیکن دیکھا کہ تم غائب ہوگیے، پوچھا تھا کہ آخر صوفیوں میں جو مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ کیا اسی کے ظہور کی یہ شکل تھی؟ ان کا شاید یہی آخری گرامی نامہ تھا۔ جواب میں عرض کیا گیا تھا کہ محبت کے یہ سارے کرشمے ہیں ورنہ کہاں یہ سیاہ رو، اور کہاں کعبہ کی نماز و طواف، پہلے تو ان کے اس رقیمہ وداد کو محفوظ کر دیا لیکن خیال گزرا کہ بعد کو کسی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ اور خواہ مخواہ کے وہم میں مبتلا ہو۔ دل کا فیصلہ یہی ہوا کہ اسکو ضائع کر دیا جائے۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ اس راز کو دل ہی میں دبائے رہا۔ آج پہلی دفعہ آپ کے سامنے صرف اس لیے اس واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں کہ اپنے حال سے سید صاحب مرحوم کے حال کی توجیہ سمجھ میں آئی ہے، ان ہی کے قلب انور کا یہ عکس ہے کہ غائب ہونے کے بعد حضوری کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے، سمجھتا ہوں کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی گزرا تھا۔ لیکن "الفضل للمتقدم" اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبت غالب تھی کہ میرے مرنے سے پیشتر اس حال کا تجربہ ان کو ہوا، میرے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا اس کا بروز ان کی وفات کے بعد ہوا۔ غفر اللہ لہ و رحمہ۔

اب اس کے سوا دل کی تسلی کے لیے چارہ کار ہی کیا ہے کہنے والے نے کہا تھا

جمال ذی الارض کانوا فی حیاتہم
بعد الممات جمال الکتب والسیر

وفات کی خبر بھی عجب طرح سے ملی، گوشہ خمول سے نکلنے کا سلسلہ قطعی طور پر منقطع ہے لیکن جس رات کو ان کا وقت موعود ان کے سر پر پہونچا، اسکی صبح کو استھاواں جو دسنہ کے قریب ایک گاؤں ہو میلاد کی مجلس تھی، وہاں کے لوگوں کے شدید اصرار سے اسی مجلس مبارک کی شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ راستہ ہی میں تھا کہ ایک صاحب سنہ کے ملے اور ہوش وحواس پر بجلی اس خبر کو سنا کر گرائی، بولے کہ رات ریڈیو سے دسنہ میں یہ خبر کراچی سے سنی گئی ہو، وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ واقعہ یہ ہو کہ اگر استھاواں جانا نہ ہوتا، تو علی الصباح غالباً ان کے دفن ہونے سے پیشتر اس سانحہ فاجعہ سے آگاہ ہونے کی کوئی شکل میرے لیے نہ تھی۔ اسی وقت جنون میں ایک مرثیہ بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خود بخود دل میں موزوں پذیر ہوا۔ کچھ اشعار تو اسکے اسی وقت کی مجلس میں سنائے گئے بعد کو اخبار میں بھیج دیا۔

بہرحال آپ نے ایک ایسی مجلس میں شرکت کی دعوت دی ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں پاتا۔ اور گنجائش آپ نے باقی ہی کب چھوڑی ہے۔ اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ صحت کے جس حال میں اس وقت ہوں۔ اگر یہی حال باقی رہا کوئی خاص غیر معمولی بے ترتیبی اس میں پیدا نہ ہوئی۔ تو حق سبحانہ وتعالےٰ کی توفیق کے بھروسہ پر یہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس بابرکت مجلس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کروں آپ خود یا کسی صاحب کو بھیجنے کی ہرگز ہرگز تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔ فقیر خود حاضر ہو جائے گا اور ایک آدمی کو اپنے ساتھ رکھ لے گا۔ ہاں! اگر ممکن ہو۔ تو اس سے مطلع فرمائیں کہ آخر یہ جلسہ عام پبلک کی طرف سے ہو رہا ہے۔ یا ذاتی طور پر آپنے اس بار کو اپنے سر پر اٹھایا ہے۔

آپ نے اپنے اس نوازش نامہ میں اس فقیر کے متعلق جن غیر استحقاقی الفاظ کا استعمال فرمایا ہے ان کو پڑھ کر بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اسکا اعتراف کرتا رہا اور اب تو مجسم اعتراف ہوں کہ ان کے فضائل وکمالات سے دور کی بھی نسبت میرے ہفوات مزخرفات کو نہ تھی۔ قلم کے دائرے میں ان کی قلم کاریاں صدیوں تک انشاء اللہ کام آئیں گی۔ دنیا ان کی قدر وقیمت کا اب اندازہ کرے گی۔ بہرحال اب چلئے سعید قلوب کے حسن ظن کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ

اس فقیر کے متعلق جو عنوان مقرر کیا گیا ہے۔ مناسب ہے، کہہ نہیں سکتا کہ اب کچھ لکھا بھی جائے گا۔ یا نہیں۔ اپنے مرثیہ میں ایک شعر یہ بھی لکھا تھا کہ

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پہ رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

یہ عجیب بات ہے کہ اس "نفسیاتی کیفیت" کا انکشاف اب مجھ پر ہوا۔ قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ سید صاحب مرحوم ہی کی نظر سے جب یہ بات نہ گزرے گی تو لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ وہ کہیں ہوں کسی حال میں ہوں، گوشہ خاطر عموماً ان ہی کی طرف رہتا تھا۔ ان کی پاک اور آزاد روح کو خطاب کرکے دعوت دی ہے کہ آپ آئیے اپنے دار المصنفین کی بہاروں کا تماشا کیجئے۔ اسی سلسلے میں ایک شعر یہ بھی تھا

راہ میں آئے گا لکھنؤ اور دریا آباد بھی
ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یاران غار

آخری شعر یہ تھا۔

اور ہو دستہ جو آنا تو رہے اس کا خیال
ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوں کا مزار

اپنے برادر اکبر محسنی و محترمی ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں فقیر کا سلام عرض کر دیجئے۔ مولانا عبدالباری اور مولانا نعمانی صاحبان کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے آخر اس "کہفی" کو کہف سے گھسنے کی ایک صورت نکل ہی آئی۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

مولانا اپنے برادر عزیز مولوی مکارم احسن صاحب کی معیت میں تشریف لائے، اور نہایت ذوق و شوق اور محبت و خلوص کیساتھ دو روزہ اجتماع میں شرکت فرمائی، ایک روز کے اجتماع کی صدارت بھی فرمائی اپنا مقالہ (جو حسب معمول طویل، دلچسپ اور پر مغز تھا) سنایا مقالہ سیرت النبیؐ کے حصہ ششم پر ایک مفصل تبصرہ تھا اس میں دکھایا گیا تھا کہ سید صاحب نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اخلاق نبوی پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر منفرد چیز ہے اور سید صاحب کے علمی کارناموں میں اس کو خاص امتیاز حاصل ہے، اس مضمون میں انھوں نے جس فراخ دلی، فیاضی اور مسرت کے ساتھ اپنے نامور معاصر کے علمی و تصنیفی مقام اور اسکی عظمت کا اعتراف کیا تھا وہ خود مولانا کی عظمت کی دلیل اور ان کی بے نفسی و خلوص کا روشن ثبوت تھا اور علمائے سلف کی یاد تازہ کرتا تھا۔ مولانا نے میری فرمائش پر اپنی وہ نظم بھی سنائی جو انھوں نے

واقعہ کی اطلاع سن کر لکھی تھی اور بعض اخبارات میں چھپ چکی تھی جس وقت مولانا نے اپنی پر اثر آواز میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ وہ نظم سنائی تو سماں بندھ گیا اور بہت سی آنکھیں پرنم تھیں۔

اجتماع کے علاوہ جو اوقات ملتے تھے وہ مولانا کی پربہار مجلس کے لیے وقف تھے، اساتذہ وطلبا کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد رہتا اور حالت یہ تھی کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اجتماع سے فارغ ہو کر اور مولانا عبدالباری صاحب کے یہاں کچھ وقت گزار کر وہ ہمارے مرکز میں تشریف لے آئے، میں نے ایک روز ان سے ان نعتوں کے سنانے کی فرمائش کی جو انھوں نے پیاری ہندی میں لکھی ہیں اور جو سوامی دھرمی جی گیلانی والے کی طرف سے بعض اخبارات ورسائل میں چھپی ہیں، ان نعتوں میں ان کی محبت سوز اور بارگاہ نبوی سے عاشقانہ تعلق بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہو گیا ہے، ہندی کے میٹھے بول، مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع اس سب نے مل کر اس میں عجب دلکشی اور دل آویزی پیدا کر دی ہے، مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکتے اور سننے والے بھی متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے، مجھے یہ نعتیں بیحد عزیز ہیں، مجھ پر ان کا ایک احسان بھی تھا، انھوں نے مجھے مدینۂ طیبہ میں بھی کیف وذوق بخشا ہے، کبھی جی چاہتا کہ صرف ان نعتوں کے سننے کے لیے گیلانی کا سفر کروں، ایک پاک قطرۂ اشک اس سفر کو وصول کرانے کے لیے بہت کافی ہے بلکہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

اب یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی تھی اس لیے کیوں نہ اس کی قدر کی جاتی، بار بار فرمائش کی اور مولانا نے بلا کسی تکلف کے فرمائش پوری کی اور اجلس بنا نؤمن ساعۃ" کا لطف بخشا، افسوس ہے کہ خرابی صحت کی بنا پر مولانا کا قیام طویل نہ ہو سکا، اور مولانا نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی اور ہم سب کہتے رہ گئے کہ

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

مولانا کا تعلق خاطر اس ناچیز دبے ہنر سے بڑھتا گیا، اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے بھی ان سے جو فکری مناسبت اور قلبی تعلق محسوس ہوتا وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اپنے ایک شفیق استاد اور عزیز بزرگ سے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں مولانا پر پہلی بار قلبی دورہ پڑا اور وہ گیلانی سے پٹنہ لیجائے گئے جہاں عرصہ تک علاج ہوتا رہا، گیلانی واپسی اور طبیعت کے سنبھلنے پر اس ناچیز نے بھی مزاج پرسی کا عریضہ لکھا، اس میں شاید اس شبہ کا اظہار تھا کہ مولانا اپنے اس نیاز مند سے کچھ ناراض یا کبیدہ خاطر تو نہیں ہیں، مولانا نے اس پر ایک نہایت پر محبت و پر شفقت مکتوب لکھا، جس سے ان کے تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا محبت سے لبریز دل عطا فرمایا تھا۔

"ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ کیا آیا کہ دیر تک بکا کی کیفیت میں الٹ پلٹ ہوتا رہا، اللہ اللہ آپ کے قلب مبارک میں خواہ بشکل وسوسہ ہی سہی یہ خیال کیسے اور کیوں آیا کہ

اس مخلص نیاز مند کے دل میں آپکی طرف سے کسی قسم کا تغیر پیدا ہو گیا

واللہ جن ہستیوں کی محبت واخلاص کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں انکی طرف سے تغیر پیدا ہونے کی شکل ہی کیا ہے وانشدکم باللہ

حقہ مہر جاں مہر و نشان ست کہ بود

اپنی علالت کے ایام میں جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید اپنی یہ آخری علالت ہے تو من جملہ دوسرے خیالات کے ایک خیال آتا تھا جسے شیخ شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف لوگوں نے منسوب کیا ہے یعنی وفات کے وقت زبان مبارک پر جاری تھا

اھیم بلیلی ما حییت وان أمت

أوکل بلیلی من یھیم بھا بعدی

پہلے مصرعہ کا مصداق تو کسی حیثیت سے اپنے آپ کو قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن دوسرے مصرعہ میں جس آرزو کا اظہار کیا گیا ہے یہ آرزو اپنے ساتھ بھی آتی اور معاً اسی کے ساتھ آپ کا وجود متمثل ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا، بیماری کے ان طویل دنوں میں کچھ دن بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بھی گزرے، لیکن بایں ہمہ آپکی نقل وحرکت کی خبریں کسی نہ کسی ذریعہ سے ملتی رہتی تھیں، رشک ضرور آتا تھا، جب کوہڑی میں مولانا عبدالقادر مدظلہ العالی کی مجلس ذکر میں شرکت کا موقعہ حق تعالےٰ کی طرف سے آپ کے لیے مہیا کیا گیا، بڑے مبارک دن تھے جو آپ کے گزرے۔

(۲۹ ستمبر ۵۴ء)

مولانا کی علالت کا سلسلہ چلتا رہا اور ایسے وقفے بھی آتے رہے کہ مولانا بالکل صاحب فراش رہے، اور کبھی کبھی تو زندگی خطرہ میں نظر آتی، بایں ہمہ مولانا کا علمی ذوق اپنا کام کرتا رہتا، ذرا طبیعت سنبھلتی تو لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے، اپنے دوستوں اور نیاز مندوں کی کسی تحریر یا تصنیف سے متاثر ہوگئے تو اپنے تاثر کی اطلاع دیتے اگر کوئی اہم تصنیف شائع ہوتی اور مولانا کو نہ بھیجی جاتی تو شکایت فرماتے، اس خطے انکے

ملی وادبی ذوق وشغف کا اندازہ ہوگا جو گویا بستر علالت ہی سے لکھا ہے

"اگر یہ خیال فرما لیا گیا تھا کہ جو بیمار آخر بیم وامید کی کش مکش سے نجات پا کر وہاں
پہونچ گیا یا پہونچا دیا گیا جہاں سے پہونچنے والوں نے یہ نعرہ بھی لگایا ہے کہ

تعالی اللہ ازیں بہتر چہ باشد
کہ از ننگ وجود خویش رستم

"سید احمد شہید" غلام رسول مہر کے تقریظی مضمون[1] کو پڑھ کر خصوصاً مہر صاحب کے
حسن انتخاب کی داد فارسی اشعار کے متعلق جو دی گئی ہے، واقعہ یہ ہو کہ اکثر شعروں
نے اسکو بھی زندوں کی طرح تڑپا دیا جسے مردہ تصور فرما لیا گیا ہے، بہرحال بیماری
نے تو پیچھا نہیں چھوڑا ہے لیکن کش مکش سے ابھی نجات بھی نہیں ملی ہے، بلکہ ادھر
کچھ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے کہہ سکتا ہوں کہ شکایات بے شمار کے بعض پہلوؤں میں گونہ
تخفیف کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔

البعث الاسلامی[2] کا دوسرا شمارہ بھی باصرہ نواز ہوا، بڑے حوصلہ اور بڑی
ہمت کا کام ہے، خدا کرے کہ ہمارے مدارس کے خوابیدہ بزرگوں کو جھنجھوڑنے
میں یہ آواز کامیاب ہو۔"

کچھ تو مولانا کی افتاد طبع اور شاید خاندانی لینت ورفق اور کچھ جامعہ عثمانیہ کے طویل تعلق اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے مسلسل سابقہ نے مولانا کی تحریر و تعبیر میں جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کے بیان کرنے میں حکمت و تدریج کا پہلو غالب کر دیا تھا اور وہ گویا کلموا الناس علی قدر عقولهم کے مشورہ پر عمل فرماتے تھے اور ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة کی تعمیل خیال فرماتے تھے، وہ اپنے عقائد و خیالات اور علم میں پورے راسخ و متصلب تھے، لیکن اپنے طرز بحث، اور طرز تحقیق و استدلال میں بالکل عصری اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وہ دیوبندی العلم مگر ندوی الفکر یا ندوی القلم تھے، اور شاید یہی ہم لوگوں سے اور بالخصوص اس راقم سطور سے مناسبت کی وجہ تھی، ہمارے محترم و مخدوم مولانا عبدالباری صاحب ندوی العلم اور ندوی القلم ہونے کے باوجود اور برسوں یونیورسٹی میں فلسفہ کا درس دینے

---

[1] سید احمد شہیدؒ مصنفہ مولانا غلام رسول مہر پر مفصل تبصرہ شائع شدہ "الفرقان"
[2] عربی ماہوار رسالہ۔

کے بعد بھی تحریر و تعبیر میں بھی کسی قسم کا اوپرا و جدید اسلوب بیان یا اسلوب استدلال پسند نہیں فرماتے، مولانا گیلانی کی کتاب اسلامی معاشیات پہلے طرز فکر اور طرز تحریر کا نمونہ ہے اور مولانا عبد الباری صاحب کی کتاب "تجدید معاشیات" دوسرے طرز فکر اور طرز تحریر کا، جب وہ شائع ہوئی تو شاید مولانا گیلانی کو محسوس ہوا کہ وہ ان کی کتاب کا جواب ہو، شاید اسی سلسلہ میں دونوں مخلص دوستوں اور دیرینہ رفیقوں میں کچھ مراسلت بھی ہوئی اور ہر ایک نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا، مجھے اس کی اطلاع نہیں لیکن مجھے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> (تھانوی المذاق ندوی القلم) بزرگ کا معتوب بنا ہوا ہوں، کہ ان کی تازہ کتاب "تجدید معاشیات" کو اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" کا تعریضی جواب خاکسار نے خیال کر لیا، خاکسار نے بھی اور ان کے دوست "صاحب صدق" نے بھی، مقصد میں ہم دونوں متحد ہیں، لیکن پانی مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پن بھرن سے کہا جائے ماں! ذرا پانی پلا دے لیکن ماں! کی جگہ کچھ دوسرے الفاظ دالہ علی الاموت کا ذکر کیا جائے تو یقیناً اثر بدل جائے گا، حضرت تھانوی ہی سے یہ اطروفہ سنا کرتا تھا، بہرحال حکم فاصدع بما تؤمر کا بھی ہے اور ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ کا بھی، مکلفین کے اختیار تمیزی کی یہ بات ہے کہ وقت کس کا ہے؟
>
> (۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء)

لیکن مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت و حکمت تحریر و تعبیر اور استدلال ہی میں تھی، عقائد و نصوص اور حدود دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلب و متشدد اور ویسے ہی غیور و حساس واقع ہوئے تھے جیسے ان کے اساتذہ و شیوخ کرام اور علمائے حق، جب کبھی وہ تحریف دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے، مولانا سندھی مرحوم جب ہندوستان واپس آئے تو ان مرحوم نے بعض ایسے خیالات اور افکار کا اظہار کرنا شروع کیا، جن میں توازن کی بڑی کمی تھی اور جو بڑی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا باعث ہو سکتے تھے، ان کے کسی مضمون میں قرآن و حدیث و فقہ سے متعلق بعض ایسے نظریات و "تحقیقات" تھے جو جمہور اہل اسلام کے عقیدہ سے مختلف تھے یا ان کی تعبیر میں کوتاہی تھی، مولانا نے مذہبی و جماعتی عصبیت سے بالکل بے نیاز و بالاتر ہو کر اس مقالہ کی تردید میں ایک پر زور مقالہ لکھا، بعض اہل علم معاصرین مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم سے ذاتی واقفیت کی بنا پر ان کو اس شدید مخالفت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے مولانا کی طرف سے کچھ صفائی پیش کی

اور اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر ان کے ساتھ نرمی اور حسن ظن کی تلقین کی، مولانا نے اس موقع پر اپنے موقف کی حمایت کی اور مولانا سندھی مرحوم سے اظہار اختلاف اور ان کے افکار و آراء کی کھلی ہوئی تنقید و تردید کو دین کی حمایت کا تقاضا سمجھا، مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے دینی جذبہ اور تصلب فی الدین کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"میرا تو مقصود ہی اس سے ع حدی را تیز تر می خواں چو ذوق نغمہ کم یابی تھا یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت ہی کا آدمی کیوں نہ ہو، لوگوں میں اسکی بڑائی جس حد تک بھی مسلم ہو لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ کوئی ہو ولو ان فاطمة بنت محمد اعاذها الله تعالیٰ سرقت لقطعت یدها ہمارے دین کا امتیازی نشان ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرنے سے پہلے العیاذ باللہ میں بھی اس کا قائل ہو جاؤں گا کہ ابو حنیفہؒ کی فقہ عجمیوں کے قانون سے متاثر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سرزمین عرب کے ایک خاص تاریخی دور کی اصلاح کی حد تک محدود ہے، قرآنی قوانین کی حیثیت صرف مثالی باتوں کی ہے، بخاری و مسلم انجیل و توراۃ جیسی محرف کتابوں کے ہم وزن ہیں۔ العیاذ باللہ کیا میں اپنی خودی کے اعتماد کو خدا اعتمادی سمجھنے لگوں گا، قبل اسکے کہ میرے اندر خدانخواستہ اس قسم کے خیالات کی صداقت واضح ہو، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے"۔

(۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء)

اس اقتباس سے جو اپنی حمیت اور حفاظت دین کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے، اندازہ ہو سکتا ہو کہ عقائد و نصوص اور دین کی ہیئت و حقیقت کی حفاظت میں مولانا کا قدم اور قلم کسی بڑے سے بڑے عالم راسخ سے پیچھے نہیں، دراصل ان کا سارا توسع طرز تحریر و طریقۂ تفہیم میں تھا، ان کی کتابیں اور مضامین نئے اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں تو وہ اپنی کتابوں میں تاریخی مواد اس سلیقہ اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں، اور اپنے دعوے کو ایسے علمی و تحقیقی انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم مدرسہ کے فاضل اور ایک فقیہ و محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصر حاضر کے مصنف اور اجتماعیات و علوم عمرانیہ کے فاضل معلوم ہوتے ہیں، نمونہ کے طور پر مولانا کا مضمون[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پر اور مولانا کی محققانہ کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت"

نیز "اسلامی معاشیات" اور "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" ملاحظہ ہوں، مولانا کی اسی جامعیت نے ان کو اپنے معاصر علماء میں ایک امتیاز بخشا تھا، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی تصنیفات کا گرویدہ بنا دیا تھا،

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کے قیام نے مولانا کے اندر ایک تبدیلی اور پیدا کر دی تھی، یا یوں کہیے کہ ان کے اندر کی ایک دبی ہوئی صلاحیت کو ابھار دیا تھا وہ یہ کہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ و تجربہ نے ان کو اس نتیجہ پر پہونچا دیا تھا کہ صرف ظاہری شکل و صورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بیدین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے قلب و اندرون کی اسلامیت کی قدر کرتے ہوئے اس کے ظاہر کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اس طرز فکر اور اس طرز عمل کے بغیر کوئی شخص جدید حلقہ میں کوئی اصلاحی و دینی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

یہ راقم حروف جب ۱۹۵۱ء میں دمشق گیا تو وہاں اس نے مسلمان نوجوانوں اور خاص طور پر جماعت اخوان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں میں یہی دو متضاد پہلو پائے، ایک طرف ان کی ظاہری شکل و صورت ہم جیسے مذہبی اشخاص کے لیے انقباض و اعتراض کا موجب تھی، دوسری طرف ان کی ایمانی کیفیات، ان کا جذبہ اسلامی، ان کی حمیت دینی، ذوق جہاد، نمازوں کی پابندی، حزب قوم پرستی سے بیزاری اور رشتہ اسلامی پر کامل یقین، الحاد اور اہل الحاد سے عداوت موجب مسرت و انبساط تھی، اور بالآخر یہ دوسرا تاثر پہلے تاثر پر غالب آجاتا، میں نے مولانا کی خدمت میں دمشق سے جو پہلا خط لکھا اس میں اپنی اسی ذہنی کشمکش اور تاثر کا اظہار تھا، مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"بڑی مسرت اس بات سے بھی ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی پود کے متعلق آپ پہلے آدمی ہیں جن کے قلم نے میری آنکھوں نے وہی لکھا ہوا پایا جس کا برسوں سے انتظار کرتا رہا، ممکن ہے کہ یہی نقطہ نظر دوسرے ارباب فکر و بصیرت کا بھی ہو لیکن جن جنچے تلے الفاظ میں اپنے احساسات کا اس سلسلہ میں آپکے اظہار فرمایا ہے خاکسار تو نکتہ چینوں سے اتنی جرأت بھی نہیں کر سکتا، قالب و قلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آجاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، میرے خیال میں تو قالب و قلب یا ظاہر و باطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے، آغاز تو عہد صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا، عمامہ پر "پرعقاب" لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آپ کو یاد ہے؟ اور "پرعقاب" ہی کیا خز کے استعمال کی کثرت کے ساتھ ساتھ خود مدینہ منورہ کے باشندوں میں، تابعین و تبع تابعین ہی کے

عہد سے جو تبدیلیاں لباس میں وضع میں قطع میں رہنے سہنے کے طریقوں میں مسلسل ہوتی رہی ہیں
تاریخ ان کی شہادتوں سے معمور ہے، لیکن قلب اگر درست ہے تو قالب کی ان تبدیلیوں
کو اکابر برداشت ہی کرتے چلے آرہے ہیں، اخوانِ شام کے دینی جوش و خروش، اخلاص
وعدِ آفت النصح للہ ولرسولہ وللمؤمنین کی جن قلبی خصوصیتوں کا آپ نے
ذکر فرمایا ہو اس کو جانتے ہوئے صرف قالب کے مطالبات میں ان کی کوتاہیاں اپنا
خیال تو یہی ہے کہ درگذر کے قابل نہ بھی ہوں لیکن قول لین کا مستحق ان کو ضرور بنادیتی
ہیں، ہمارے علماء اگر فظاظت و غلظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری فرماویں گے
تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا فیصلہ محکم (لانفضوا من حولك) کی شکل میں ان
کے سامنے نہ آئے۔"

(۸ مئی ۱۹۵۶ء)

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مولانا کو تاریخ اسلام سے فطری ذوق اور اس سرزمین سے جہاں اس تاریخ کی بنیاد پڑی ہے ایک فطری لگاؤ تھا، شاید اسی راستہ سے ان کو عالم اسلام بالخصوص بلادِ عربیہ کی سیاحت کا بڑا ارمان اور دیرینہ تمنا تھی، رسالہ "صبح صادق" لکھنؤ میں میرے خواہرزادہ عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ کا سلسلۂ مضامین "جہاں مسلمان بستے ہیں" کے عنوان سے نکلتا رہتا ہے جس میں مختلف ممالک اسلامیہ کا تعارف ہوتا ہے، مولانا نے لکھنؤ آمد کے موقع پر بتلایا کہ وہ اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، اس تقریب سے انھوں نے اپنے شوق سیاحت کا تذکرہ اور اسکے بعض ابتدائی اقدامات کا ذکر فرمایا، راقم سطور نے دمشق پہونچ کر جس ہوٹل میں قیام کیا تھا حسن اتفاق سے اس کا نام "الیرموك" تھا، میں نے مولانا کی خدمت میں وہیں سے خط لکھا، دمشق پھر یرموک کے نام نے مولانا پر ایک وجد کی کیفیت طاری کردی اور باوجود آخری علالت اور نقاہت کے ان کے قلم میں جوانی کی توانائی اور رعنائی پیدا ہو گئی اور میرے خط کے جواب میں انھوں نے یہ وجد انگیز خط لکھا، جو ان کی ممتاز ادبی تحریروں میں شامل کیے جانے کا مستحق ہے۔

"کس نے کہاں کن حالات میں اس زار و نزار، بیمار، دور افتادہ دہقانی کو یاد فرمایا،
سوچتا ہوں اور کھڑا ہونا بھی میرے لیے آسان نہیں ہے مگر بے ساختہ جی چاہتا
ہے کہ سجدۂ شکر یاد دلانے والے کے قدموں پر ادا کر کے رقص کروں، خدا ہی
جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے
پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہل چل برپا کردی ہوگی جب اپنے آپ

کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مکتوب گرامی میں صرف الیرموک کے لفظ پر نظر پڑتے ہی تخیل کو اچھا خاصہ جو تھوڑا بہت ہمارا املا تو گھنٹوں یرموک اور جو کچھ اس کے ساحل پر گزرا اسی میں غرق ہو گیا الواقوصہ کی وادی میں پہاڑوں کے کھڈ میں ٹپک ٹپک کر کافر گر رہے ہیں اور ان کی بڑی تعداد یرموک برد ہو رہی ہے ہم آگے بڑھ رہے تھے، دنیا پیچھے ہٹتی جاتی تھی، پھر بازی پلٹی ہوا جو کچھ ہوا، یہی کیا غنیمت نہیں ہے کہ الیرموک کے کنارے مسلمانوں کا پھریرا لہرا رہا ہو، فندق الیرموک شہر سے چاہیے تو یہی تھا کہ کافی فاصلہ پر ہو گو اس عہد میں مسافت و فاصلہ کا سوال باقی نہیں رہا ہو یا آبادی دمشق کی پھیل کر الیرموک تک پہونچ گئی ہو۔[1]

بہر حال آپ نے بڑا احسان کیا جس سرزمین برکتوں سے بھری ہوئی کا تصور سالہا سال تک پالتا رہا ہوں اس کی چشم دید جھلک آپ کے موئے خامہ کے ذریعہ اس کوردہ گاؤں میں پہونچ گئی فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔

دمشق کے نام سے مولانا کے تاریخی اور علمی ذوق میں حرکت پیدا ہوئی، اور ان کے تصور نے ان کو ایک گاؤں کے گوشۂ عزلت اور بستر علالت سے اٹھا کر شام کے قدرتی مناظر، تاریخی مآثر اور علمی مراکز میں پہونچا دیا اور وہ یہ بالکل بھول گیے کہ وہ قلب کے مریض اور بقول خود ایک کھٹ کے گوشہ نشین ہیں، فرماتے ہیں:۔

"واقعی آپ کا وجود مسعود اس وقت کم از کم میرے لیے سراسر رشک و غبطہ بنا ہوا ہو، خیال شام کے ان مناظر کا ایک طرف جاتا ہے جن کی تفصیل کرد علی صاحب کے خطط الشام میں پڑھ چکا ہوں اور دھیان ان اسلامی تعمیرات کی طرف منتقل ہوتا ہو جنہیں عمر بن عبد العزیز جیسے بزرگوں نے اس لیے باقی رکھا کہ وہ غیظ القلوب الکفار نظر آتے ہیں، سب سے زیادہ تڑپ دل میں ان کتابوں کی پیدا ہو رہی ہے جن سے شام کے کتب خانے پٹے پڑے ہوں گے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ و ابن قیم، علامہ ذہبی السبکی و آلہ کے وطن میں جو کچھ مل رہا ہو اسے ملنا ہی چاہیے، یوم المحاضرہ کے بعد تو ہفتہ بھر آپ کا ان ہی چیزوں کی سیر و تماشے میں بستر ہوتا ہوگا،

---

[1] دراصل ہوٹل کا نام صرف تبرکاً الیرموک رکھا گیا ہو، ورنہ الیرموک کے نام کا دریا اور اس کے ساحل کا میدان جنگ دمشق سے بہت فاصلہ پر شرق اردن کے حدود میں واقع ہے، علی

معلوم نہیں کہ دول الاسلام ذھبی کا مکمل نسخہ اور مرآۃ الزمان ابن الجوزی السبط کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہو، جی چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم دونوں کتابوں کے مطالعہ کا موقعہ مل جاتا، ابن عساکر کی تاریخ دمشق خدا جانے مکمل ہو کر بازار میں آگئی یا نہیں، میرے پاس تو صرف ابن بدران کی تلخیص کی ساتویں جلد تک ہے، کیسی عجیب بات ہو کہ دو مختلف وادیوں کے شیخ یعنے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور الشیخ الاکبر ابن عربی دونوں کے لیے دمشق کے آغوش میں جگہ نکل آئی، اس زمانہ میں شیخ الاسلام کے عقیدت مندوں کی تو کافی جماعت ہوگی کیا بے چارے الشیخ الاکبر کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لیے بھی کوئی کھڑا کر دیا گیا ہے، ابن تیمیہ اور ان کے تلامذۂ راشدین کی کوئی غیر مطبوعہ نادر کتاب آپ کی پسند کی کیا ملی؟ ان بزرگوں کے لیے تو یورپ کے عصری مذاق کی رو سے چاہیئے تھا کہ الگ الگ سوسائٹیاں شام میں بن جائیں جو ان کی اصل کتابوں کو بھی شائع کرتیں اور ان کے علمی و نظری اختراعات و تخلیقات کا کام کرتیں، یہ اور اسی قسم کے وساوس و اوہام میں اپنے بستر علالت پر دو ڈھائی سال سے کروٹیں بدل رہا ہوں۔"

(۸ مئی ۱۹۵۶ء)

اس مکتوب گرامی کا جواب دینے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ترکی کا سفر پیش آگیا، قسطنطنیہ سے تو کسی خط کے لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ سارا دن وہاں کے تاریخی آثار کے دیکھنے میں گزر جاتا مگر قونیہ پہونچ کر اور مولانا روم کے مزار کی زیارت کر کے بے اختیار مولانا یاد آئے اور ان کو اور مخدومی مولانا عبد الماجد دریابادی کو اپنے تاثرات لکھنے کا جی چاہا، وہیں قونیہ کے یک روزہ قیام میں خط لکھا اور ڈاک کے سپرد کیا، دمشق پہونچ کر اس کے جواب کی توقع تھی، معلوم نہیں دمشق دیر موک کی طرح مولانا اور ان کے محبوب شہر کا نام سن کر مولانا کے قلب پر کیا اثر ہوتا، اور انکے قلم سے کیا تاثرات ظاہر ہوتے، دمشق واپس ہوا تو برادر معظم ڈاکٹر عبد العلی صاحب مدظلہ کا گرامی نامہ ملا جس نے یہ خبر سنائی کہ مولانا سفر آخرت پر روانہ ہوگیے اور اپنے خالق سے جا ملے۔ یہ ایک دینی، علمی، ادبی حادثہ تھا اور میرے لیے ایک ذاتی حادثہ بھی، میرا تعلق مولانا سے صرف ذہنی و علمی ہی نہ تھا شخصی اور قلبی بھی تھا، مسافرت میں ایسا معلوم ہوا کہ ایک بزرگ خاندان کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جہاں تک علم و دین اور فضیلت و تحقیق کا تعلق ہے مولانا ہماری گزشتہ دینی تعلیم کے بہترین نمونوں میں تھے، اور مدارس کے دور انحطاط کو دیکھتے ہوئے

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترکش مارا خدنگ آخریں

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے وسعت نظر، وسعت مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ والغیب عند اللہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے، اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ جانے والے پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے، اور اپنے انعامات سے مالامال کرے کہ وہ بڑا دردمند، بڑا پر محبت دل رکھتا تھا اور اسکے قلب و دماغ کی ساری صلاحیتیں کسی نہ کسی طرح اسی "الاسلام" کی خدمت میں (جس کے سوا کوئی دین اسکے یہاں قبول نہیں) اور اسی النبی الخاتم کی ابدی نبوت و سیادت کے ثبوت میں اور اسی کے علوم کی نشر و اشاعت میں جس کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں صرف ہوئیں وہ جب تک زندہ رہا اسی کے گن گاتا رہا اور اپنے دیس کی بے تکلف بولی میں اس کو خطاب کر کر کے سناتا رہا

تجھ سے توڑوں تو کس سے جوڑوں ، تیری گلی کی دھول بٹوروں

یقین کامل ہے کہ خدا کی رحمت کاملہ نے اس کو اسی محبوب کے عشاق اور اس کے دین کے مخصوص خدام میں شامل فرمایا ہوگا جس کا کام کرتا ہوا وہ زندہ رہا اور جس کا نام لیتا ہوا وہ دنیا سے رخصت ہوا،

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر کیا دوانے نے موت پائی ہے

مولانا گیلانی اور الفرقان

از ـــــ محمد منظور نعمانی

۱۳۵۶ھ (م ۱۹۳۸ء) میں جو الفرقان کی عمر کا پانچواں سال تھا، "الفرقان" کا مجدّد الف ثانی نمبر نکالنا طے کیا گیا۔ اسکے لیے اپنے جن بزرگوں سے مضامین کی درخواست کی گئی اُن میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم بھی تھے۔ ایک عریضہ اسی سلسلہ میں اس ناچیز نے مولانا گیلانی مرحوم کو بھی لکھا، مولانا موصوف سے اس عاجز کا اس وقت تک کوئی ایسا تعلق اور تعارف نہ تھا جس کی بناء پر درخواست کی پذیرائی کی کوئی خاص امید کی جا سکتی ـــــ اور اس باب میں مولانا کی سخاوت اور فیاضی کا جو تجربہ بعد میں ہوا اس کا اس وقت وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا ـــــ اس لیے خط تو اگرچہ لکھ دیا گیا تھا لیکن مولانا کے مقالہ کی کوئی خاص توقع نہ تھی ـــــ لیکن اللہ کی شان! بالکل بلا قصد بلکہ بلا شعور خود مجھ سے یا دفتر الفرقان کے اس وقت کے محرّر سے یہ غلطی ہو گئی کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا خط بھی حضرت مولانا عثمانی مرحوم والے عریضہ کے ساتھ ملفوف ہو کر انہی کے لفافے میں چلا گیا۔ چند روز بعد ڈابھیل سے حضرت مولانا ممدوح کا جواب آیا جس میں خود کچھ لکھنے سے معذرت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ "آپ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے نام کا خط میرے پاس غالباً اس لیے بھیجا ہو گا کہ میں اس پر اپنی طرف سے کچھ لکھ کر ان کو بھیجدوں، میں نے ایسا کر دیا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کے نمبر کے لیے ان شاء اللہ ضرور کچھ لکھ دیں گے۔"

بہرحال مجھے حضرت مولانا کے اس خط ہی سے معلوم ہوا کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا میرا خط بجائے حیدرآباد جانے کے حضرت مولانا عثمانی والے خط کے ساتھ ملفوف ہو کر ڈابھیل چلا گیا، لیکن یہ معلوم کر کے کہ حضرت مولانا نے اپنی طرف سے اس پر کچھ لکھ کر حیدرآباد روانہ فرما دیا ہے، اس اتفاقی غلطی پر خوشی ہی ہوئی ـــــ یاد آتا ہے کہ اس کے بعد میں نے مولانا گیلانی کو دوسرا خط لکھا اور اس میں اصل واقعہ لکھنے کے ساتھ اپنے اس خیال کا بھی اظہار کر دیا کہ اگرچہ یہ غلطی بالکل بلا قصد محض اتفاق سے ہوئی تھی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ غلطی کرا کے میری بڑی مدد فرمائی، اگر یہ غلطی نہ ہوئی ہوتی تو صرف میرا عریضہ آپ کو لکھنے پر شاید آمادہ نہ کر سکتا ـــــ مولانا نے اپنے جواب میں کسی حد تک میرے

اس خیال سے اتفاق فرمایا اور لکھا کہ بہر حال آپکے نمبر کے لیے مقالہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔

پھر چند ہی دن بعد قریباً ۶۰ صفحے پر مولانا کا وہ تاریخی مقالہ آگیا جو مجدد الف ثانی نمبر میں بعنوان —— الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ —— شائع ہوا تھا اور جو اہل نظر کی نگاہ میں مولانا مرحوم کے چند منتخب شاہکار اور یادگار مضامین میں سے ہے اور جس نے حضرت مجدد الف ثانی کے مقام اور ان کے اصل تجدیدی کام کو سمجھنے کی ایک نئی راہ کھولی ہے۔

الفرقان میں شائع ہونے والا مولانا مرحوم کا سب سے پہلا مقالہ یہی تھا اور اسی سے الفرقان اور ناچیز مدیر الفرقان پر مولانا کی عنایتوں کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس مقالہ کا ایک تتمہ بھی قریباً ۲۰ صفحے کا مولانا نے لکھا۔ اس کے بعد ایک دو قسطوں میں پورے ہو جانے والے متعدد مقالات کے علاوہ ایک اہم اور مبسوط مقالہ مولانا نے امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی پر الفرقان کے لیے لکھا جو ۱۳۵۸ھ و ۱۳۵۹ھ میں باقساط الفرقان میں شائع ہوتا رہا، اور بعد میں کچھ اضافہ اور تکمیل کے بعد وہ مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ پھر ۱۳۵۹ھ میں الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکلا، اس کے لیے مولانا نے میری گزارش پر اپنا وہ مبسوط مقالہ لکھا جس نے شاہ ولی اللہ نمبر کے قریباً سوا سو صفحات لیے۔ یہ مقالہ در اصل ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ پہلے کتب خانہ الفرقان کی طرف سے اور اسکے بعد بعض دوسرے اشاعتی اداروں کی طرف سے کتابی شکل میں بھی اس کو شائع کیا گیا۔

اس کے بعد سے الفرقان کے ساتھ مولانا مرحوم کا تعلق کچھ ایسا ہو گیا کہ گویا انھوں نے اس کو اپنا لیا، اور اپنی خاص سرپرستی میں لے لیا، خود بھی مسلسل لکھتے رہتے اور جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے بی اے ایم اے کے اپنے ہونہار شاگردوں کو خاص خاص موضوعات پر مواد دے کر اپنی رہنمائی اور نگرانی میں جو تحقیقی مقالات اُن سے لکھاتے ان میں سے بھی انتخاب کر کے الفرقان کے لیے بھیجتے رہتے ——

اس زمانہ میں میری توجہ بعض دوسرے کاموں کی طرف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے میں الفرقان کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ٹھیک اسی زمانہ میں مولانا مرحوم کو الفرقان کی خصوصی سرپرستی کی طرف متوجہ فرما کر اور اس کے ساتھ ایک خاص لگاؤ اُن کے دل میں پیدا فرما کر اس کی زندگی کا ایک سامان پیدا کر دیا، اگر مولانا کی یہ عنایت لطیفۂ غیبی کے طور پر اس وقت الفرقان کو حاصل نہ ہوتی تو شاید اسی زمانہ میں یعنی اب سے تقریباً ۱۵۔۱۶ سال پہلے الفرقان بند ہو گیا ہوتا —— مولانا کی یہ نوازش اور عنایت محض لِلّٰہ فی اللہ تھی۔ جزاھم اللہ تعالیٰ احسن ما یجزی بہ عبادہ المحسنین۔

پھر ۶۱ھ اور ۶۲ھ میں میری صحت بہت خراب رہی، دو دفعہ بیماری کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ صحت و مرض کے عام تجربی قانون کے تحت زیست کی امید کے لیے بہت کم گنجائش رہ گئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے

صحت وحیات بخشی، ان دنوں الفرقان کی اشاعت بہت ہی غیر منظم رہی، زیادہ پرچے دو دو تین تین مہینے کے مشترک ہی شائع ہوئے۔ شعبان ۱۳۶۲ھ کی آخری تاریخوں میں جبکہ میں بستر علالت سے اٹھا ہی تھا، مولانا نے ازراہ شفقت ودردمندی اپنے ایک کرم نامہ میں مجھے لکھا۔

"اس مہینے کے تمام پرچے نکل چکے...... بھئی......، بھئی، الفرقان بیچارہ ابھی نازل نہ ہوا، میرا تو جی چاہتا ہو کہ الفرقان کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لوں ..... اگر وقت پر چھاپنے کے لیے آپ آمادہ ہوں تو مضامین شذرات وغیرہ ہر مہینے تیار کر کے بھیجنے پر فقیر اپنے کو تیار کرلے۔"

مولانا کا یہ خط مجھے رمضان المبارک کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو ملا، اس کے ملنے سے دو ہی دن پہلے میری مرحومہ اہلیہ (مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کی والدہ) پر اچانک مرض کا سخت حملہ ہو چکا تھا، ان کے اس مرض اور اس تکلیف کا خاتمہ پانچویں دن ان کے انتقال پر ہوا، اور وہ اس دنیا سے اٹھالی گئیں (اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا معاملہ فرمائے اور ان کی روح کو شاد رکھے)

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہو میں خود چند ہی دن پہلے بستر علالت سے اٹھا تھا، بلکہ درحقیقت ابھی نیم بیمار ہی تھا، اس حادثہ نے پھر صحت پر اثر ڈالا اور میں پھر بیمار پڑ گیا، میرے معالجین نے اصرار کے ساتھ مجھے مشورہ دیا کہ عرصہ تک اب کسی قسم کا کوئی کام مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے مولانا مرحوم کو گھر کے اس مفاجاتی حادثہ کی اور اپنی حالت اور معالجین کے مشورہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی عرض کیا کہ اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے خط میں آپ سے شفقت و دردمندی کے یہ انتہائی لفظ کیوں لکھوائے تھے، بہرحال اب تو اللہ تعالیٰ نے حالات ہی ایسے کر دیے ہیں کہ الفرقان کے زندہ اور جاری رہنے کی صورت صرف یہی ہو کہ آپ ہی اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں۔

مولانا نے یہ ذمہ داری قبول فرمالی اور اپنے افتتاحی شذرات کے لیے بجائے "نگاہ اولیں" کے "فواتح" کا عنوان پسند فرمایا۔ شوال ۱۳۶۲ھ کا پرچہ مولانا ہی کی ادارت میں نکلا، افتتاحیہ کی ابتدائی چند سطریں یہ تھیں۔

سبحان اللہ وبحمدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ وعبدہ وآلہ وصحبہ

مخدوم ومحترم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان صرف بیمار ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کی تیمارداری کرنے والی جنت نصیب بی بی کو بھی اللہ میاں نے بلالیا، یہ وقت صرف ان ہی کے لیے نہیں الفرقان بیچارہ کے لیے بھی سخت تھا، اور ہے، میرے ایک مجذوبانہ خط کو مولانا نے پکڑ لیا۔ "المرء یؤخذ باقرارہ" جو عہد کیا گیا یا کرایا گیا ہے، بہرحال اس کی تکمیل کسی نہ کسی حد تک "تَحِلَّةَ لِلْقَسَمِ" ہی کی حد تک اب تو میرے ذمہ عاید ہو ہی گئی، مشاغل کی کثرت، درس وتدریس، تحقیقاتی کاموں کی نگرانی کے ساتھ صدارت شعبہ کے فرائض بھی انجام دینا، کچھ ٹوٹے پھوٹے علمی شغلوں میں بھی الجھے رہنا اور اسی کے ساتھ ایفاء عہد کا

یہ بوجھ، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیسے اٹھاؤں گا، سر حاضر کر دیتا ہوں، گٹھری لاد دیجئے! اٹھ سکے گی تو اٹھا
لوں گا، ورنہ پٹک کر بھاگوں گا، لیکن جس نے عہد کرا دیا ہے، امید ہو کہ وہی قوت بھی عطا کرے گا، فعلی
اللہ توکلتُ والیہ انبتُ والیہ المصیر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۰

(الفرقان بابت شوال ۱۳۶۲ھ ص)

مولانا کی ادارت کا یہ شرف الفرقان کو قریباً ایک سال تک حاصل رہا، اور افتتاحی شذرات بعنوان "فواتح" مولانا ہی لکھتے رہے، اس کے بعد جب میری صحت بحال ہو گئی تو اگرچہ یہ خاص نوعیت باقی نہیں رہی، لیکن اپنے مسلسل مقالات کے ذریعہ میری مدد اور الفرقان کی سرپرستی مولانا مرحوم برابر فرماتے رہے۔

پھر غالباً ۱۳۶۳ھ میں ایسا ہوا کہ میرے اور مولانا کے درمیان ایک مسئلے میں اختلاف رائے ہو گیا، اور میں نے مولانا کو آزردہ کر دیا، میری اور ان کی جو نسبت تھی اور ہمارے باہمی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس کی بنا پر مجھے ہی چاہیے تھا کہ میں مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کرتا، لیکن مجھے اعتراف ہو کہ میں کم ظرف ثابت ہوا اور ممدوح کو راضی کرنے اور منانے کی میں نے کوئی کوشش نہیں کی، یہاں تک کہ کچھ مدت کے بعد خود مولانا مرحوم ہی نے اُلٹا مجھے منایا، سچ ہو "پھل دار درخت ہی جھکتا ہے۔"

اس کے بعد الفرقان کو انھوں نے پھر اسی طرح اپنایا اور اپنی خاص سرپرستی میں لیا ـــ بلاشبہ یہ ان کی بڑی عالی ظرفی تھی۔

قریباً ایک ہزار صفحات :-

الفرقان کی پرانی جلدوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کے اس پہلے مقالہ سے لے کر جو اواخر ۱۳۵۰ھ میں مجدد الف ثانی نمبر" میں شائع ہوا تھا، سلسلہ "ہادم اللذات" کی اس آخری قسط تک جو رجب ۱۳۷۵ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی اور جس کے بعد مرض کے تسلسل نے مولانا کو الفرقان کے لیے کچھ اور نہیں لکھنے دیا۔ یہاں تک کہ اپنے رب کے حضور میں پہونچ گئے۔ قریباً ایک ہزار صفحات خود مولانا مرحوم کے قلم کے لکھے ہوئے الفرقان میں شائع ہوئے ہیں، اور اپنے بعض شاگردوں سے لکھوا کر خود تصحیح اور نظرثانی کر کے جو مضامین انھوں نے الفرقان کو عنایت فرمائے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان کے صفحات کی مجموعی تعداد بھی دو سو سے زیادہ ہے۔

اللہ کی شان! الفرقان کے صفحات میں سب سے آخری سلسلہ انھوں نے "ہادم اللذات" کے عنوان سے شروع فرمایا، گویا موت کے یاد کرنے اور یاد دلانے کو اپنا موضوع بنایا ـــ اس سلسلہ کی پہلی قسط ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی۔ اس کا افتتاحی نوٹ یہ تھا۔

"مشہور حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اکثروا ذکر ھادم اللذات"

(لذتوں کو ڈھا کر رکھ دینے والی یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کیا کرو) سچ پوچھیے تو اسی نبوی وصیت کی تعمیل اس مضمون سے مقصود ہے، ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے، انھیں کا ذکر اس عنوان کے تحت انشاء اللہ کیا جائے گا، موت کے یاد کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہو ——— بڑے بڑے مواعظ اور لچھے دار تقریروں کے مقابلہ میں موت کا ہلکا سا خیال زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہو۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی انگوٹھی میں کہتے ہیں کہ "کفیٰ للمرء بالموت واعظا" (آدمی کے لیے موت کافی واعظ ہو) کے الفاظ کھدے ہوئے تھے ——— انشاء اللہ تعالیٰ ہر مہینے میں الفرقان کے ناظرین کے سامنے یہی زندہ واعظ کھڑا ہوگا ——— سب سے زیادہ یاد رکھنے کی مستحق جو چیز ہے، اسی کو یہ زندہ واعظ آپ کو یاد دلاتا رہے گا۔"

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ سلسلہ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ (م ستمبر ۱۹۵۲ء) سے شروع ہو کر برابر جاری رہا، قریباً دو سال گزرنے پر ۱۳۷۳ھ کے اواخر سے مولانا پر سخت قلبی دوروں کا حملہ شروع ہوا، جس کا سلسلہ قریباً ۶ مہینے جاری رہا، اس زمانہ میں "ہادم اللذات" کے ذکر و تذکیر کا یہ سلسلہ بھی قدرتی طور پر بند رہا، دسمبر ۱۹۵۴ء میں طبیعت کچھ سنبھلی تو مولانا نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اس افاقہ کے بعد جو پہلی قسط اس سلسلہ کی آئی اس کے ابتدائی نوٹ کی چند سطریں یہ تھیں:۔

"چھ مہینے سے زیادہ مدت گزر گئی، "ہادم اللذات" کی کہانیاں سنانے والا اس عرصہ میں خود اسی "ہادم اللذات" کی پرچھائیوں کے نیچے آگیا۔ لیکن بقول اکبر مرحوم

کمزور ہی میری صحت بھی کمزور ہی میری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

کچھ نہیں معلوم کہ مہلت جو ملی ہے اس کی مدت بھی کتنی ہے۔ قل إن الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم ——— مدیر الفرقان کا اصرار ہے کہ

جب تک بس چل سکے ساغر چلے

بحول اللہ وقوته ساغر کو پھر ہاتھ میں اٹھا لیتا ہوں، جو پینا چاہتے ہیں اُن کے لیے صلائے عام ہے۔ انسانی زندگی کے چند لازوال زندہ حقائق جن کا شعور عہد حاضر کے قلوب میں مردہ کیجیے یا نیم مردہ ہو کر رہ گیا ہے، اسی شعور کا جگانا اس جھنجھوڑے سے مقصود ہے۔"

"ہادم اللذات" کی یہ قسط قریباً ۶ مہینے کے ناغہ کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ (م جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مولانا کو صرف دو قسطیں اس سلسلہ کی اور لکھنے کا موقع ملا، ایک ہندوستان کے مشہور مسلمان حکمران شیر شاہ سوری (م ۹۵۲ھ) کے کارنامہ اور اس کی وفات کے متعلق، یہ قسط جمادی الاخریٰ ۱۳۷۴ھ (م فروری ۱۹۵۵ء) میں

شائع ہوئی، اس کا عنوان تھا "ہندوستان کی ایک قدیم جہالۃ الکیم جس نے موت کو بھی زندگی بنا دیا" ــــ دوسری قسط میں اس چودھویں صدی ہجری کے چودھویں سال میں وفات پانے والے ہندوستان کے ایک مشہور عالم اور محدث حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بعض خاص سبق آموز پہلوؤں کا تذکرہ کرکے ان کی وفات کا حال لکھا گیا تھا ــ یہ قسط رجب ۱۳۷۴ھ (م مارچ ۱۹۵۵ء) کے الفرقان میں شائع ہوئی تھی، اس کا عنوان تھا "اسلامی رواداری اور مساوات وبے نفسی کا ایک دل آویز مرقع"۔

یہی اس سلسلہ کی آخری قسط تھی، اس کے بعد خود مولانا پھر "ہادم اللذات" کی پرچھائیوں کے نیچے آگئے، دل کے دوروں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کے بعد مرض نے الفرقان کے لیے کچھ اور لکھنے کا موقع نہ دیا۔ یہاں تک کہ جون ۱۹۵۶ء میں "ہادم اللذات" نے آپ کو ہم دنیا والوں سے الگ کرکے ملاء اعلیٰ میں پہنچا دیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

ان سطروں کے پڑھنے والے اور مولانا مرحوم کے اس مجموعۂ مضامین کا مطالعہ کرنے والے اپنے سب دوستوں سے اس عاجز کی عاجزانہ درخواست ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مولانا مرحوم کی مغفرت اور رفع درجات کے لیے اہتمام کے ساتھ دعا کریں، یہ اُن کا اس عاجز پر بھی بڑا احسان ہوگا، کسی مصنف اور مضمون نگار کی زندگی میں تو کسی کی داد و تحسین بھی تھوڑی دیر کے لیے اس کو خوش کر سکتی ہے۔ اور وہ اس سے کچھ ذائقہ لے سکتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد کام آنے والی چیز صرف دعا ہے، اور اپنے کسی محسن کا سب سے بڑا حق اور احسانمندی و شکر گزاری کا صحیح ترین ایمانی طریقہ یہی ہے کہ اس کے لیے اہتمام سے دعائیں کی جائیں اور بار بار کی جائیں۔

ایک خوشکن اطلاع

معارف الحدیث کی دوسری جلد

(کتاب الرقاق و کتاب الاخلاق)

معارف الحدیث کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد سے شائقین کو اس کی بقیہ جلدوں کا بےچینی سے انتظار ہو۔ الحمد للہ اس کی دوسری جلد پریس میں اس وقت تیاری کے آخری مرحلہ میں ہے۔

اِن شاء اللہ اس مہینے کے آخر تک وہ تیار ہو کر شائقین کو روانہ کی جاسکے گی۔

مؤلف کے خیال میں اُن حدیثوں کے بعد جن کا تعلق ایمان اور آخرت سے ہو، دینی و روحانی تربیت اور تعمیر سیرت میں سب سے زیادہ مؤثر وہ حدیثیں ہوتی ہیں جن کو حضرات محدثین کتاب الرقاق اور ابواب اخلاق میں درج کرتے ہیں۔ اس لیے مؤلف نے اس دوسری جلد میں ان ہی حدیثوں کو مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

پہلی جلد میں ایمان اور آخرت سے متعلق ۱۸۹ حدیثوں کی شرح ہوئی تھی، ____ اس دوسری جلد میں سلسلۂ رقاق کی ایک سو اور سلسلۂ اخلاق کی قریباً ایک سو ستر حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے۔

احادیث رقاق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں اور آپ کے وہ خطبات و مواعظ ہیں جن کے پڑھنے اور سننے سے دلوں میں رقت اور خشیت پیدا ہوتی ہے اور آدمی کو معلوم ہوتا ہو کہ اس دنیا میں اس کو کس طرح رہنا چاہیے اور یہاں اس کا نصب العین کیا ہونا چاہیے۔

پوری کتاب میں مؤلف کے پیش نظر بطور نصب العین کے دو چیزیں رہی ہیں ____ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات اُن کے اول مخاطبین صحابۂ کرام پر پڑتے تھے، ان کا کوئی ذرہ آج بھی ان حدیثوں کے پڑھنے والوں اور مطالعہ کرنے والوں کو نصیب ہو ____ اور دوسرے یہ کہ اپنی حقیقت اور اپنے انجام کو بھولی ہوئی اور حیوانیت اور مادہ پرستی میں ڈوبی ہوئی بیسویں صدی کی اس دنیا کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ روحانی اور اخلاقی تعلیم سادہ طریقہ سے اور اپنے اصلی رنگ میں پیش کر دی جائے جس کی پیروی میں اس کی نجات و فلاح کی ضمانت اور اس کی ساری مشکلوں کا حل ہے۔

شروع میں مؤلف کے دیباچہ کے علاوہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک بصیرت افروز ایمان آفریں مقدمہ ہے، ضخامت ۴۲۸ صفحات، کتابت و طباعت معیاری اور شائق، کاغذ اعلیٰ، قیمت غیر مجلد سوا چار روپے، مجلد سوا پانچ روپے۔

ناظم کتب خانۂ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

اپنے لیے حدیث و تفسیر کی کوئی کتاب منتخب کیجئے

اردو زبان میں حدیث و تفسیر کا پورا کتب خانہ

ذیل میں جن کتابوں کے نام اور قیمتیں لکھی جا رہی ہیں ان کے متعلق ضروری تعارف اس نمبر کے آخر میں لگی ہوئی کتب خانہ کی فہرست سے حاصل کیجئے!

صحیح بخاری شریف کامل (اردو) ۳ جلدوں میں ۵۰۰۰ صحیح ترین حدیثوں کا مجموعہ، قیمت -/۳۲ روپے

جامع ترمذی کامل (اردو) قریباً چار ہزار حدیثوں کا مجموعہ، ساتھ ہی ہر باب میں ائمہ کے مذاہب کا مفصل بیان، دو جلدیں مجلد قیمت -/۱۶

مشکوٰۃ شریف مکمل (اردو) چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا بیش بہا ذخیرہ دو جلدوں میں، قیمت مجلد -/۱۶

ترجمہ موطا امام مالک (مع اصل عربی متن) حدیث کی سب سے پہلی کتاب جسے امام مالکؒ نے مرتب فرمایا تھا، قیمت مجلد -/۱۲

ترجمہ مشارق الانوار، بخاری و مسلم کی منتخب ۲۲۰۰ حدیثوں کا گراں قدر مجموعہ، قیمت مجلد -/۱۴

حصن حصین (مع اردو ترجمہ و تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا یہ سب سے زیادہ جامع اور مکمل مجموعہ ہے، اس کے پڑھنے سے اللہ کی رحمت اور نصرت کے دروازے کھلتے ہیں، خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے قیمت مجلد -/۸

ترجمہ کتاب الصلوٰۃ نماز کے باب میں امام احمد بن حنبلؒ کی بے نظیر اور نہایت مؤثر کتاب ہے، قیمت مجلد -/۸/-/۱

حجۃ اللہ البالغہ (از شاہ ولی اللہؒ)

اس بے نظیر کتاب کے ۲ دو اردو ترجمے پہلے بھی شائع ہوئے ہیں، لیکن یہ ترجمہ جو حضرت مولانا عبد الحق صاحب دہلوی (صاحب تفسیر حقانی) کا کیا ہوا ہے، ہر حیثیت سے پہلے سب ترجموں سے بہتر ہے، اصل عربی متن بھی ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ دو جلدیں مجلد قیمت -/۲۰

تفسیر ابن کثیر کامل (اردو)

تفسیر ابن کثیر عربی تفاسیر میں بھی بے نظیر اور مستند ترین تفسیر مانی جاتی ہے، صحابہ و تابعین اور ائمہ مفسرین کے تفسیری ارشادات کا مستند حصہ اس میں محفوظ ہے۔ اس کا یہ اردو ترجمہ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔ جلدیں خوشنما ہیں۔ قیمت کامل -/۵۵

تفسیر بیان القرآن کامل (۱۲ حصہ) حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی مقبول و بے نظیر تفسیر طبع ہند، قیمت کامل -/۶۰

خاص رعایت تاجران کتب کو ان سب کتابوں پر ۲۰ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

تاجران کتب کے علاوہ جو عام خریدار صاحبان ان کتابوں میں کم از کم -/۲۵ کی کتابیں ہم سے طلب کریں گے ان کو محصول چھوڑ دیا جائے گا۔ (یہ رعایت صرف ہندوستان کے خریدار حضرات کو صرف ان ہی کتابوں پر دی جائے گی)

ناظم کتب خانۂ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

افادات

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ ــــ (تلخیص و تبصرہ)

(۲) حج کیا ہے؟

(۳) دجالی فتنہ اور سورۂ کہف

(۴) وفاشعاری کے دو نادر نمونے

الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ

(از افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

تلخیص و تبصرہ ــــــــــــ ← از جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی

بلاشبہ حضرت مولانا گیلانی برد اللہ مضجعہٗ ــ رئیس التحریر اور سلطان القلم تھے ــــــ وہ کیا بلحاظ تصنیف اور کیا بحیثیت تالیف و تدوین اور کیا از روئے مقالہ نگاری ایک کامیاب اور بلند پایہ محقق و مبصر تھے ـــ وہ پی، ایچ، ڈی نہ تھے لیکن اس راہ کے کتنے اُمیدواروں کو انھوں نے کامیاب بنایا ہے اور ایسی شاہراہِ قائم فرمادی ہے کہ میدان تحقیق میں ایک ذہین طالب علم بآسانی گامزنی کرسکے اور اسلاف کی کتابوں، تاریخوں اور تذکروں کے بحر ذخارے علم و حکمت کے موتی نکال سکے۔ سچ پوچھئے تو پی، ایچ، ڈی بننا آسان ہے ــ مناظر احسن بننا مشکل۔ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہو چمن میں دیدہ ور پیدا

بقول سید سلیمان ندویؒ۔ "ہمارے پی، ایچ، ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں اور ساری عمر اُسی کو چومتے چاٹتے رہتے ہیں" ـــــــ علامہ گیلانیؒ نے بلا مبالغہ سیکڑوں مقالے لکھے اور ان میں اپنی خداداد بصیرت اور علمی و فنی کاوش کا پورا پورا ثبوت دیا۔ ان کے خون جگر کی گلکاریوں سے چمن علم و تحقیق میں تازہ بہاریں آگئیں ـــــــ وہ جدید و قدیم دونوں روشوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پائی اور معلمی جدید زاویہ نگاہ رکھنے والوں میں کی۔ وہ دونوں وادیوں کے پیچ و خم سے آگاہ تھے۔ ان کی تحقیق سے ایک طرف قدیم طرز کے طلباء کو تسکین ہوتی تھی، دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات اطمینان

حاصل کرتے تھے ـــــــ ان کے وجد انگیز قلم کے جتنے نمونے ہیں بہترین شاہکار کہلانے کے مستحق ہیں ـــ اُن کی اُردو نثر اُن کے صاحبِ طرز انشا نگار ہونے کا پتہ دیتی ہے اُن کی زبان قلعۂ معلی، دار العلوم دیوبند، عثمانیہ یونیورسٹی اور صوبہ بہار کے علمی گھرانوں کی ملی جلی خصوصیات کی آئینہ دار تھی ــــ اُن کی تحریر میں فصاحت وبلاغت، سلاست و روانی جدید و قدیم علمی اصطلاحیں۔ جذب وکیف، جوش وخروش پیغام وطنز سب ہی کچھ موجود تھے۔ اُن کا کلام دماغ سے زیادہ دل سے اپیل کرتا تھا ان کے اکثر و بیشتر جملے الہامی ہوتے تھے ـ عبرت اور سبق حاصل کرنے والوں کے لیے ان کے یہاں بہت سی کام کی باتیں لمبی لمبی تحریروں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ اُن کے سوز وغم میں نشاط اخروی کی جھلک ہوگا۔ اور ان کے دل کی دھڑکن فلاحِ دارین کی منزل پر پہونچانے کے لیے جرسِ کارواں کا کام دیتی ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں ان کی ایک تقریر دار الحدیث دیوبند میں سنی تھی اس کی لذت آج تک دل ودماغ پر حاوی ہے دو ایک جگہ ان کے خطوط دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ان میں بھی عجیب لطفِ سخن پنہاں ہے ــــــ مرحوم نے جذبات وتحقیق کی آمیزش سے اپنی تحریروں میں ایک خاص رنگ بھر دیا تھا ــــ القاسم دیوبند میں ان کے مضامین پڑھ کر مجھے ان سے پہلا تعارف حاصل ہوا تھا۔ پھر ان کی کتاب النبی الخاتم دیکھی جس میں مکی زندگی اور مدنی زندگی کے پرکیف نظارے دکھائے گئے ہیں۔ اس میں محبت رسول ہے کہ ابل رہی ہے جذبات عقیدت کا سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے ـــ اللہ اکبر کتنی کیف آور کوثریں تحریر ہے کہ ناظرین وسامعین کے قلوب کو غرقِ موجِ کوثر کر دیتی ہے۔ الدین القیم۔ نظام تعلیم وتربیت اور سوانح قاسمی کا بھی مطالعہ کیا سب نے متاثر کیا اور سب اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں ـــــ لیکن سب سے زیادہ ان کی شخصیت سے تفصیلی تعارف ان دو مقالوں سے ہوا جو الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے لکھے گئے تھے ــــ اس وقت میں بریلی میں موجود تھا ــــ مجدد الف ثانی نمبر والا مضمون الفرقان کے لیے پہلا مقالہ تھا جو ۱۳۵۷ھ میں آیا۔ بس یہ "ابتدائے عشق" تھی جس کے آگے سب نے دیکھا کہ بہار کے "مجذوب محقق" نے دامن الفرقان میں جذبات وتحقیقات کے کیسے کیسے موتی برسائے ـــــ غالباً ۱۳۷۵ھ تک سترہ اٹھارہ سال ان کے مضامین کی سلسلہ جنبانی رہی ـــ یوں سمجھئے گویا مولانا گیلانی الفرقان کی مجلس ادارت کے بھی ایک اعلیٰ رکن تھے ـــــ ہائے مولانا گیلانی، خدا اُن کو بخشے ـــ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ـــ اب اُن جیسا "حریفِ مے مرد افگن عشق" بن کر میخانہ راز ونیاز میں کون آئے گا؟ ع

دگر دانائے راز آید نہ آید

اب ہم ان کی تازہ تحریر کی ایک سطر بھی نہ پڑھ سکیں گے ــــ بیشک خزاں کے دور میں جب بوئے گل سے محرومی ہوجاتی ہے تو عرقِ گلاب ہی کی جستجو ہوتی ہے اسی لئے ادارۂ الفرقان نے سوچا اور بہت اچھا سوچا کہ الفرقان میں شائع شدہ مضامینِ گیلانیؒ کا "عطر مجموعہ" نکال لیا جائے ــــــ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر لکھے ہوئے ان کے مقالے کی تلخیص اور اس پر تبصرہ کروں ــــــ یہ کام بھی کوئی معمولی کام نہیں کہ مجھ جیسا "نا آشنائے لذت پرواز" انجام دے لیکن میاں عتیق الرحمٰن سنبھلی کی فرمائش پر جیسا کچھ بھی انجام دے سکا ہوں پیش کر رہا ہوں اور روحِ گیلانیؒ سے شرمندہ ہوں کہ اس بادشاہ فصاحت و بلاغت کا اس کی شایان شان اعلیٰ پیمانے پر کوئی علمی تعارف نہ کرا سکا ــــــ

سب سے پہلے بطور تمہید و مقدمہ چند باتیں عرض کروں پھر دائرہ موضوع میں آؤں گا۔

(۱) اکبری فتنہ جو دین الٰہی کے نام سے برپا ہوا تھا درحقیقت ایک خطرناک فتنہ تھا اگر بروقت اس کی خبر گیری نہ ہوتی تو اسلام کا دیوالہ نکل جاتا ــــــ یہ درحقیقت ع

ایک سازش تھی فقط مذہب و ملت کے خلاف

بظاہر اسباب سلطنت مضبوط کرنے کا اچھا طریقہ ہاتھ آیا تھا لیکن سرمایۂ ملت کو برباد کر کے سلطنت کو مضبوط کیا جا رہا تھا ــــــ اور بابر کا پوتا اپنے ہاتھوں اس شجر بار آور کو کاٹ رہا تھا جس کے سایے میں دین و دنیا دونوں کی کیاریاں پرورش پاتی ہیں ــــــ الحاد و زندقہ کی انتہا ہو چکی تھی سب مذہبوں کا "عرقِ مرکب" نکالنے کا خیال تھا لیکن ہوا یہ کہ سب سے زیادہ مخالفانہ زد اسلام پر پڑی اس دین الٰہی کا ذکر جدید و قدیم مورخین نے کیا ہے لیکن اس کے زہریلے نتائج پر بدایونیؒ سے زیادہ کسی کی نظر نہ تھی بدایونیؒ کے بعد گیلانیؒ نے اس تفصیل کے ساتھ ان نتائج کو پیش کیا کہ بدایونی بھی ہوتے تو اُن کو داد دیتے۔

(۲) ابو الفضل اور فیضی یہ دونوں بھائی دربار اکبری پر چھائے ہوئے تھے ان میں اوّل الذکر میر منشی اور اعلیٰ منصب دار تھا، دوسرا ملک الشعراء اور معلم شاہزادگان ــــــ علوم عقلیہ کا دونوں پر پورا پورا اثر تھا۔ نقلی علوم سے بہرہ وری نہ تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے عقائد بھی تباہ کرنے کی کوشش کی اور ایسی اسکیم دربار اکبری میں تیار کی جس سے اسلام کا نام و نشان ہی مٹ جائے ــــ سچ پوچھئے تو دین الٰہی کے کنوینر دونوں بھائی ہی تھے ــــــ ناخواندہ اکبر پر ان دونوں نے اپنا سکہ جما لیا تھا ــــــ مورخین حال، ابو الفضل کے قتل کی وجہ لکھتے تو ہیں، لیکن ایک وہ خاص وجہ جس کو خود جہانگیر نے اپنے قلم سے تزک میں لکھا ہے چھوڑ جاتے ہیں۔ اور تماشے کی بات ہے کہ طبع کراتے وقت تزک جہانگیری کے ایڈٹ کرنے والے ایک ریفارمر قسم کے بزرگ نے نہ معلوم کس مصلحت سے اس حصے کو حذف کر دیا ہے وہ تو یہ کہیے کہ مجھے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے کتب خانے سے مستعار آیا

ہوا ایک قدیم قلمی تزک کا نسخہ دفتر الفرقان میں مطالعہ کرنے کے لیے مل گیا تھا اور یہ بات میں نے اسی وقت اپنے دل میں نوٹ کر لی تھی۔ اس وقت قلمی تزک تو میرے سامنے نہیں ہے ۔ تذکرہ[1] فاتحان ملک ہند قلمی سے تزک کا مضمون نقل کرتا ہوں ممکن ہے الفاظ میں کچھ تفاوت ہو لیکن مفہوم بالکل وہی ہے ۔

در کتابے کہ بروا قعات خود برنگاشتہ و تزک جہانگیری	جہانگیر نے اپنی خود نوشت تزک میں لکھا ہے کہ میں ابو الفضل
نام داشت می نگارد کہ از ابو الفضل ، دگرداں بودم	سے اس وجہ سے ناراض تھا کہ اس نے میرے باپ
از انکہ در پیرانہ سالی پدرم را از راہ مستقیم بعد داشتہ ۔	(اکبر) کو بڑھاپے میں راہ مستقیم سے ہٹادیا تھا۔

اسی تذکرۂ فاتحان ہند سے تفصیل سنیے جو اکثر و بیشتر تزک ہی سے ماخوذ ہے۔

زمانیکہ شہریار ۔ چراغ پگاہی بود از شاہزادہ	جس زمانے میں اکبر بادشاہ چراغ سحری تھا شاہزادہ
مرزا سلیم شکررنجی کشید	سلیم (جہانگیر) سے اس کی ناچاقی ہوگئی ۔

ناچاقی زیادہ بڑھی تو اکبر نے ابو الفضل کو دکن سے مشورہ کے لیے بلایا وہ وہاں مع اہل وعیال اقامت گزیں تھا ابو الفضل نے جلدی میں اپنے اہالی موالی وہیں چھوڑے اور خود یکہ وتنہا چل پڑا۔

جہانگیر کو جو بچند وجوہ اس سے رنجیدہ تھا ــــــ اچھا موقع ہاتھ آیا ــــــ قتل کرانے کا منصوبہ گانٹھ لیا۔ وہ وجوہ کیا تھیں ؟ ــــــ سنیئے ۔

یکے آنکہ بدکیش بود	اوّل یہ کہ ابو الفضل بدمذہب تھا
دوم آنکہ خسرو را در پیرانہ سالی	دوسری وجہ تھی کہ ابو الفضل نے اکبر کو بڑھاپے میں یہ
بر آئینے آورد کہ بگفت قرآن	پٹی پڑھادی تھی کہ قرآن عظیم کلام ربانی نہیں ہو
نہ کلام ربّانی است از زبان رسول ایزد یست	بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے (نعوذباللہ)

پھر کیا ہوا ـــ ابو الفضل گوالیار کے راستے سے آرہا تھا رانا مالدیو سے جو جہانگیر کا خُسر تھا سازش کر کے قتل کروادیا ــــــ خود جہانگیر نے تاریخ قتل ابو الفضل یہ نکالی۔

تیغ اعجاز جناب آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم سر باغی برید	تیغ اعجاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر باغی کاٹ دیا۔

باغی کا سر یعنی پہلا حرف (ب) کاٹ کر اچھی خاصی تاریخ نکل آتی ہے۔

یہ خدا کی طرف سے بات تھی کہ وہ جہانگیر جو ایام شاہزادگی میں کیا اپنی سلطنت کے کئی برسوں میں بھی مذہبی حیثیت سے کمزور تھا اُس جہانگیر کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ وہ اس

---

[1] اس قلمی نسخے میں مولف کا نام درج نہیں ہے۔ مجھے مولوی محمود احمد صاحب عباسی مورخ امروہہ نے یہ نسخہ عنایت فرمایا ہے۔

روح فرسا الحاد و زندقہ کو برداشت نہ کر سکا اگرچہ حصول سلطنت کی خواہش بھی ملی ہوئی ہو لیکن قتل ابوالفضل کی نمایاں وجہ اس کا الحاد ہے ــــــ یہ بھی اعجاز رسولؐ ہی کا صدقہ ہے کہ اس بڑے سبب کو بربنائے مصلحت مٹانے اور چھپانے کے باوجود تاریخ نے اس حقیقت کو اپنے اندر محفوظ رکھا ــــ آج بھی بعض "نگارخانوں" میں نام نہاد "زریں نگار" ادیب اس قسم کے راگ الاپتے رہتے ہیں۔ مولانا گیلانیؒ کی زندگی میں اُن کو یہ لکھ دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے کہ حضرت یہ زریں نگاری جو آج بعض الحاد پسندوں کے قلم سے ادا ہو رہی ہے نئی اپج نہیں ہے یہ بھی ابوالفضل کی جھنجھوڑی ہوئی ہڈی ہے۔

حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات (مرتبہ عبیداللہ) کے مکتوب نمبر۲۲ میں لکھا ہے۔ کہ۔ ابوالفضل یا فیضی دونوں بھائیوں میں سے ایک بات کہا کرتا تھا

دنیا نقد است و آخرت نسیہ	دنیا نقد ہے اور آخرت اُدھار کوئی بھی نقد کو
ہیچکس نقد را بنسیہ نفروختہ است	اُدھار کی امید میں ہاتھ سے نہیں دیتا ہے۔

(نعوذ باللہ)

(۳) ملا عبدالقادر بدایونی ــــ عہد اکبری کا مشہور مورخ ہے۔ منتخب التواریخ اس کی معرکۃ الآرا تاریخ ہے جس سے دور اکبری کا پورا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے ــ ملا بدایونی گھر کے بھیدی ہیں۔ اکبر کے دورِ صلاحیت میں اس کے امام رہ چکے ہیں۔ صوفی مزاج اور راست باز ہیں ــ علماء سے تحصیل کے لیے چکر لگاتے رہیں۔ خانقاہوں میں اہل اللہ سے جاجا کر ملتے ہیں۔ سید محمد میر عدل امروہیؒ سے بھی ان کا ربط ہے وہی میر عدل جنہوں نے دربار اکبری کے علماء سوء پر ایک غلط بات سے غصہ ہو کر اپنا عصا اٹھایا تھا ــــ میرا مقصد یہ ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی ایک ثقہ مورخ ہے آج تک اس کی کوئی تاریخی بددیانتی ثابت نہیں کی جا سکی ہے۔ اس کے بیانات میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کسی معتبر تحریر میں یہ بات تھی کہ جہانگیری دور تک منتخب التواریخ اپنی صاف گوئی کی وجہ سے ممنوع الاشاعۃ رہی۔ بعد کو جب اثرات مجدد الف ثانیؒ آشکارا ہوئے تو یہ کتاب بھی عام طور پر سامنے آئی ــــ مولانا گیلانیؒ نے اپنے مجدد نمبر والے مضمون میں اس تاریخ سے بہت کام لیا ہے اور بڑی عجیب ترتیب سے تمام واقعات کو یکجا کر دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گیلانیؒ کی روح، ملا عبدالقادر بدایونی کی روح سے ہم آہنگ ہو کر یہ مقالہ مرتب کر رہی ہے مولانا گیلانیؒ نے جس خاص ترتیب کے ساتھ واقعات جمع کر دیے ہیں بدایونی اس ترتیب کے ساتھ کسی وقتی مصلحت سے مجبور ہو کر پیش نہ کر سکے تھے ــــ چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو اس طرح منظم کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مولانا گیلانیؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"خود ملا عبدالقادر جن کی کتاب سے میں نے ان واقعات کا انتخاب کیا ہے بندہ خدا نے نہ جانے کس مصلحت سے ان کو تقریباً چار سو صفحات میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ پراگندہ صورت میں قلم بند کیا ہے۔ ترتیب میں مجھے کافی دقت اٹھانی پڑی تاہم ایک کام ہو گیا۔"

ملا عبدالقادر کی مصلحت کو ان کی دل کی آواز کو اور ان کے پیش کردہ نقشہ حال کو اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ـــــ بعد کے مورخین و محققین نے شاید اتنا نہ سمجھا ہوگا جتنا حضرت گیلانیؒ نے سمجھ لیا ہے ـــــ نتائج جو ملا عبدالقادر بدایونی برنبائے مصلحت نہ نکال سکتے تھے مولانا گیلانیؒ نے ان نتائج کو اس طرح برآمد کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے علمی حلقوں میں اس مقالے کی بڑی دھوم مچ گئی تھی اور جوں جوں زمانہ گزر رہا ہے اس کے مندرجہ حقائق اور زیادہ دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔

(۴) اکبر کے متعلق اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ ایک ناخواندہ مگر منتظم، بہادر اور عقل و دنیا دہی کا مالک تھا پچاس سال اس نے سلطنت کی اس کے حدود سلطنت بھی کافی وسیع تھے ـــــ داخلی و خارجی اثرات سے متاثر ہو کر اور متعدد اسباب کی بنا پر اس کو دین الہیٰ کے قیام کی سوجھی تھی دین الہیٰ قائم کر کے اس نے جو کچھ کیا وہ مولانا گیلانیؒ کے قلم نے خوب ہی واضح کر دیا ہے ـــــ بعض بزرگوںؒ نے فرمایا ہے کہ اکبر نے انتقال کے وقت توبہ کر لی تھی مگر اس کا مکمل ثبوت درکار ہے ـــــ دل ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش کسی طرح یہ بات صحیح ہو جائے کہ اکبر بادشاہ دنیا سے بسلامتی ایمان رخصت ہوا۔ مگر واقعات و حقائق کا کیا کیا جائے؟ یوں تو وہ بعد مرگ عرش آشیانی کے لقب سے ملقب ہو ہی گیے تھے خود عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ نے جن کا دیندار ہونا اظہر من الشمس ہے اپنے رقعات میں دو ایک جگہ اس لقب سے اکبر کو یاد کیا ہے ـــــ مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ پہلے کیا تھا پھر کیا بنا اور آخر تک کیا رہا۔ اسلام کو اس کے ہاتھوں کیا کیا صدمات پہونچے اور کیا کیا پہونچ سکتے تھے اگر فضل ایزدی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حمایت آڑے نہ آتی ـــــ

(۵) حضرت مجدد الف ثانیؒ مشہور عالم شخصیت ہے، ہزارۂ دوم میں جو فتنہ بڑے طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ شاہی نگرانی میں، بڑے بڑے فلسفیوں کو حمایتی بنا کر نمودار ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹانے کے لیے ایک زبردست روحانی طاقت دے کر مجدد کی حیثیت سے آپ کو کھڑا کر دیا ـــــ بقول محقق گیلانیؒ اس دور کی خصوصیت کے پیش نظر ہی آپ کو مجدد الف ثانیؒ کہا جاتا ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا اس کو خبردار

چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں ـــــ اکبری دور کی تاریخ ملا عبدالقادر کی مدد از مولانا گیلانیؒ

کی ترتیب سے مرتب ہو تو مجدد صاحبؒ کے کارنامے روشن ہوں۔ ایک فقیر بے نوا سرہند کی خانقاہ کے ایک گوشے میں بوریے پر بیٹھ کر جو انقلاب عظیم۔ "اکبر اعظم" کی تحریک کے مقابلے میں، برپا کرتا ہے اس کی اہمیت معلوم نہیں ہو سکتی جب تک مولانا گیلانیؒ کا الہام خیز اور معارف ریز قلم ایک کامیاب مقالہ نہ لکھے۔

چلتے چلتے ایک بات اور بتادوں کہ مولانا گیلانیؒ کے نزدیک فتنۂ دین الٰہی کے حسب ذیل اسباب تھے۔

(۱) حکومت (۲) علماء سو (۳) دربار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باریافتوں اور شرف صحبت کے سعادت مندوں کی تحقیر کرنے والی جماعت (۴) صوفیاء خام۔

ان میں سے دو اوّل الذکر اسباب پر اس مقالے میں بحث کی ہے اور ربیع الآخر سنہ ۵۸ھ کے الفرقان میں تیسرے سبب کے متعلق یہ لکھ کر کہ ہمارے دوست مولانا نعمانی غالباً الفرقان میں سبب ثالث کے متعلق کافی بحث فرما چکے ہیں۔ کچھ نہیں لکھا۔ البتہ چوتھے سبب پر خوب دل کھول کر لکھا ہو — میں عدم گنجائش کے باعث اس دوسری قسط کا خلاصہ اور اس کے متعلق تبصرہ نہ کروں گا — صرف مجدد الف ثانی نمبر والے مقالے پر جو ۴۵ صفحات پر مشتمل ہے یہ چند صفحات لکھے ہیں۔ اور یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ناظرین کے دل و دماغ میں وہ بات بطور خلاصہ جاگزیں ہو جائے جس کو مولانا گیلانیؒ چاہتے ہیں کہ دل و دماغ میں جاگزیں ہو — خاص ترتیب کے ساتھ ان کی عنبریں تحریر کے خاص خاص نمونے بھی پیش کروں گا۔

اب میں کیوں زیادہ حائل رہوں آیئے مولانا گیلانیؒ کے افادات سے براہ راست مستفیض ہو جیئے —

بعد حمد و صلوٰۃ مقالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"وحدت وجود اور وحدت شہود کی فنی نکتہ نوازیوں یا شریعت و طریقت کی ملایانہ و صوفیانہ معرکہ آرائیوں کے ہنگاموں میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعی اور حقیقی کارنامے کچھ اس طرح رل مل گئے کہ آج حضرت شیخ قدس سرہٗ العزیز کو مجدد الف ثانی کہنا بجز ایک روایتی خوش اعتقادی کے اظہار اور کسی امر مبہم پر مبنی نہیں معلوم ہوتا — مشہور کر دیا گیا ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرتؒ کو اس خطاب سے کسی خاص وقت میں مخاطب کیا تھا اور اسی خطاب خاص نے رفتہ رفتہ عام صورت اختیار کر لی لیکن کیا حضرت کا مجدد الف ثانیؒ ہونا محض ملا عبدالحکیم کے ایک خاص خطاب و تلقیب ہی کا نتیجہ ہے؟"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"شاید غور نہیں کیا گیا۔ خصوصاً ہمارے علماء اور صوفیاء نے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب دیکھنا چاہا تو اس ماحول سے جدا کر کے دیکھا جس میں آپ کا وجود مسعود قدرت کی جانب سے سرزمین ہند

کو عطا کیا گیا تھا"

بعدہٗ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے کہ "انھوں نے اپنی تقریر میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا وجہ تھی کہ مغل حکومت کے تخت پر چار بادشاہ مسلسل ایسے بیٹھے کہ ان میں دو پہلوں کو دو پہلوں سے کوئی تعلق نہ تھا؟ شاہ جہاں اور عالمگیر کا، جہانگیر اور اکبر سے مقابلہ کر کے دیکھیے دونوں میں کوئی مناسبت ہے"؟ ——— پھر لکھتے ہیں کہ:-

"نواب علامہ کا یہ سوال جو فلسفۂ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے یقیناً ایک عجیب سوال تھا اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ سب سے پہلے اس اہم سوال کے جواب کا علم مجھے آپ ہی کی زبان سے ہوا اور در اصل اسی مجمل جواب کی آج کچھ تفصیل اس حد تک لیکن چاہتا ہوں جس حد تک کسی مجلاتی مقالہ میں گنجائش ہو سکتی ہے"

اس کے بعد سیر المتاخرین کی ایک فارسی عبارت پیش کر کے ——— جس میں دین الٰہی کا ذکر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آسائش خلق اس دین میں تھی، عہد شاہجہاں میں تعصب شروع ہوا اور عہد عالمگیر میں تعصب شدت پذیر ہو گیا ——— یوں رقمطراز ہوتے ہیں:-

"آج اسی مشاغبہ (پروپیگنڈا) کا نتیجہ ہے کہ عالمگیر اور مذہبی تعصب تقریباً دو مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ مشکل ہی سے اب کوئی تعصب کے لفظ کا تخیل اس طرح کر سکتا ہے کہ بے ساختہ اس کے ساتھ عالمگیر کی صورت بھی دماغ میں نہ کھنچ جائے۔ یہ سب کچھ کیا گیا اور اس اجمال کی تفصیل میں معلومات کے دریا بہا دیے گئے مجلدات شایع کیے گیے اور کیے جا رہے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے باایں ہمہ ذوق بسط و تفصیل، دعویٰ کے دو پہلوؤں سے ایسی لاپرواہی برتی گئی کہ آج جب "ہسٹری کے شگوفوں" میں رگ گل پر بھی نشتر زنی سے نہیں چوکا جاتا۔ یہ دونوں پہلو غنچۂ دہن بستہ کی شکل میں چھوٹ گئے یا قصداً چھوڑ دیے گئے .... آج جب چیونٹی کی آنکھوں کے پردے گنے جاتے ہیں اور مکڑی کے جال کے تانوں کی بھی رپورٹ مرتب کی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایک ہی دعویٰ کے ایک پہلو کو تو آنا روشن کیا جاتا ہے اور اس زور سے اس کا نرسنگھا پھونکا جاتا ہے کہ آنکھیں چیخ اٹھتی ہیں اور کان انگلیوں کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں ـــ لیکن اسی دعویٰ کے دوسرے اجزاء کو آنی کس مپرسی میں ڈال دیا جاتا ہو۔ کہ گویا علم و تحقیق کے وہ سزاوار ہی نہ تھے .... پوری تفصیل کے ساتھ بتانا چاہیئے تھا کہ الٰہی مذہب کی حقیقت کیا تھی ـــ "خلق" جو آسائش میں تھی تاریخی حیثیت سے اس کی تحقیق کرنی چاہیئے کہ "خلق" کے تحت میں کون کون سی جماعتیں داخل تھیں اُن کی آسائش کی نوعیت کیا تھی اور آخر میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد سے اس میں کیوں تبدیلی ہوئی اور کن موثرات کے

زیر اثر عالمگیر تک پہونچ کر اس نے شدت کی شکل اختیار کی۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ مورخین نے بالکلیہ ان اجزاء سے بحث نہیں کی ہو بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان میں بعض جز تو ایسے ہیں مثلاً آخری سوال ؛ اس کو تو آج تک کسی کتاب میں اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اسی طرح خلق وہ آسائش بود کو بھی مجمل ہی رکھا گیا کسی نے نہیں بتایا کہ اس سے مراد خدا کی کونسی مخلوق ہے؟ البتہ الہٰی مذہب کا تھوڑا بہت ذکر ان کتابوں میں ضرور کیا جاتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ جس رنگ میں کیا جاتا ہے اس سے بجائے علم کے شاید جہالت ہی میں زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ آخر دین اکبری کے متعلق جو مشہور کیا گیا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک صلح کل مسلک تھا اس میں تمام ادیان و مذاہب کو ایک نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کسی مذہب والے کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں دی جاتی تھی لیکن کیا یہ واقعہ ہو؟ جب واقعہ کا ذکر کیا جائیگا اسوقت معلوم ہوگا کہ واقعہ کیا تھا؟ اور اس کو کس رنگ میں پیش کیا گیا اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ الف ثانی کے کلام کی حقیقت بھی معلوم ہوگی؛

پھر دین الٰہی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"عہد کمپنی سے پیشتر کی کتابوں میں بھی اگر ڈھونڈا جائے تو اس مسلک کے مختلف عناصر اور اجزاء کا سراغ مل سکتا ہے لیکن بنظر احتیاط میں نے صرف یہ ارادہ کیا ہے کہ اکبری دربار کے سب سے زیادہ ثقہ راوی ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب منتخب التواریخ پر ہی کفایت کروں کیونکہ یہی ایک ایسا بیان ہمارے سامنے ہے جو حلفی شہادت کے بعد ادا کیا گیا ہے .... کلی طور پر ان کے جزئی بیانات کی تصدیق میں خود حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بھی انشاء اللہ تعالیٰ پیش کی جائے گی۔ کیا اس کے بعد بھی شک کے لیے کوئی راہ ہو سکتی ہے؟"

اب مولانا گیلانیؒ واقعات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے وہ محضر نامہ پیش کرتے ہیں جس میں بادشاہ کو مجتہد قرار دیا گیا ہے ـــ پھر لکھتے ہیں :۔

یہ تھی وہ پہلی منزل جہاں تقلید سے کنارہ کش ہو کر اکبر کو اجتہاد کے درجے پر پہونچایا گیا ـــ لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ وہی جو ہمیشہ اس کے بعد ہوا ہے ـــ تھوڑے دنوں کے بعد علانیہ ائمہ و مجتہدین کی توہین و تحقیر ہونے لگی ـــ دین کا بھرم اٹھ گیا۔ ملا صاحب اپنے کانوں سنی بیان فرماتے ہیں کہ ابوالفضل کی جرأت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ

"اگر کسی بحث مباحثے کے درمیان ائمہ مجتہدین کی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کے جواب میں کہتا فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز اور فلاں چمڑے والے کے قول سے تم مجھ پر حجت قائم کرتے ہو؛"

ملا صاحب کے بیانات سے یہ دکھا کر کہ اس کے بعد صحابہ کرام کی توہین تک نوبت پہونچی اور آخر کار براہ راست اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخیاں ہونے لگیں ——— لکھتے ہیں :-

"آج یورپ کے کمان سے جن تیروں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اب برس رہے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ آج سے تین سو برس پیشتر بھی ہو چکا تھا آخری کیفیت اکبر کے نفس کی یہ ہوئی کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ملا صاحب کا بیان ہے ——— فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ابتدا میں بات کتنی ہوتی ہے آخر کہاں تک بجا کر ختم ہوتی ہے۔ ——— (کہ) "احمد، محمد، مصطفےٰ وغیرہ نام".... کی خاطر اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے اس شخص (اکبر) پر گراں گذرنے لگے آخر کچھ دن کے بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے ہے اور غالباً یہی وجہ ہے جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ اکبری عہد کے مصنفین خطبۂ کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھنے سے گریز کرنے لگے .... یہاں تک کہ خود ملا صاحب کو جب مہابھارت کے ترجمے کے شروع میں خطبہ لکھنے کی فرمائش بادشاہ نے کی تو محض اس وجہ سے انھوں نے اعراض کیا کہ بغیر نعت وہ خطبہ لکھنا نہیں چاہتے تھے"

بدایونی کی زبانی عیسائی مشنری وفد کی آمد کا ذکر کر کے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ان کی گستاخی و یاوہ گوئی کا تذکرہ کر کے مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں :-

"اللہ اکبر! اتنی بدبختانہ بیہودگی کو سن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بل تو کیا پڑتا نہایت خندہ جبینی سے ان کا استقبال کرتا ہے اور خاص اپنے شاہزادے مراد کو حکم دیتا ہے ——— (کہ) چند اسباق ان پادریوں سے پڑھ لو۔

عقائد میں جس کا حال یہ ہو چکا اس کے اعمال کے متعلق سوال ہی فضول ہے ..... دیوان خانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے .... دینی شعائر کی ہجو میں اشعار بنائے گئے اور کوچہ و بازار میں وہی گائے جاتے تھے"

اس کے بعد دکھایا ہے کہ اس تخریب کے بعد ہزارۂ دوم کے نظریے اور دین الٰہی کی تعمیر کس طرح ہوئی؟ بادشاہ نے یہ خیال پکا لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی ——— سکوں تک میں الف (ہزار) کی تاریخ لکھوائی اور بقول ملا صاحب اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ کے دین مبین کی عمر جو ہزار سال تھی وہ پوری ہو گئی۔

مولانا گیلانیؒ ان سب باتوں کو لکھ کر فرماتے ہیں :-

"بہر حال آخر یہ طے کر لیا گیا کہ جدید ملت کی بنیاد رکھ دی جائے"

کچھ دور چل کر فرماتے ہیں:-

"القصہ اس سلسلے میں دوسروں کے بیان سے نہیں بلکہ خود ملا صاحب ہی کی دوسری عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الف ثانی، تحریف اسلام، مساوات ادیان ان تینوں نظریات کو طے کرنے کے بعد نماز روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا ثبوت سے تعلق ہے اُن کا نام تقلیدات رکھا گیا یعنی سب بے عقلی کی باتیں ٹھہرائی گئیں اور مذہب کی بنیاد عقل پر رکھی گئی نہ نقل پر۔"

اس زمانے میں بقول مولانا گیلانیؒ یہ ہو رہا تھا کہ

"مختلف مذاہب کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے دھمکنے لگیں ہر ایک اپنے اپنے مذہب کو دربار میں پیش کرتا تھا ـــــ ملک فرنگ کے پادری آئے انھوں نے انجیل پیش کی اور ثالث ثلثہ کے متعلق دلائل پیش کیے اور نصرانیت کو حق ثابت کیا ـــــ ابو الفضل کو حکم دیا گیا کہ انجیل کا ترجمہ ان پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کریں۔ گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرست بھی آئے انھوں نے زردشت کی حقیت ثابت کی یہ لوگ آگ کی بڑی تعظیم کرتے ہیں ان لوگوں نے بادشاہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی اور کیانی بادشاہوں کے رسم و رواج سے واقف کیا۔ ان کے متعلق بھی ابو الفضل ہی کو حکم دیا گیا کہ ہمیشہ رات دن شاہی محل میں آگ روشن رکھنے کا انتظام کیا جائے۔"

........" ابتداء سب سے پوچھا جاتا تھا اور ہر مذہب والے کی رائے دریافت کی جاتی تھی جیسا کہ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ساری تعمیر جو ہو رہی تھی ظاہر ہے کہ ایک مستقل مذہبی نظام کی تخریب و تکذیب کے بعد ہو رہی تھی ـــــ ممکن ہے کہ ابتداءً اس عمارت منہدمہ کی چیزوں سے بھی اس جدید عمارت کی تیاری میں کام لیا جاتا ہو لیکن حالات نے تدریجاً کروٹ لینا شروع کیا اور نوبت آخر میں یہاں تک پہونچی کہ

اسلام کی ضد اور توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اس کو بادشاہ نص قاطع اور قطعی دلیل خیال کرتے تھے بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل اور نامعقول، نو پیدا عرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی چیزیں خیال کی جاتیں۔"

اس لیے اب سلسلۂ تحقیقات میں اسلام کا نام تختے سے کاٹ دیا گیا، آخری طریقہ کار یہ رہ گیا کہ

مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آجاتی تھی اس کا انتخاب کر لیا جاتا تھا اس معاملہ میں اکبر کی رفتار جس نقطے پر پہونچ کر رہی ملا صاحب ہی اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ـــــــ پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا اور بات بالکل الٹ گئی ـــــــ اور یوں مساوات مذاہب، ترجیح بلا مرجح[۱] رواداری و انصاف کا سارا دعویٰ انتہائی تعصب کی شکل میں بدل گیا اور جب کبھی جس ملک اور قوم میں اس قسم کے دعاوی کا اعلان کیا گیا ہے اس کا آخرانجام یہی ہوا ہے...... ہمیشہ ارتداد والحاد کی بنیاد رواداری کے نرم و دل کش دعوے پر قائم کی جاتی ہے لیکن اس مسلک کے سلوک کی آخری منزل وہی ہے جہاں بالآخر اکبر پہونچ گیا تھا .... اور وہی کمیٹی و انجمن جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ کے عہد تجدید کا نتیجہ ہے لیکن ملا صاحب فرماتے ہیں کہ اکبر مذہب کو بھی ریزولیشن کے خراد پر چڑھا کر رہا۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی ...... چہل تن کی اس مجلس میں مسائل پیش ہوتے تھے اور پھر عقل سے اس کا فیصلہ کیا جاتا تھا البتہ اس کمیٹی کی یہ ایک خصوصیت بھی تھی کہ اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق ـــــــ طرح طرح کے شبہے ہنسی مذاق کی شکل میں کیے جاتے اور اگر کوئی بیچارہ جواب دینے کا ارادہ کرتا تو جواب سے روک دیا جاتا۔ آزاد کمیٹیوں کا یہ عارضہ گویا نیا عارضہ نہیں ہے۔ سب کچھ بول سکتے ہو اور کچھ نہیں بول سکتے، اس تناقض کا کتنا اچھا ثبوت آج بھی قومی اور حکومتی مجلسوں میں ملتا رہتا ہے ـــــــ یہ تھی اکبر دی گریٹ کی مسلمہ رواداری اور بچارے اکبر کو کیا کہا جائے آج بھی مسلک "صلح کل" رواداری کے مدعیوں کا جو تجربہ ہو رہا ہے کیا اس سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی لیکن سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد جو سننا چاہتے ہوں اور دیکھنے سے آنکھیں میچے ہوں ان سے کیا کہیئے۔"

اس کے بعد دین الٰہی کے عناصر کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ باتوں کو حوالوں کے ساتھ بالتفصیل پیش کیا ہے۔

(۱) اکبر آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دوپہر، آدھی رات میں لازمی طور پر کرتا تھا۔

(۲) اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہر فطرت حتیٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجتا تھا اور قشقہ، جنیو سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا تھا۔

(۳) کواکب پرستی میں غلو ہو گیا تھا۔

(۴) تناسخ کا قائل ہو گیا تھا۔

---

[۱] مولانا کے مقالہ میں بلفظہ اسی طرح ہے مگر سیاق سباق سے گمان ہوتا ہو کہ زلت قلم ہو شاید "بالمرجح" لکھنا چاہتے ہوں۔ ح، س

(۵) سوال منکر نکیر، حشر و نشر، حساب و میزان کا قائل نہ تھا۔

(۶) کلمہ میں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھا جاتا تھا۔

(۷) اس دین میں داخل ہونے کے لیے اس کلمے کے ساتھ ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی ہوتا تھا جس کی رو سے اسلام سے علیحدگی اختیار کرلی جاتی تھی۔

(۸) اللہ اکبر خطوط کے سرناموں پر ہوتا تھا۔

(۹) بجائے اسلام کے مریدوں میں سے ایک اللہ اکبر کہتا دوسرا جل جلالہٗ۔

(۱۰) جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو چیلہ کہا جاتا تھا۔

(۱۱) بارہ بارہ آدمیوں کی ٹولی نوبت بہ نوبت بادشاہ سے مرید ہوا کرتی تھی۔

(۱۲) ان کو بجائے شجرے کے بادشاہ کی تصویر دی جاتی تھی، جو مرصع جواہر نگار غلاف میں رکھ کر یہ لوگ اپنی دستاروں پر لگاتے تھے۔

(۱۳) علاوہ ان معبودوں کے جن کو پیر پوجتا تھا مریدوں کے لیے خود بادشاہ کی عبادت بھی دین کے اہم ارکان میں شمار کی جاتی تھی۔

(۱۴) سود، جوئے، اور شراب کو حلال قرار دیا گیا۔

(۱۵) داڑھی کے منڈانے کا رواج ہوا۔

(۱۶) غسل جنابت کو منسوخ کر دیا گیا۔

(۱۷) چچا اور خالہ کی لڑکی سے نکاح ناجائز قرار پایا۔

(۱۸) سولہ سال سے کم لڑکے کا اور چودہ سال سے کم لڑکی کا نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۱۹) ایک سے زائد نکاح نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۲۰) پردہ اٹھا دیا گیا تھا۔

(۲۱) بغیر نکاح کے حق مجامعت دیدیا گیا تھا۔

(۲۲) بارہ سال سے پیشتر ختنہ کرانا منع تھا۔

(۲۳) میت کو پانی میں ڈالا جائے یا جلا دیا جائے یا کسی درخت سے باندھ دیا جائے۔ اگر دفن کیا جائے تو سر مشرق کی جانب اور پاؤں مغرب کی جانب ہوں۔

(۲۴) ریشم، سونا، مردوں کے لیے حلال قرار دیا گیا۔

(۲۵) گائے کا گوشت حرام لیکن شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال تھا۔

(۲۶) عربی پڑھنا عربی جاننا عیب قرار دیا گیا اور فقہ و تفسیر و حدیث کے پڑھنے والے مطعون ہوئے۔
(۲۷) ان علوم کی جگہ نجوم، حکمت، طب، حساب، شعر، تاریخ و افسانہ رائج کئے گئے۔
(۲۸) ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً ث، ح، ع وغیرہ، ان کو بادشاہ نے بول چال سے باہر کر دیا اور اس پر عمل کی یہ صورت نکالی کہ اگر کوئی مثلاً عبد اللہ کو ابداللہ بولتا تو بادشاہ خوش ہوتا۔

یہ اور انکے علاوہ بھی دشمنیٔ دین اسلام کے تمام پہلو دکھا کر اور اُن پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد مولانا گیلانی لکھتے ہیں اور کتنے پتے کی بات لکھتے ہیں:-

"بہر حال بات بہت طویل ہو گئی اور حرف مدعا سے پھر بھی میں اب تک دور ہوں لیکن کیا کیا جائے، روشنی کو وہی پہچان سکتا ہے جس نے اندھیرے کو دیکھا ہو........ آج جس خطرے سے ایمانیوں کے دل تھرا رہے ہیں اُن کو دیکھنا چاہئے کہ کل کا خطرہ کیا اس سے کم تھا؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ ہو سکتا تھا اب تو عقلی راہوں سے بھی اس کا ہونا بہت بعید ہے یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا درِتابندہ —— پروردہ آغوش موج ہے نہ طوفانوں سے کبھی وہ گھبرایا اور نہ سیلاب اسکی رفتار کو دھیما کر سکے —— واللہ مُتِمُّ نورہٖ ولو کرہ الکافرون"۔

اس کے بعد مولانا گیلانیؒ نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا ضروری سمجھا ہے —— جس کا خلاصہ یہ ہے کہ —— اس زمانے کے علماء سو نے بھی اقتدار کی ہوس میں باہمی مخالفت و عناد کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ کو اسلام سے تنفّر پیدا ہو گیا۔ اس کی تفصیل لکھتے لکھتے مولانا گیلانیؒ چیخ اٹھتے ہیں اور آہ سرد بھر کر یوں لکھتے ہیں:-

"کیسا دردناک نظارہ ہے کہ خود دین کے معماروں کے ہاتھوں دین کی بنیاد کھُد رہی تھی اور کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہو گا علماء و مشائخ کی عام حالت تو یہی تھی لیکن اللہ کے بندوں سے زمانے کا کوئی حصہ خالی نہیں ہوتا۔ اسی ہنگامے میں کبھی کبھی ایسے نفوس بھی نظر آجاتے ہیں جن کے سامنے دنیا سے زیادہ آخرت اور نقد سے زیادہ نسیہ عزیز ہوتا ہے۔ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا بدرالدینؒ کا کارنامہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز ہے......... درباری اُمرا میں ایک صاحب قطب الدین خاں تھے اکبر دین جدید کی ان کو بھی تبلیغ کیا کرتا تھا خاں صاحب نے ایک دن فرمایا —— دوسرے ممالک کے

سلاطین مثلاً روم کے اخوندکار (سلطان ترکی) وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ اکبر اس فقرہ پر بگڑ گیا .... اور خوب برسا ....

لیکن بدتمیزی کے اس طوفان کا مقابلہ بھلا ان تنکوں سے کیا ہو سکتا تھا؟ قدرت ہمیشہ ایسے موقع پر ایسی عظیم ہستی کو برسرکار لاتی ہے جو وہبی کمالات اور قوتوں سے سرفراز ہوتا ہے اور دراصل یہ ساری تمہید اسی بزرگ ہستی اور اس کے محیر العقول کارنامے، آہنی عزائم و ارادے کی تفصیل ہی کے لئے تھی ——— لیکن تمہید بھی اتنی طویل ہو چکی ہے کہ اب اس کے لیے کسی دوسرے مستقل باب یا مقالے کی ضرورت ہے، بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا واقعات ملاحظہ دیکھنے کے بعد اب اندازہ ہو سکتا ہے کہ مغلی تخت پر اکبر کے نام سے جو بادشاہ پچاس سال بیٹھا رہا وہ کیا تھا؟ اور پھر اچانک عہد جہانگیری میں دریا کا رخ بدلتا ہے، تا آنکہ شاہجہاں کے عہد تک پورا بدل جاتا ہے اور عالمگیری دور میں تو وہ اسی سمت غرّاٹے بھرنے لگتا ہے ـــ صرف اتنی سی بات حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے پہچاننے کے لیے اس وقت کافی ہو سکتی ہے جب یہ بتا دیا جائے کہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ نے اس کا ذریعہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی ہستی گرامی کو بنایا ـــ میں نے ارادہ کیا تھا کہ واقعہ کے اس رخ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھوں میں جانتا تھا کہ اکبری فتنہ جس کا دوسرا نام الف ثانی کا فتنہ ہے عوام تو عوام خواص بھی بجز چند مشہور باتوں کے واقف نہیں ہیں یا ان کو ناواقف رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ـــ ضرورت تھی کہ اس پہلو کو خوب اچھی طرح واضح کیا جائے۔ خدا کا شکر ہو اس پر ایک سیر حاصل بحث کرنے کا مجھے موقع مل گیا اگرچہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے مقابلے میں بہت کم ہے جو واقع ہوا تھا اور جس کا مواد تاریخ کے منتشر اوراق میں بکھرا ہوا ہے ....

اکبر کی تخت نشینی کے آٹھویں سال سنہ ۹۷۱ھ میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت بمقام سرہند ہوئی، کم و بیش چالیس سال کا زمانہ آپ نے دور اکبری میں گذارا ـــ حضرتؒ کی عمر کا یہ حصہ زیادہ تر علوم ظاہری و باطنی اور کمالات باطنی کے حصول میں صرف ہوا۔ جوانی کے ایام میں آپ اکبر آباد (آگرہ) بھی تشریف لائے تھے جہاں دربار کے ان دونوں عالموں ابوالفضل و فیضی سے آپ کی خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس ارادے کا ظہور بعد کو ہوا اس کا تخم ان ہی ملاقاتوں کے سلسلے میں پیدا ہوا۔ ابوالفضل و فیضی آپ کی غیر معمولی قابلیت ذہن و ذکاوت سے بہت متاثر تھے ——— حج کے ارادے سے آپ ایک دفعہ (سرہند سے) دہلی آئے، یہاں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ بعض غیبی اشاروں کے ماتحت ماوراء النہر سے دہلی پہونچ کر "کسی" کے

انتظار میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

دونوں میں ملاقات ہوئی پھر کیا طے ہوا خدا ہی جانتا ہے اس کے بعد دیکھا گیا کہ حضرتؒ ......
سرہند کی طرف لوٹ گئے اور وہیں اپنے مرشد کی زیر نگرانی سلوک کے مقامات طے کرتے رہے۔
ابوالفضل و فیضی کی صحبت آگرہ میں آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان لوگوں سے آپ کو فتنے کے اسباب اور اُن کے موثرات کے سمجھنے کا موقع ملا جس نے بادشاہ اور اسکی حکومت کو اسی نقطے تک پہونچا دیا تھا ....

خلاصہ یہ کہ اکبر کا زمانہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے لیے تیاری کا زمانہ تھا ادھر اس کا انتقال ہوا اور جہانگیر تخت پر بیٹھا کہ آپ میدان میں اتر پڑے .... مکاتیب اٹھا کر دیکھو جہانگیر کے دربار کا شاید ہی کوئی ممتاز رکن ہوگا جس کے نام آپ کے خطوط نہیں۔ خان اعظم خان جہاں۔ خان خاناں۔ مرزا داراب۔ قلیج خاں۔ خواجہ جہاں اور سب سے زیادہ نواب سید فرید صاحب[1] وغیرہم کے نام خطوط ہیں۔ ان تمام خطوں کا قدر مشترک صرف ایک مقصد ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس نقصان کی تلافی ہونی چاہیئے جو اسلام کو اکبری عہد میں پہنچ گیا ہے ......

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دربار کے ان امراء پر آخر کس طرح قابو حاصل کیا حالانکہ کوئی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا یہ جتنے تھے اکبر ہی کی تھیلی کے چٹے بٹے تھے، ابوالفضل و فیضی کے فیض یافتہ تھے۔ ان اسباب کا احاطہ اور استقصا، اور وہ بھی اس مقالے

---

[1] یہ حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کی اولاد میں سے تھے۔ عہد اکبری میں ڈیڑھ ہزاری اور عہد جہانگیری میں پنج ہزاری منصب دار ہوئے۔ مرتضیٰ خاں ان کا خطاب تھا۔ کتب تاریخ و تذکرہ میں "شیخ فرید" "شیخ فرید دہلوی" اور شیخ فرید بخاری دہلوی تینوں طرح سے مشہور ہیں۔ اکبر نامہ جلد ۳ ص ۴۱۰ میں شیخ فرید بخشی بیگی ـــــ یہی ہیں ـــــ شیخ فرید دہلویؒ کا تعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے حضرت مجددؒ سے بھی پہلے لاہور میں ہو گیا تھا۔ جامع السلاسل (قلمی) سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا ظاہری تکفل انہی شیخ فریدؒ نے کیا تھا۔ گویا کہ حضرت خواجہ کے زمانۂ قیام لاہور میں یہ ان کے میزبان تھے ـــــ اور اُن کے اخراجات کی کفالت اپنے لیے سعادت دارین سمجھتے تھے۔ کتنا بڑا شرف تھا جو اس سید الاصل بزرگ زادہ رئیس کو حاصل ہوا تھا ـــــ فریدی

میں مشکل ہے۔ لیکن سرسری طور پر اس عہد کے علماء اتنا تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لکھنے لکھانے میں کیا وہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو اس عہد کے بڑے بڑے انشاپردازوں کا تھا؟ ایک طرف ابوالفضل کی سحر نگاری کو رکھئے اور دوسری طرف حضرت مجددؒ کے زورِ قلم کو دیکھئے پھر اندازہ کیجئے کہ انشاء کا زور کس میں ہے؟ اسی کے ساتھ آپؒ نے دینی حقائق کی تعبیر میں بھی اپنے زمانے کا ساتھ دیا——— کہتے وہی تھے جو تیرہ سو سال پیشتر سے کہا جاتا تھا لیکن کہنے کا ڈھب وہ اختیار کیا کہ سننے والے کو محسوس ہوتا تھا کہ شاید کوئی نئی باتیں سُن رہا ہے .... جن منشیانہ اور فلسفیانہ تعبیروں سے الحاد پیدا کیا گیا تھا شیخ فاروقیؒ کے خطوط میں دیکھو ٹھیک ان ہی تعبیروں سے وہ براہ راست قرآنی تعلیمات اور پیغمبرانہ سُنن کی عظمت، قلوب میں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ کیا اس زمانے کے علماء کے لیے اس میں کوئی عبرت رہی؟۔

.... علماء صرف ان لوگوں پر قناعت کیے ہوئے ہیں جو ابھی حکومت سے دور ہیں یا دوسرے لفظوں میں جن پر جدید تعلیم کا اثر نہیں پڑا ہے لیکن بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی خصوصاً لازمی تعلیم کے بعد کیا آپ امید کرتے ہیں کہ آپ کی قوم میں پھر کوئی ایسی جماعت بھی رہ جائے گی جس کو موجودہ تعلیم کی ہوا نہ لگی ہو——— اگرچہ قیمتی اوقات کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کامل مایوسی کی حد تک بات نہیں پہونچی ہے——— لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ چیزیں بھی اسی وقت کارگر ہو سکتی ہیں جب ان سے بھی پہلے کام کرنے والا اپنے اندر اس یقین کو پیدا کر چکا ہو جو بچین کر کرکے اس کو کام کرنے کے لیے مضطرب اور بے کل کر دے وہ کام کو نہ اٹھائے بلکہ کام ہی اس کو اٹھائے۔ ورنہ مذبذب ٹھنڈے دلوں سے آپ اس گرمی کو کہاں سے پیدا کر سکتے ہیں جن کے شعلے حضرت مجددؒ کے لفظ لفظ سے پھوٹے پڑتے ہیں——— خدا کا شکر ہے کہ ابھی علماء کے چند افراد میں یقین کا ذخیرہ باقی ہے وہ اس کو دوسروں تک منتقل کر سکتے ہیں لیکن صرف اس کی ضرورت ہے کہ جن کو یہ یقین سپرد کیا جائے ان کو عصری اسلحہ اور آلات سے بھی تھوڑا بہت مسلح ہو جانے کا سامان کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اسی "گرد" سے کوئی سوار آج نہیں تو کل نکل پڑے"۔

اس کے بعد مقالہ کو اختتام کی طرف مائل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"درباری امراء کو قابو میں لانے کے بعد حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ کو ابتداء میں بعض دشواریاں بھی اٹھانی پڑیں .... آپ پر بعضوں نے کفر کا اور بعضوں نے فسق کا فتویٰ صادر کیا بادشاہ کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کی گئی .... آپ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کیا گیا۔ زندان کے یہ

دن حضرت مجددؒ کے بڑے پرلطف گزرے۔ مکتوبات میں اس کی طرف مختلف مقامات میں اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ کما لایخفی علی من طالعہا ــــ لیکن "افق" کا آفتاب کب تک چھپا رہتا۔ صبح ہوئی اور اس کا دمکتا ہوا "چہرہ" لوگوں کے سامنے تھا۔"

اس کے بعد وہ مکتوب مجددؒ مع ترجمہ درج کیا ہے جو زنداں سے رہائی کے بعد خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ (صاحبزادگان) کے نام ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں آپ کا بڑا اعزاز واکرام ہونے لگا (فتنہ اکبری کے رد عمل کے لیے آپ جن مضامین پر دربارِ جہانگیری میں گفت گو فرماتے تھے ان کی اجمالی فہرست بھی اس میں آگئی ہے) ــــ یہ مکتوب جلد سوئم کا مکتوب ۱۳ ہے۔

آخر کار ان الفاظ پر اپنے دلچسپ اور مفید اور پراز معلومات محققانہ مقالے کو ختم کر دیتے ہیں۔

"بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اس کے بعد جہانگیر کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ برابر اپنے ساتھ آپ کو شاہی کیمپ میں رکھتا تھا اور آخر میں اپنے ولی عہد شاہزادہ خرم (شاہجہان) کو آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے کا حکم دیا اور یوں مغل امپائر کو خدا کے ایک فقیر نے بے داموں خرید لیا۔ چاہتا تو اس سے وہ اپنی بادشاہی کا کام لے سکتا تھا لیکن وہ اس کے بعد بھی فقیر ہی رہا بلکہ سچ یہ ہے کہ کتنے بادشاہوں کو بادشاہی کے ساتھ بھی فقیر ہی بنائے رکھا۔"

(از افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ)

حج کیا ہے؟

[اس مضمون میں عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے کہیں کہیں الفاظ میں کچھ حذف و اضافہ یا تبدیلی کی گئی ہے۔ یہ تصرف صرف لفظی ہے اور امتیاز کیلئے زیر خط کر دیا گیا ہے۔ مرتب]

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا، ہاتھی کا کوہ پیکر جثہ ہو یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم دجثہ، ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ ان کے بکھرے ہوئے اجزا کی پیوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کے لیے بھی اور اپنے اپنے ذاتی کمالات کو نشو ونما، ارتقاء و بالیدگی کے آخری نقاط تک پہونچانے کے لیے بھی، ایک ایسا مرکزی نقطہ ہر ایک میں پایا جاتا ہے کہ اس مرکزی نقطے کے وجود کو اگر اس سے نکال لیا جائے تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزا بکھر جائیں گے اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کر کے ارتقاء و نشو ونما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا یہ عمل بھی رک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسکو مثال سے سمجھئے، آم کی گٹھلی یا اسی قسم کے پھلوں کے تخم کو آپنے دیکھا ہوگا آپ جانتے ہیں کہ آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے، پتے، شاخیں، پھول پھل کا ایک طوفان ہوتا ہے جو اس گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جز بنتا رہتا ہے۔ لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیریئے۔ اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی، جسے تخموں اور گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد خواہ کتنی ہی اچھی نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بویا جائے اور چشموں کے کیسے ہی صاف و شفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے لیکن بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے آپ دیکھیں گے کہ گٹھلی سڑتی جا رہی ہے تا اینکہ بالآخر سڑ سڑ کر اس کے اجزا مٹی میں مل کر ادھر ادھر غائب ہو جائیں گے۔

حاصل یہی ہو کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو لیکن کسی درخت کے شجری نظام اور اس کے سارے آثار و نتائج کا حصول یقیناً اسی مرکزی نقطہ کے ساتھ وابستہ ہے اسی کو نوچ کر گٹھلی سے الگ کر لیا جائے تو سارے فیوض جن سے درخت کا تنا اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتے پھول پھل مستفید ہوتے رہتے ہیں ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیوانی دانسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطے کی ہے جسے عوام گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں، دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ جس کا نام زمین اور دھرتی ہے، جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی، انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں، ان ساری پیداواروں کے لیے زمین بھی اپنے اندر کوئی ایسی چیز رکھتی ہے جسے ارضی فیوض و برکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے؟ جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشو و نما اور ارتقاء و بقاء کا خون دوڑ رہا ہے، یا یوں سمجھئے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کوئی ایسا انکھوا رکھتی ہے کہ اسی کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو، جو زمین سے پیدا ہو رہی ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کرُے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جب ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں؟

نہ ماننے والوں سے ابھی بحث نہیں، جنھوں نے مانا ہے کہ

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ ۞ (المائدہ)

بنایا اللہ نے الکعبہ کو جو البیت الحرام (محترم گھر) ہے سارے انسانوں کے قیام کا ذریعہ۔

یہ اسی کی خبر ہے جو زمین کا اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے، خود بتایئے کہ ان ماننے والوں کی نظر، ان سوالوں کے جواب میں کعبہ کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے، وہی "الکعبۃ البیت الحرام" جس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی قرآن میں قیام و بقا سے بھی آگے بڑھ کر۔

إِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا (البقرہ)

اور دیکھو جب ہم نے بنایا اسی "البیت" (گھر) کو انسانوں کے لیے مثابہ اور امن کا ذریعہ)

کی بھی حسب تصریح کر دی گئی ہو اور مثابہ، جیسا کہ علامہ راغب اصفہانیؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے اپنے مفردات میں لکھا ہے، کنوئیں کی اس خاص جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پینے والوں کو پانی پلایا جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ یہی حیثیت مثابہ ہونے کی حسب "الکعبۃ" کو حاصل ہے تو حاصل اس کا بجز اس کے اور کیا ہوا کہ سارے فیوض و برکات جو زمین کے اس کرُے پر تقسیم ہو رہے ہیں ان کے گورنے کا مرکزی نقطہ یہی "الکعبہ" ہے اور صرف "مثابہ" ہی نہیں بلکہ اسی آیت کے لفظ "امنا" سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امن و امان کی بھی ساری ذمہ داری قدرت نے اسی "البیت الحرام" کے ساتھ وابستہ فرما دی ہو، الغرض یہاں حسب[1] کسی کو جہاں کہیں

[1] مجھے تعجب ہوتا ہو کہ بعض لوگ قرآن کے بعض الفاظ مثلاً "النَّاس" ہی کے معنی جو لغت میں ہیں اسی کو چھوڑ کر من مانے معنی لکھ دیتے ہیں مثلاً "النَّاس" سے مراد اہل مکہ لیتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ لغوی معنی کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہوئی (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کچھ بھی مل رہا ہے اسی "الکعبہ" کی راہ سے مل رہا ہے، یہ قرآن کے نصوص صریحہ کا اقتضاء ہے۔

گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ساری کائنات کے ساتھ "العرش" کی نسبت قرآن نے جو بیان کی ہے کہ الرحمٰن اسی "العرش" کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرما رہا ہے یہی نسبت زمین کے خاص کرے کے ساتھ "الکعبہ" بھی رکھتا ہے روایتوں میں "الکعبہ" کے متعلق اسی قسم کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب کر کے رب العزت نے فرمایا کہ

یا آدم اھبطت لک بیتا تطوف به کما یطاف حول العرش وتصلی عنده کما یصلی عند عرشی۔ (تاریخ الخمیس عن قتادہ وعطار ص۳۵ ج۱)	اے آدم اتارا ہے میں نے تیرے لیے ایک گھر تو اس گھر کا اسی طرح طواف کرے گا جیسے "العرش" کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز پڑھے گا۔ جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے۔

اور ایک یہی روایت نہیں بلکہ اسی قسم کے الفاظ دوسری روایتوں میں جو پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس مسئلہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ کرۂ ارض کا قلب اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات و فیوض اس زمین پر بٹ رہے ہیں وہ یہی "الکعبہ" ہے۔

اور روایتوں کو تو جانے دیجیے .... کہ مشہور قرآنی آیت

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ	سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ قطعاً وہی ہے جو "بکہ" میں ہے جو سارے جہانوں کے لیے مبارک بھی ہے اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ بھی۔

کے بعد تو اس قسم کی روایتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی، آخر روایتوں سے اور کیا معلوم ہوتا ہے یہی تو کہ زمین کے کرے پر سب سے پہلا نقطہ جو متعین کیا گیا یہ وہی حصہ ہے جسے الکعبہ کی دیواریں اس وقت

(پچھلے حاشیہ کا بقیہ) جیسے کافۃ للناس یا رب الناس، ملک الناس وغیرہ میں یہی لوگ "الناس" کے وہی معنی بیان کرتے ہیں جس کے سوا "لغتہ" اسی لفظ کا دوسرا ترجمہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے غیر شعوری طور پر کچھ اسی قسم کا احساس ان لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ قرآن جس ماحول میں نازل ہوا ہے اس کے لحاظ سے زیادہ وسیع معانی پر قرآنی الفاظ کا اطلاق کچھ ان کے لیے ناقابل برداشت سی بات ہوتی ہے، کاش وہ سمجھتے کہ اس قسم کا احساس ان کے ایمانی دعوے کی تکذیب تو نہیں ہو۔ بیشک جس ماحول میں قرآن نازل ہوا وہ جاہلی ماحول تھا لیکن جو نازل کر رہا تھا کیا اس کا علم محیط جاہلی ماحول کا تابع تھا؟

تک گھیرے ہوئے ہیں، روایتوں پر تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا، لیکن قرآن کی خبروں کو جو یقین کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں ان کے لیے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے جو اس وقت بھی موجود تھا جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے، اور اس وقت بھی وہ غائب نہ تھا جب "النّاس" یعنی نسل انسانی کے لیے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جا رہا تھا بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی جب وہ ہے جس نے حدباری کے اس عمل سے زمین کے اسی خاص حصہ کو امتیاز بخشا ہے تو اس سے بڑھ کر یقینی خبر اور کس کی ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ آگے "مبارکا" کے لفظ کا اضافہ جو اس آیت میں کیا گیا ہے اس کا مطلب آپ خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ برکتوں کا خزینہ اور فیوض کا حقیقی دفینہ بھی زمین کے اسی حصہ کو بنایا گیا، یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے جس سے برکتیں ابل رہی ہیں اور وہیں سے چھلک چھلک کر ساری دنیا میں تقسیم ہو رہی ہیں، اور یہ میں اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ "العالمین" یعنی سارے جہانوں کے لیے راہنمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا اور نبوت کو ختم کرکے "العالمین" کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا جیسا کہ "ھدیً للعالمین" کے الفاظ کا اقتضا رہے، تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ مادی برکتوں کا سرچشمہ جو مقام تھا اسی کو دینی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی مقرر کیا گیا، آخر "للعالمین" کے لفظ کا تعلق صرف "ھدی" ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ "مبارکا" کے لفظ کو بھی "للعالمین" سے مربوط سمجھنا چاہیئے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اور واضح بینات کی روشنی میں بھی "اُمّ القریٰ" (جو مکہ کا قرآنی نام ہے) اس کے سمجھنے یا سمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے رہے "القریٰ" لفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو بسیط زمین کے کسی گوشہ میں شرقاً و غرباً، شمالاً و جنوباً پہلے پائی گئی ہوں۔ یا اب پائی جاتی ہوں یا آئندہ پائی جانے والی ہوں، وہ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں، امریکہ میں ہوں یا یورپ میں۔ قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغب نے بھی "ام القریٰ" کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان الفاظ کو نقل کیا ہے، کہ

ان الدنیا دُحِیَتْ من تحتہا　　ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی ہے۔

اشارہ اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہے جسے قرآن میں "مبارکا" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

بلکہ بجائے "مکہ" کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی "بکہ" کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے میرے خیال میں یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں ہے نزول قرآن سے صدیوں پہلے "الکعبہ" کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے پیغمبر داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور میں ان والہانہ تمہیدی فقرات کے بعد کہ

"اے لشکروں کے خداوند تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں، میری روح خداوند کی بارگاہ کے لیے آرزومند

بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا من، میرا تن زندہ خدا کے لیے للکارتا ہے"

درمیان کا یہ فقرہ چھوڑ کر ـــــ جس میں اس کی مثال دی گئی ہے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے ـــــ کہ

"گوریّے نے بھی اپنا گھونسلہ، اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے جہاں وہ اپنے بچے رکھیں"

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ

"مبارک وہ انسان ہیں جن میں قوت تجھ سے ہے اور ان کے دلیں تیری راہیں ہیں وے بکہ کی وادی میں گذر کرتے ہیں اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں۔ پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی ہے"

یہ داؤد کی کتاب "زبور" کے مزبور (۸۰) کے فقرے ہیں جس میں چاہ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ قرآنی لفظ "مبارک" کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا کر دیا گیا ہے، پہلی برسات الرحمٰن کی پہلی توجہ ہے جو کرۂ زمین کی آبادی کے لینے کی گئی۔

میں جانتا ہوں کہ آج کل زبور کے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں اس میں "بکّہ" کے لفظ کو اپنی اصلی صورت پر چاہا گیا ہے کہ باقی نہ رکھا جائے۔ بعض نسخوں میں بجائے "وادی بکہ" کے "وادی بقا"[1] اور بعضوں میں "وادی بکار" کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں میں آج کل سیرۃ النبی صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں جو کتاب سب سے زیادہ مقبول اور عموماً ہر جگہ مل سکتی ہے اس میں آپ مشہور عیسائی عالم جو نسلاً یہودی تھا یعنی پروفیسر مارگولیوتھ کی یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ بجز مکہ معظمہ کے زبور کا یہ "بکّہ" اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔ اور یہی میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام "مکہ" کے یہ بتاتے ہوئے کہ یہی گھر سب سے پہلا گھر ہے مندرجہ بالا آیات میں "مکہ" کے نام اور تلفظ کو جو اختیار کیا گیا ہے تو یہ اشارہ اسی مزبور (۸۰) کی طرف ہی جس میں داؤد علیہ السلام نے "بکہ" ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے جو "الکعبہ" کی قدامت کے لیے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے، موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے۔

لیکن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے ان سے پہلے انبیاء علیہم السّلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں اس میں "الکعبہ" کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔

---

[1] افسوس ہے کہ زبور کا وہ نسخہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے جس میں بجائے وادی بکہ کے وادی بقا کا لفظ چھپا ہوا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء کا یہ مطبوعہ نسخہ تھا دیوبند سے آتے ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر فقیر نے کسی عیسائی کتب فروش سے زبور کا یہ نسخہ لیا تھا۔ یہ الگ چھپا ہوا تھا، لوح اس کی سبز رنگ کی تھی۔

۱۲ ....

مثلاً توریت کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق، کہ

"اس نے بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا۔ یم (یعنی سمندر) اس کے پچھم اور عی اسکے پورب تھا"

توریت کے جو عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ "بیت ایل" یعنی بیت اللہ جس کے پورب طرف ابراہیم نے اپنا ڈیرہ گاڑا تھا۔ یہ وہی "الکعبہ" (بیت اللہ الحرام) کا مرکزی نقطہ تھا جہاں بعد کو حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادہ اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ گھر اٹھایا تھا۔ یم یعنی سمندر کا الکعبہ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے رہا "عی" قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لیے کرنا چاہیئے۔ کم از کم مقدمہ تفسیر غایۃ البرہان ہی کو پڑھ لیا جائے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کی کتاب استثنا یا مثنی کا مشہور فقرہ

"خداوند سینا سے آیا، اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس[1] ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا" (باب ۳۳ درس ۲)

بائبل کی جغرافیائی تحقیق بھی اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ فاران یا پاران سے اسی خطے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں "الکعبہ" واقع ہے اور بخاری کی روایت بھی بتاتی ہے کہ کعبہ والے شہر مکہ میں دس ہزار صحابیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تھے، فاران کی پوری تحقیق خطبات احمدیہ مولفہ سرسید احمد مرحوم میں پڑھی جا سکتی ہے۔

بہر حال اگرچہ بگاڑنے اور چھیلنے، مشتبہ کرنے کی مسلسل کوشش کی آماجگاہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے بنے ہوئے ہیں لیکن بچی کھچی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن میں کرۂ زمین کے اس مرکزی "مقام مبارک" کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر سب کو جمع کیا جائے تو کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے ایسا رسالہ جسے دیکھ کر اضطراراً اس قرآنی دعوی یعنی

یعرفونہ کما یعرفون ابنائهم[2]	(اہل کتاب) جانتے ہیں اس "الکعبہ" کو اسی طرح جیسے پہچانتے ہیں وے اپنے بچوں کو

---

[1] دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ ابھی تازہ اڈیشن بائبل کا زبان اردو جو شائع ہوا ہے اس میں "دس ہزار" کی جگہ "ہزارہا ہزار" کے الفاظ درج کیے گیے ہیں۔ [2] "اہل کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں" یہ دعوی قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کیا ہو اور الکعبہ کے متعلق بھی ۔۔۔ ۱۲

کی تصدیق و اعتراف پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے، کاش! کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لیے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کر دیتا۔

سر دست مذکورہ بالا چند شہادتوں پر قناعت کرتے ہوئے میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ "الکعبہ" کے متعلق اسلامی کتابوں میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن عہد اسلامی سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی کیا اس شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کر دیا ہے اور یہ کتابیں تو خیر مذہب و دین سے تعلق رکھتی ہیں مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان و روم کے مورخوں کی کتابوں میں سرزمین عرب کے اس پرانے معبد (الکعبہ) کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے یونانیوں کے قدیم مورخ ہیرو ڈوٹس یا رومی مورخ سیس لس کی تاریخوں میں سے لوگوں نے جو فقرے نقل کیے ہیں، مولانا شبلی مرحوم کی سیرت میں بھی آپ کو وہ مل سکتے ہیں، ان کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی یا بے بنیاد ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ پشت زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں ان میں کوئی مکان یا گھر قرآن کے اس "اول البیت" کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اپنے آپ کو نہیں پیش کر سکتا کہ اس وقت تک مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو بلکہ احترام و عزت کی مرکزیت کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بعض شہر یا دنیا کی بعض آبادیاں بہت پرانی ہیں لیکن سوال کسی شہر اور آبادی کے متعلق نہیں بلکہ ایک مختصر سے گھر جیسا کہ "الکعبہ" ہے اس کے متعلق میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اتنا پرانا گھر کیا اس وقت زمین کے اس کرّے پر مل سکتا ہے، ہیرو ڈوٹس جو حضرت مسیح سے چھ سو سال پہلے گذرا ہے اپنی کتاب میں لکھتا ہو کہ عرب کے اس معبد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں، سوچیے تو اس کا مطلب کیا ہوا؟ ولادت مسیح علیہ السلام کی طرف جو سنہ منسوب ہے، قریب ہے کہ دو ہزار سال تک وہ پہونچ جائے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہیرو ڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً ڈھائی ہزار سال کی ہے خیال کرنا چاہیے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دی جاتی ہو کہ بہت قدیم زمانے سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، تو اس گھر کی قدامت کی تاریخ کتنی طویل ہو جاتی ہے خصوصاً اس کے ساتھ جب اس کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخی معلومات قرار دیا جا سکتا ہے۔ انکی مدت ڈھائی تین ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتی، کا تھیج ہو یا ایتھنز، پامپئی[1] ہو یا رومہ سب ہی کا حال یہی ہے بلکہ

---

[1] آج کل، کھنڈر ہے، اس راکھ کے نیچے دبا ہوا تھا جو اٹنا کے آتش فشاں دہانے سے نکلی تھی۔ حال میں راکھ ہٹائی گئی۔ پورا شہر نکل آیا، بڑے دردناک مناظر اس کھنڈر میں سیاحوں کی نظر سے گذرے ہیں میرے ایک دوست کہتے تھے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

مشرق کے موجودہ شہروں یا قصبوں میں سے ــــ بعض کے متعلق قدامت کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے اگر خرافاتی روایات اور اساطیری قصص و حکایات سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان کی تاریخ بھی دو ڈھائی ہزار سال سے آگے متجاوز نہیں ہوتی۔

اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی "الکعبہ" کا ذکر کرتے ہوئے منجملہ دوسرے صفات کے بعض مقامات میں اسی کو "البیت العتیق" (پرانے گھر) کے نام سے جو موسوم کیا ہے یہ صفت "الکعبہ" کی صرف اضافی ہی نہیں ہے بلکہ تاریخی تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں تو ان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی "حقیقی صفت" یہی ہے، یعنی ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں میں جو بھی پائے گئے، یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں سب کے مقابلے میں یہی مکان کرۂ زمین کا قدیم ترین پرانا گھر ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا "بیت ایل" اور قرآن کا "بیت اللہ" جس آبادی میں پایا جاتا ہے اس کی اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے اس کی، الغرض ان سب کی متعلقہ تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرافیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے جسے سورۃ البقرہ میں ہم پاتے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امت اسلامیہ محمدیہ کو خطاب کرتے ہوئے جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً (البقرہ) • اور اسی طرح بنایا ہم نے تم لوگوں کو وسط اور بیچ والی امت۔

ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے "الکعبہ" ہی کا ذکر ہے فرمایا گیا ہو کہ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ • قریب ہے کہ فرمایا یہ لوگ یہ کہیں کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے کہدو کہ مشرق بھی اللہ ہی کے لیے ہے اور مغرب بھی اسی کا ہے راہ نمائی فرماتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔

بس حاصل یہی ہوا کہ بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے مسلمانوں کو زمین کے اس حصے میں قبلہ جو عطا کیا گیا ہے جسے پانے والے خط مستقیم اور اس راہ پر پا رہے ہیں جو نہ مشرق سے زیادہ دور ہے اور نہ مغرب سے، تو یہ خدا کا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) چوراہوں پر راہ گیروں کی ہدایت کے لیے دیواروں پر بجائے ہاتھ کے انسانی شرمگاہ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ حیاشی کی یہ آخری حد ہے، فاکثروا فیہا الفساد فصب علیھم ربک سوط عذاب ــــ ۱۲

فضل اور اس کی حکمت کا اقتضاء ہے۔

بہرحال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے بلکہ اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی امت قرار دیتے ہوئے ان کے اس حال کو قبلہ سے جب تشبیہ دی گئی ہے جو ان ہی مسلمانوں کا آخری قبلہ ٹھہرایا گیا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے قرآن مطلع کرتا ہے کہ ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے جو دنیا کے معمور اور آباد علاقوں کا درمیانی حصہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے معنی یہی ہوئے، کہ روایتوں میں "الکعبہ" یا مکہ کو سُرۃ الارض (ناف زمین) کے لفظ سے جو موسوم کیا گیا ہے درحقیقت اسی قرآنی خبر کی یہ تعبیر اور توضیح ہے۔ اور ہم جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے سارے مواصلاتی ذرائع خواہ ان کا تعلق خشکی سے ہو یا تری سے یا فضا اور ہوا سے تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اسی علاقہ سے گذرنا پڑتا ہے جس میں "الکعبہ" واقع ہے۔ اسی طرح شمالی اور جنوبی حصوں کے آباد علاقے جو کرۂ زمین پر واقع ہیں جب ان کا حساب کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ شمال میں اسی درجہ تک، اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں چالیس درجہ تک عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر گویا سمجھنا چاہیے (۱۲۰) درجہ تک دنیا کی آبادی شمالاً و جنوباً پھیلی ہوئی ہے اب حساب کیجئے اسی سے بیس کو گھٹائیے تو وہ بھی ساٹھ ہوگا اور چالیس میں ۲۰ کا اضافہ کیجئے تو اس کی جمع بھی ساٹھ ہی ہوگی، پس معلوم ہوا کہ معمورہ کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں اب اطلس اٹھا کر دیکھ لیجئے وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں "الکعبہ" واقع ہے اس کا محل وقوع اس سلسلے میں کہاں ہے۔

اس کے ساتھ کیا کم اچنبھے کی بات ہے کہ رنگ اور قد و قامت، شکل و صورت کی خصوصیتوں کے لحاظ سے بنی آدم چار قسموں میں جو بٹے نظر آ رہے ہیں مثلاً یورپ کے بے رنگ اور پھیکی جلد والے لوگ، اور ان ہی کے ساتھ کالے حبشی اور افریقہ کے عام باشندے ان دونوں قسموں کو اگر ہم ان حصوں میں پاتے ہیں جو "الکعبہ" سے بجانب مغرب واقع ہیں تو ٹھیک اسی کے مقابل چین کے زرد رو، اور ہندوستان کے گندم گوں سانولے لوگ ان علاقوں میں آباد ہیں جو "الکعبہ" کے مشرق میں واقع ہیں۔ گویا اس طریقہ سے "الکعبہ" اپنے آگے پیچھے دو دو قسموں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے اس "اول البیت" کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا ہے کہ "العالمین" کی ہدایت و ارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا، یعنی "ھدی للعالمین" کا مرکز ساڑھے تیرہ سو سال سے یہ جگہ جو بنی ہوئی ہے اور اس سے پہلے اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں یہ ابراہیم کا مقام بنا ــــــ اسی کے ساتھ "فیہ آیات بینات" (یعنی اسی گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں) ان آیات بینات اور کھلی کھلی نشانیوں کو

آپ تلاش کرتے چلے جائیے، زمانہ کے بعد رازہ کا مسلسل انکشاف آپ پر ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے۔ جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کر سکتے ہیں۔ اقوام و امم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس "البیت العتیق" کے متعلق ان سے پتے ملتے چلے جائیں گے، اور یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قدرت کے مقررہ طبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسل انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی "الکعبہ" ہی تھا پھر مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے کے قریب تر ہو جانے کی صورت جب نکل آئی تو پھر مختلف مقامی قبلوں[1] سے ہٹا کر سب کو اسی پرانے واحد مرکزی قبلہ پر جمع کر دیا گیا۔ تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ان ہی "آیات بینات" سے ہو رہی ہے جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے میں مانتا ہوں کہ اس قسم کی روایتیں مثلاً اسرائیلیات کے مشہور اسلامی عالم وہب بن منبہ کے حوالہ سے کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ مکہ کی ایک وادی میں جس کا نام الحطیم ہے حضرت آدم سے فرشتوں نے ملاقات کی اور خوش آمدید کہا، پھر بولے کہ اے آدم اسی گھر کا حج تم سے دو ہزار سال پہلے ہم لوگوں نے کیا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بعد

قدم بہ الملاک مکۃ فطاف	حضرت آدم کو فرشتہ مکہ لایا پھر سات دفعہ کعبہ کا
بالبیت اسبوعا ثم رجع الی	طواف حضرت آدم نے کیا اور اس کے بعد ہندستان
ارض الھند فمات بھا۔ (خمیس صفحہ ۹ ج ۱)	واپس ہو گیے جہاں ان کی وفات ہوئی۔

یا اس کے قریب قریب دوسری روایت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کی گئی ہو، فرماتے تھے کہ

---

[1] تاریخ کا ایک ایسا دور بھی نسل انسانی پر گذرا ہے جب قوموں کے قبلے مقامی بھی تھے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف خود قرآن میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ما انت بتابع قبلتھم وما بعضھم بتابع قبلۃ بعض سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ نیز سیرت کی کتابوں میں یہ روایت جو نقل کی جاتی ہے کہ قبلوں کی تعداد پندرہ تھی۔ سات نچلے حصے میں اور سات بالائی حصے میں (دیکھو الخمیس صفحہ ۹ ج ۱) ہو سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے دونوں حصوں فوقانی و تحتانی جس میں امریکہ وغیرہ بھی واقع ہے الخمیس ہفت اقلیم میں سے ہر ہر اقلیم کے لیے ایک قبلہ ہو، اسی کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہو بہر حال وہ قبلے تو مقامی ہوئے اور پندرھواں مرکزی قبلہ "الکعبہ" ہوا۔ مگر یہ سارے قصے اسی وقت کے تھے جب مختلف امصار و بلاد کے باشندوں کا ایک ہی کتاب، ایک ہی قبلہ پر جمع ہونا عملاً دشوار تھا۔ پر جب اس کا امکان پیدا ہو گیا تو سارے مقامی قبلے وقتی کتابوں کا قصہ ختم کر کے آدم کی اولاد پھر ایک کر دی گئی، جیسے بکھرنے سے پہلے سب ایک تھے۔

حج آدم من الهند اربعين حجة . — ہندوستان سے الکعبہ کا حج حضرت آدم نے چالیس دفعہ فرمایا۔

......سنداً اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ بہت محل اشتباہ ہے لیکن جب قرآن کے نص قطعی سے معلوم ہوتا ہے کہ "الناس" یعنی آدمیوں کے لیے سب سے پہلا گھر "بکہ" ہی میں بنایا گیا تو ان روایتوں کا جو حاصل ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام وادی بکہ کے اسی اول البیت سے تعلق رکھتے تھے آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

......بہرحال...... الکعبہ کی مرکزیت کے اظہار کے لیے قرآن نے ان تمام حقائق سے پردہ اٹھا دیا ہے جن کے متعلق ممکن ہے کہ غیر ایمانی عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہو کہ "الناس" کے قیام و بقار کا تعلق بھی اسی الکعبہ سے ہو وہی الناس کے لیے مثابہ (پن گھٹ) ہے اور ان کا امن و امان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ "العالمین" یعنی سارے جہانوں کے لیے وہ مبارک بھی ہے اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا، اس بنا پر ایسی روایتوں کو کہ مثلاً آیا ہے ......

انزل الله خيمة من خيام الجنة فوضعها بمكة موضع البيت (الخمیس ج۱ ص۹۱) — اتارا اللہ نے جنت کے خیموں میں سے ایک خیمہ پھر خدا نے اس کو رکھا اس جگہ پر جہاں البیت یعنی "الکعبہ" واقع ہے۔

میں مذکورہ بالا قرآنی حقائق کی تعبیر و تفسیر سمجھتا ہوں، مآل ان روایتوں کا بھی وہی ہے کہ انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا خالق کائنات نے جب فیصلہ فرمایا تو اس کے قیام و بقار نشو و نما، امن و ارتقار کے لیے "الکعبہ" کو مرکز قرار دیا گیا اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لیے "العرش العظیم" پر "الرحمٰن" مستوی ہوا اسی طرح کرۂ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لیے الکعبہ کو اس نے اپنی تجلی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا۔ اور بقول حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ آفتاب آئینے میں نہیں اترتا لیکن خاص قسم کی تجلی آفتاب کی آئینے میں جو ہوتی ہے اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہو بہو کامل آفتاب آئینے میں جھلکتا اور چمکتا نظر آ رہا ہے کچھ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ جو آسمان و زمین میں بھی نہیں سما سکتا وہی خالق ارض و سماوات "الکعبہ" کی "تجلی گاہ خاص" میں کچھ اس طرح نمایاں ہے کہ آئینے کو جیسے بیت الشمس کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح "الکعبہ" پر بھی بیت اللہ کا اطلاق ایک صحیح مشاہداتی یافت ہی کا یہ اعتراف ہوگا، ذات حق کی یہی تجلی کامل درحقیقت بنیاد ہے ان سارے دینی اور روحانی تعلقات کی جن کو "الکعبہ" کے ساتھ اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

(۲)

کیسی عجیب بات ہے کہ مختلف قطعاً دو مختلف نوعیت کے تعلقات اسی ایک تجلی گاہ ربانی کے ساتھ اسلام نے قائم کیے ہیں یعنی ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ الصلوٰۃ (نماز) کے لیے دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ پانچ دفعہ سارے جہاں کے

مسلمانوں کا رخ اسی "الکعبہ" کی طرف پھیرنے کو اسلام ضروری قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کو دن کے ان پانچ وقتوں میں اسلام جب "الکعبہ" کے سامنے لاکر کھڑا کرتا ہے تو اس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ زور جسم کی صفائی اور لباس کی صفائی بلکہ ہر اس عضو کی صفائی اور پاکیزگی پر دیتا ہے جو عام حالات میں گرد و غبار، گندگی، میل کچیل سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ باضابطہ کامل وردی میں پھر حکم دیا جاتا ہے کہ کمال متانت اور سنجیدگی کے ساتھ دربار الٰہی کی حاضری کی سعادت حاصل کریں۔ عرض و معروض میں بھی لجاجت سماجت کے آخری حدود تک پہونچنے کی کوشش کریں۔ الغرض اپنی ایک ایک حرکت اور ایک ایک سکون سے اس احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کریں کہ اقتدار و اختیار کی آخری قاہرانہ قوتوں کے سرچشمے کے آگے اپنے آپ کو وہ ذلت و مسکنت کی ممکنہ شکلوں کے ساتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ الغرض بجائے شور و ہنگامہ کے ہر قول اور ہر عمل کو نظم و ضبط کے انتہائی دباؤ کے نیچے رکھنا نماز کی جان اور حقیقی روح ہو۔

پس "الکعبہ" کے سامنے آنے کی ایک شکل تو یہ ہے جس کا نظارہ ہر مسجد میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے لیکن یہی "الکعبہ" اور خدا کی بارگاہ "تجلی گاہ ربانی" ہے اسکے آگے اسلام ہی ان مسلمانوں کو لاتا ہو جنھیں وہ مسجد میں لے جاتا ہے پر کس شان کے ساتھ؟ تمدن و تہذیب کے ماحول کا سارا لباس اتروا لیا جاتا ہو سلی ہوئی معمولی دو پلی ٹوپی تک سر پر رکھنے کا اب وہ روادار نہیں ہو، جو سب کچھ پہنتے تھے اور اسلام ہی ان کو سب کچھ پہنتا رہا تھا، اچانک آج وہی اصرار کر رہا ہو کہ بجز ان دو کفنیوں یا لنگیوں کے جنھیں حاجی احرام کے نام سے گلے میں ڈالے رہتے ہیں کسی دوسرے کپڑے کا اضافہ ان کے لیے اس حال میں درست نہ ہوگا، حد یہ ہے کہ ان کفنیوں کے پلوں کو جوڑنے کے لیے گرہ تک ڈالنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے[1]۔

اب ذرا مسجد کے ان ہی نمازیوں کو دیکھیے جو قبا در بر، عمامہ بر سر، وقار و متانت کی انتہائی سنجیدگیوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں اسی "الکعبہ" کے سامنے کھڑے ہوئے تھے آج حج کے میدانوں میں ان ہی نمازیوں کا کیا حال ہو، سر کھلا ہوا ہے، بال بڑھے ہوئے ہیں، ناخنوں کی درازی حد سے گذری ہوئی ہے، گرد میں سارا جسم اٹا ہوا ہے۔ وہی اسلام جو دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ اگر غسل نہیں تو ہر نمازی کو نیم غسل (وضو) کا حکم دیا کرتا تھا آج ...... اصرار کر رہا ہے کہ اُلجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کے لیے کنگھے کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بہ ضرورت نہانے پر مجبور بھی ہوں تو جس اسلام کو مسجدوں میں دیکھا جاتا تھا کہ ڈھونڈھ ڈھونڈ کر ایک ایک عضوے میل کچیل کے ازالہ کو فرض ٹھہرا رہا تھا البراجم و المغابن[2] تک کو ملواتا تھا وہی فتویٰ

---

[1] فقہانے لکھا ہو کہ کسی کانٹے یا اسی قسم کی چیز وغیرہ سے ان کو جوڑ لیا جائے۔ [2] انگلیوں کی پشت کی گرہوں کے سامنے سکڑی ہوئی کھال کے جو حصے ہیں ان ہی کو براجم کہتے ہیں، اور مغابن جسد انسانی کے ان حصوں کو کہتے ہیں جو عمیق اور پوشیدہ رہتے ہیں مثلاً بغل، بن ران وغیرہ

دے رہا ہے کہ

ازالۃ التفث حال الاحرام حرام (مناسک ملا علی قاری)

احرام کی حالت میں میل کچیل اور بدن سے کثافتوں کا دور کرنا ناجائز ہے۔

"قوموا للّٰہ قانتین" (کھڑے رہو (نماز میں) چپ چاپ) کے قرآنی مطالبہ سے جب اسلام کی مسجدیں گونج رہی ہیں، جماعت تک میں شریک ہونے کے لیے تیز قدمی اور لپک کر جھپٹنے تک کو دربار الٰہی کی ادب شناسی سے محرومی قرار دیا گیا ہے، وہی اسلام اعلان کر رہا ہے کہ حج کی راہ میں جتنا زیادہ چیخ سکتے ہو، چیختے چلے جاؤ، پیغمبر کا بیان ہو (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ "افضل الحج العج" (بہترین حج وہ ہے جس میں شور وغل مچایا جائے) یعنی لبیک الخ کے کہنے میں جتنا زور لگا سکتے ہوں لگائیں۔

جمعہ کی نماز کے سلسلے میں خطبہ کے وقت کنکریوں سے کھیلنے والوں تک کو لغویت کا مرتکب قرار دیا گیا ہے لیکن حج کے میدان میں وہی اسلام حکم دیتا ہے کہ چلاتے اور چیختے ہوئے ایک وادی سے دوسری وادی کی طرف ایک پہاڑ کے دامن سے دوسرے پہاڑ کے دامن تک دوڑتے ہوئے آؤ بھی اور دوڑتے ہوئے جاؤ بھی، انتہا یہ ہے کہ ان ہی حاجیوں سے ایسا فعل بھی کرایا جاتا ہے جس پر رقص کا شبہ اگر کیا جائے تو بے محل شبہ نہیں ہو سکتا۔ آخر طواف جو حج کا ایک رکن رکین ہو اس میں ایک ٹولی کے بعد دوسری ٹولی "الکعبہ" کے چاروں طرف جو گھومتی رہتی ہے، خواہ اصطلاحاً رقص کا اطلاق اس پر صحیح نہ ہو لیکن جو نہیں جانتے ہیں وہ مسلمانوں کے اس طریقہ عمل کو آپ خود سوچئے کہ کیا سمجھیں۔ بعضوں نے اس پر تعجب بھی کیا ہے لیکن اسی تعجب میں تو سارا راز چھپا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی شائستگی کے معیار کو اسلام نے اتنا بلند کر دیا ہے کہ طواف خواہ واقعہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو لیکن رقص یا ناچ کے لفظ کے اطلاق پر اپنے تو اپنے شاید دل پر جبر کے بغیر غیر بھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسجدوں کے برعکس حج کے میدانوں میں جو کچھ کیا جاتا ہے، دوڑایا جاتا ہے، گھمایا جاتا ہے، کنکریاں چنوائی جاتی ہیں اور اس حال میں رہنے کا حکم دیا جاتا ہے جس حال میں دیوانوں اور سرگشتوں کو دیکھا جاتا ہے، سر کھلے ہیں، ناخن بڑھے ہیں، بال الجھے ہیں، بدن میل کچیل میں ڈوبا ہوا ہے۔

کیا بات ہے کہ ایک ہی اسلام اچانک سنجیدگی و متانت و وقار کے سارے قصوں کو ختم کر کے مسلمانوں پر اس حالت کو...... طاری کراتا ہے، ان کے کانوں میں اس نے کیا پھونک دیا ہے کہ دیوانوں کی طرح کبھی ادھر جاتے ہیں، کبھی ادھر جاتے ہیں۔ کبھی دوڑتے ہیں، کبھی روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کبھی اس تودے پر کنکریاں پھینکتے ہیں، کبھی اس پتھر پر کنکریاں برساتے ہیں۔ چکر کاٹتے ہوئے ان ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ ناچ بھی رہے ہیں گا بھی رہے ہیں۔ رہ رہ کر بوسے کے لیے لبوں کو بھی کسی چیز پر ملتے ہیں۔ نہ سر پر ٹوپی ہے نہ پاؤں میں جوتا ہے ایک بن سلی چادر

پیٹھ پر پڑی ہوئی ہے اور دوسری ٹانگوں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا لباسی سامان ان کے پاس نہیں ہے، آخر ان ہی کپڑوں کو وہ کیوں استعمال نہیں کرتے جن کے بغیر وہ مسجدوں میں جانا نہیں پسند کرتے تھے، اپنے بدن کو کثافتوں سے پاک کیوں نہیں کرتے، ناخن کیوں نہیں ترشواتے، بال کیوں نہیں سنوارتے، خوشبو کیوں نہیں لگاتے، بربریت اور وحشت کی بچی کھچی یادگاروں کو مٹا کر اسلام ہی نے تو مسلمانوں کو تہذیب و شائستگی کی راہوں پر ڈالا تھا۔ پھر آگے بڑھانے کے بعد اسی اسلام نے ان کو پیچھے کیوں ڈھکیل دیا۔ اور ڈھکیل دینا کیا معنی؟ اس نے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک جوہری عنصر حج ہی قرار دیا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک سوال ہے اور بڑا اہم سوال، مگر "الکعبہ" کیا ہے، ارضی کائنات کے ساتھ اس کا جو بنیادی رشتہ ہے جن کے لیے یہ راز راز باقی نہیں رہا ہے، کیا نماز اور حج کے اعمال و افعال آداب و فرائض کے ظاہری تناقض و تعارض کی یہ بوالعجبی ان کے لیے بھی بوالعجبی باقی رہتی ہے؟

بلاشبہ فطرت انسانی قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہتی ہے اس میں یہ جبلی جستجو پائی جاتی ہے کہ قدرتی قوانین کی پابندیوں سے ساری کائنات، شجر و حجر، پرندے درندے وغیرہ اپنے نوعی کمالات تک پہونچنے میں جیسے کامیاب ہو رہے ہیں اسی طرح اس کی کامیابیوں کا راز بھی ان ہی پابندیوں میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ جو دیکھا جا رہا ہو کہ عموماً بنی آدم مذہب کے نام سے احکام و قوانین کے کسی مجموعہ کی پابندی کو اپنے لیے ناگزیر قرار دیئے ہوئے ہیں۔ درحقیقت اسی اندرونی سوال کا یہ جواب ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ پیدا کرنے والے کی طرف احکام و قوانین کے جس مجموعہ کو منسوب کیا جاتا ہو، واقعی وہ خالق کائنات کی مرضی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے یا نہیں، لیکن ہر پیدا ہونے والا آدمی باور یہی کرتا ہے کہ مذہب کے نام سے وہ اپنے خالق کی مرضی ہی پانے میں کامیاب ہوا ہو، بہرحال یہ ایک مستقل علیحدہ بحث ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذاہب و دیانات کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدائی احکام و قوانین کی پابندی کا ان میں مطالبہ کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ اسلام کو بھی اسی مطالبہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کے مطابق اس کے نافذ کردہ احکام و قوانین کی تعمیل و امتثال میں زندگی بسر کرنا، بندوں کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے، نشوونما کی جو قدرتی صلاحیتیں فطرت انسانی میں پائی جاتی ہیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کو بارآور کرانے کی قدرتی راہ یہی ہے کہ خالق کردگار کو اپنا حاکم تسلیم کرکے بندہ اسی کا محکوم بن جائے، بندگی اور عبدیت اسی فرض کو طبعاً ہم پر عائد کرتی ہے اس فرض سے عہدہ برا ہونا اور عہدہ برا ہونے کی کوشش یہی ہمارے وجود کا حاصل اور آخری غایت ہے۔

سچ پوچھیے تو بار بار ہر چوبیس گھنٹے میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد "حی علی الصلوٰۃ" کی پکار،

لاہوتی ادب گاہوں اور ان کے بلند میناروں سے فضا میں جو گونجتی رہتی ہے درحقیقت محکومیت اور بندگی غلامی عبدیت کے اسی فرض کو یاد دلانے اور اس کے احساس کو قلب میں مسلسل جگائے رکھنے کی یہ عملی تدبیر ہے۔ آپ دیکھئے ان کو جنھوں نے اس لاہوتی پکار سے بہرے بنے رہنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے —— جب پکارنے والے کی پکار پر چل پڑنے کے لیے وہ آمادہ ہوتے ہیں، وہ اپنی وردی درست کرتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں کہ صفائی اور پاکیزگی کے برخلاف ان کے لباس کے کسی حصے میں گندگی اور نجاست کا کوئی داغ اور دھبہ تو نہیں ہے۔ سکینت و وقار کی تصویر بن کر انتہائی اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پہلے اس مقام میں آتے ہیں جہاں کپڑوں سے آگے بڑھ کر اپنے جسد اور بدن کی کثافتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ کم از کم تین تین بار بدن کے ان حصوں کو دھوتے ہیں جن کی آلودگی کا عام حالات میں اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ شست و شو کے اس شغل سے فارغ ہونے کے بعد دیکھئے وہ اپنے پیدا کرنے والے خالق و حاکم کے سامنے کھڑے ہیں۔ تجزیہ کیجئے ان اعمال اور مشاغل کا جن میں اب وہ منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں۔ دست بستہ قیام، قیام کے اسی حال کے بعد سر کو جھکا دینا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنا ماتھا ٹیک دینا، یہ اور اسی کے ساتھ دوسرے قولی و فعلی اجزا و عناصر جن کی ترکیب سے مسلمانوں کی نماز کا قوام تیار ہوتا ہے۔ ان سب میں بتائیے کہ احکم الحاکمین، آقائے علی الاطلاق کے حاکمانہ شئون اور اقتداری تجلیوں کے سوا کیا کوئی اور چیز بھی جھانک رہی ہے؟ عقیدت و نیاز یا احساس محکومیت و بندگی کو تصویری پیکر میں لانے کی جو آخری شکل ہو سکتی ہے کیا الصلوٰۃ یا نماز اس کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ فقر و مسکنت، احتیاج و تذلل کے جذبات کے اظہار کا زندہ قالب یہی ہو سکتا تھا، میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں اور بھی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔

الصلوٰۃ اسلام کے چار اہم ستونوں میں ایک ستون ہے، اسی طرح الزکوٰۃ کے نام سے جس محصول کو امراء اور تونگروں سے وصول کر کے غرباء اور نا مستطیع باشندوں میں اسلام تقسیم کراتا ہے، تو کیا یہ وہی فرض نہیں ہے جسے ہر حکومت اپنے باشندوں پر عائد کر کے اپنے حاکمانہ اقتدار کو ظاہر کرتی ہے —— اور الصلوٰۃ والزکوٰۃ تو دینی اسلامی رکن ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے سوا بھی اسلامی مطالبات کے بڑے، بہت بڑے ذخیرے کی بنیاد مطالبہ کرنے والے کے حاکمانہ اقتدار ہی پر قائم ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے:

مگر سوال یہی ہے کہ ہستی کی اس تجلی گاہ کے آخری سرچشمے کے متعلق جن جستجوؤں کو انسانی فطرت اپنے اندر پاتی ہے، کیا حاکم و محکوم کے ان تعلقات اور ان تعلقات کے اقتضاؤں کی تکمیل کے بعد ہمارے اندر کی ڈھونڈھ کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری پیاس کیا بجھ جاتی ہے، آخر ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

بحرِ وجود کے ان تموجات اور لہروں کی توجیہ میں کیا کہا جائے؟ کیا پایا تھا ایران کے کج کلاہ اور خراسان کے آہن گر تیشہ نے گوشت و پوست، چربی اور استخوان کے اس مجموعہ میں جس کا نام شیریں تھا کہ آہن گر نے تو سر پھوڑ لیا، اور خسرو خود سراپنے ہوش و حواس، عقل و خرد، شوکت و ابہت کے سرمایہ کو کھو بیٹھا۔

اس خلش اور تپش، قلق اور بے چینی، اضطراب والتہاب کے اسباب کا سراغ کیسے لگایا جائے، اور کہاں لگایا جائے جو عامری دیوانے کو بن بن میں پھراتے تھے اور بیابانوں کے پتھروں کی ٹھوکروں کے ساتھ اس کو راضی کئے ہوئے تھے، وادیٔ نجد کی ہرنیوں کی لمبی گردنوں اور بڑی بڑی آنکھوں میں وہ کسے ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ کتوں کے پاؤں کو اس لیے کیوں چومتا تھا کہ اسکی لہریں اس چوکھٹ تک پہونچ جائیں گی جس کا بوسہ اسکی زندگی کا آخری مقصود تھا۔

بہرحال آپ اس کا نام حسن رکھیئے یا جمال، یا جوجی میں آئے جس لفظ سے بھی اس کی تعبیر کیجئے، لیکن وجود کے اس تلاطم میں ایسی لہریں بھی یقیناً گھلی ملی، رسی بسی ہیں، جن کے غیر معمولی دباؤ کا فطرت انسانی انکار نہیں کر سکتی، دباؤ اور عجیب و غریب دباؤ جس کے نیچے بسا اوقات حکومت اور سلطنت کا اقتدار بھی کھوکھلا بن کر رہ گیا ہے۔ مطلق العنان جباروں کو بھی اس کی گرفت کے اندر تڑپتے اور پھڑکتے دیکھا گیا ہے۔

انسانی قالب اور بشری پیکر میں حسن و جمال کے ظہور کے بعد جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے متعلق تو ایک حد تک "جنسی میلانات" کے شعوری یا غیر شعوری اشاروں کو بھی دخیل ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن بہتی ہوئی نہروں، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں، چہچہاتی ہوئی چڑیوں، کھلے ہوئے شگفتہ و نیم شگفتہ پھولوں، وادیوں کے نشیب و فراز، دامن کوہ کی ابھرتی ہوئی بلندیوں اور ڈھلتی ہوئی پستیوں، الغرض انسانی پیکروں سے ہٹ کر جمادی، نباتی و حیوانی سانچوں میں حسن و جمال کی تجلیاں ڈھل ڈھلا کر جب سامنے آتی ہیں تو اس وقت گدھوں اور بکروں کو نہیں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو نہیں بلکہ صرف آدم کے بچوں اور حوا کی بچیوں ہی کو بہجت و نشاط، سرور و وجد کے گردابوں میں چکر کھاتے ہوئے کیوں پایا جاتا ہے؟

پس واقعہ یہ ہے کہ جمال پرستی کہیئے، یا حسن پسندی یہ انسانی سرشت کا ایسا جوہری عنصر ہے کہ اسی پر اس کے نوعی امتیاز کی بنیاد قائم ہے، وہ حسن کی جستجو اور جمالی تجلیوں کی تلاش کے جذبہ کے ساتھ پیدا بھی ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اسی جذبہ کو ساتھ لیے ہوئے مرتا ہے۔

بہرحال جستجوئے حسن یا تلاش جمال کا جو جذبہ انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے نہ اس کا انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ جمال و حسن کی جو تجلیاں برگ گل اور نغمۂ بلبل سے جھلک رہی ہیں اور جن کی روشنی سے جمادی و نباتی، حیوانی و انسانی مظاہر سے بھری ہوئی یہ کائنات جگمگا رہی ہو، ان کے وجود کے اس بحر متلاطم میں کوئی آخری سرچشمہ نہیں ہے۔ ہمارا ابتدائی لاہوتی سبق ہی الحمد للہ سے شروع ہوتا ہے کمال ہو یا جمال، الغرض وجود کا ہر وہ پہلو جو مستحق مدح و ستائش ہو

ہم مان ہی نہیں سکتے کہ وہ نہ تھا پھر ہوا ہے" ہستی نیستی سے بھی پیدا ہو سکتی ہے" عقل بھی اس تجویز سے جھنجلاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ "الاسماء الحسنیٰ" نص قطعی کے رو سے جس ذات میں منحصر ہیں ان کے ماسوا کے سوا، بتایا جائے کہ حسن کے سرچشمے کو اور کہاں ڈھونڈا جائے۔

(۳)

ان تمہیدی مقدمات کے بعد، اب سوچئے کہ ناقص انسانوں کے ناقص عقول کا گڑھا اور تراشا ہوا دستور دائین نہیں بلکہ عالم الغیب والشہادۃ خدائے کامل کا بخشا ہوا دین کیسے کامل ہو سکتا تھا جب تک فطرت انسانی کی جستجوئے جمال اور تلاش حسن کے جذبہ کی تسکین کا سامان بھی اس میں نہ کیا جاتا۔ مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان سے اس وقت بحث نہیں لیکن اپنے اسلامی اسلاف سے جو دین ہم تک پہونچا ہے اور جن لوگوں نے ہم تک اس کو پہونچایا ہے، ان کا بیان ہے، محدث الدیار الہندیہ، استاذ الکل فی الکل حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ فارسی زبان کی اپنی تفسیر میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:-

"باز ایشاں را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را والہ و شیدا ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار، برائے گردشتن خانۂ محبوب خود برہنہ سر، و برہنہ تن، و برہنہ پا، ژولیدہ مو، پریشاں حال و گرد آلودہ از شام بہ زمین حجاز رسیدہ گاہے بر کوہ و گاہے بر زمین رو بہ سوئے خانہ کردہ استادہ شوند"

پھر حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے آپ کو سرگشتہ و شیدا بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کرکے محبوب کے گھر کے گرد ننگے سر، ننگے پاؤں، اُلجھے ہوئے بال، پریشاں حالی کے ساتھ گرد میں اَٹے ہوئے سرزمین حجاز میں پہونچیں اور وہاں پہونچ کے کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر محبوب کے اس گھر کی طرف رُخ کرکے کھڑے ہوں۔

اسی قسم کی تفصیلات کے بعد بیان کو ان فقروں پر ختم کرتے ہوئے، کہ

"گرد خانۂ تجلی آشیانۂ او طواف کنند و بار بار کنجہائے آن خانہ را بہ بوسند و بہ لیسند"

اسی تجلی خانہ کے ارد گرد گھومیں، اور اس کے گوشوں کو بچوم میں چاٹیں۔

حج کا جو مقصد ہے اسی کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں، فرماتے ہیں:-

"تا معنیٔ عشق و محبت کہ در باطن ایشاں کامن ست در لباس صورت جلوہ گر شود،"

تا کہ عشق و محبت کا جو جذبہ ان کے باطن میں پوشیدہ ہے وہ ظاہری شکل و صورت

وشہور خاص وعام گرد دو در ہیں بین آواز بلند لبیک گویاں نعرہ ہا زنند و آتش محبت اندرونی را آں نعرہا برافروزند۔"

کا قالب اختیار کرے اور اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے۔ اسی سلسلے میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ بلند آواز کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے نعرے لگائیں اور ان نعروں کی راہ سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکائیں۔

آخر میں شاہ صاحب نے لکھا ہے، کہ:۔

"ایں کیفیت مناسک حج برائے ایشاں مقرر شد وطواف وسعی بین الصفا والمروہ وآمد ورفت مزدلفہ وعرفات و اقامت در منیٰ وذبح وقربانی وتلبیہ واحرام شروع گشت۔"

حج کے مناسک میں یہی کیفیت ان کے لئے مقرر ہوئی اور اسی بنیاد پر طواف کعبہ، مروہ وصفا کے درمیان تگ ودو (سعی)، مزدلفہ کی آمد ورفت عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح وقربانی احرام وغیرہ اعمال کا حکم دیا گیا ہے۔

اور ایک یہی کیا، آپ کو اسلامی بزرگوں کی مختلف کتابوں میں یہ اور اسی قسم کی ملتی جلتی باتیں مل سکتی ہیں، اردو میں سیدنا قاسم العلوم والخیرات بانی دار العلوم دیوبند کی کتابوں خصوصاً "حجۃ الاسلام" میں حج کے ایک ایک جزو کی تشریح اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے جو کی گئی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے اور قربانی اگرچہ میرے نزدیک دینی نظام میں اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے تاہم حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے صاحب "غایۃ الشعو" نے لکھا ہے:۔

"قربانی نمودن مخبریست کہ خود را براہ دوست ایں چنیں فدیہ نمودن شاید۔"

حج کے موقع پر قربانی کا مطلب یہ ہے کہ دوست کے لیے چاہیئے قربانی کرنے والا اسی طرح اپنے آپ کو تیار کرے کہ وہ بھی قربانی کے جانور کی طرح ہر وقت اپنی جان فدا کرنے کے لیے تیار ہے۔

بہرحال حسن ازل اور جمال مطلق کی جستجو وتلاش یہی الحج کی روح ہے، اگرچہ حج کے اعمال اور مناسک کے تجزیہ وتحلیل ہی سے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف اس نتیجے تک پہونچے ہیں، جیسے الصلوٰۃ یعنی نماز میں جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کے حاکمانہ اقتدار اور اس کے آثار کو بندے اپنے اوپر طاری کرتے ہیں۔ ان اسلامی ارکان کے پھل ہی ایسے ہیں جن کو دیکھ کر معمولی عقل کا آدمی بھی درختوں کو پہچان سکتا ہے،

لیکن سچی بات یہ ہے کہ حج کے مطالبہ کا ذکر جن الفاظ میں قرآن کے اندر پایا جاتا ہے، قرآنی طرز کے ادا شناسوں کے لئے ان ہی میں کافی اشارے ہیں، خصوصاً آخری الفاظ جن پر یہ آیت ختم ہوئی، یعنی

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین ۝ — اور حج کے مطالبہ کا ناشکری کے ساتھ جس نے انکار کیا تو اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔

عشق و محبت کی راہ و رسم کا جو تجربہ رکھتے ہیں اور سوز و ساز سے کچھ حصہ جنہیں میسر آیا ہے ان ہی کے چوٹ کھائے قلوب اس طریقۂ بیان کے اثر کو محسوس کر سکتے ہیں، سیدنا الامام الحاج امداد اللہ المہاجر المکی قدس اللہ سرہ العزیز قرآن کی دھمکی

لا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیمۃ: — نہ حق تعالیٰ ان سے بات کریں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے قیامت کے دن۔

(آل عمران)

کا جب ذکر فرماتے تو کہتے کہ ساری دھمکیوں میں سب سے زیادہ جانگداز روح گسل دھمکی میرے لیے تو یہی ہے۔

عمیق حکیمانہ نفسیاتی نکتہ

اس کے بعد یہ ارشاد فرماتے کہ کسی چیز سے محرومی کی دھمکی اسی وقت دی جا سکتی ہے جب اس کا مطالبہ ہمارے اندر موجود ہو، مجنوں ہی کو لیلیٰ دھمکا سکتی ہے کہ میں تجھ سے نہ بولوں گی، تجھے نہ دیکھوں گی ورنہ جو مجنوں نہیں ہے اس کے لیے لیلےٰ کی ان دھمکیوں کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ حاجی صاحبؒ کے متعلق میں نے سنا ہے کہ آب دیدہ ہو جاتے اور فرماتے کہ آدمی کی فطرت میں اگر کسی کی ہمکلامی اور نظر لطف و کرم کا مطالبہ پوشیدہ نہ ہوتا تو یقین کرو کہ اس کو یہ دھمکی کبھی نہ دی جاتی۔

اس نفسیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اب سوچئے کہ حج کی قدر و قیمت کے نہ پہچاننے والوں اور اس کی اہمیت کے انکار کرنے والوں کی طرف رخ کر کے بجائے اس قسم کی باتوں کے کہ ان کا ٹھکانا جہنم میں ہوگا، یا ان کو آگ میں جھونکا جائے گا۔ یا اسی قسم کی مادی سزاؤں کی جگہ

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔ — اور جس نے ناشکری کے ساتھ انکار کیا (اسکو معلوم ہونا چاہیئے) کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔

کے چند قرآنی الفاظ کیا اس ساری داستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نہیں ہیں جو اس سلسلے میں اب تک آپ ہم سے اور بزرگوں کے حوالہ سے سن چکے، ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے شاید نہ کہہ سکے، لیکن قرآن نے ان چند ہی لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا، ان سے کہدیا جو سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں، لیکن بے نیازی اور لا پرواہی کی یہ دھمکی ان کو ان کی

روح اور جان کو پگھلا دینے کے لیے کافی ہے "چشم لاپروا" اور "نظر تغافل" کی بھڑکائی ہوئی آگ اور بھڑکتے ہوئے انگاروں میں لوٹنے کا موقع جنہیں خدانخواستہ کبھی مل چکا ہے وہی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ "ان اللہ غنی عن العالمین" کی دھمکی کس مہیب جگر خراش منظر کو سامنے لاکر (العیاذ باللہ) کھڑا کر دیتی ہے۔

صحاح کی مشہور حدیث جس میں جتلایا گیا ہے کہ "قابو رکھنے کے باوجود حج کی سعادت سے جو محروم رہا اور اسی حال میں مر گیا خدا کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر" اس میں حج کی وہی روح جھانک رہی ہو جس کے بغیر یہ تو ممکن ہے کہ "حج" کا قالب تیار کر لیا جائے لیکن اس "روح" سے بے گانگی "قلب" سے اس "قالب" کو محروم رکھے گی۔

"روح" "حج" سے بیگانگی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جماعت اور جمعہ وعیدین کی نمازوں کے ساتھ حج کا رشتہ جوڑتے ہوئے آج کل پھیلایا جا رہا ہے کہ روزانہ اور ہفتہ واری، سالانہ کمیٹیوں کے ساتھ اسلام نے مسلمانوں کے اجتماع عام کی کمیٹی یا کانفرنس کی تشکیل کی ایک عملی صورت حج کے ذریعہ سے نکالی ہے۔ رسیان بافوں نے تو نہ جاننے کی وجہ سے اس لال بجھکڑانہ توجیہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، پر حیرت ہے کہ آسمان والوں نے بھی جاننے کے باوجود ان ہی کے ساتھ اپنی آواز ملانی شروع کی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انسانیت کا جو بے نظیر طوفان ہر سال حجاز کے ریگستانوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہے یقیناً بے نظیر کہ زمین کے کسی حصے میں مختلف ممالک و امصار سے بھانت بھانت کی بولیوں کے بولنے والے مرد و زن اس خاص شان کے ساتھ کہیں بھی جمع نہیں ہوتے، حج ہی کا موسم ایک واحد موسم ہے جس میں ایک ہی میدان میں آپ مشرق بعید چین و جاوہ ملایا کے باشندوں کے ساتھ مغرب اقصیٰ کے گورے چٹے آدمی ملی جلی شکلوں میں ہر سال مل سکتے ہیں، ان ہی میں آپ کو ہندی و سندی، بخاری و تاتاری، مصری و طرابلسی، الغرض ایشیا، اور افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کو بھی آپ پا سکتے ہیں، اور ان سب کو جمع کر کے کسی خاص نصب العین تک پہونچنے کی دعوت بھی دے سکتے ہیں۔ بغیر کسی اشتہار و اخبار، پروپگنڈا، شور و شغب کے بکھری ہوئی انسانیت ہر سال ایک نقطہ پر جمع ہو جاتی ہے، آپ چاہیں تو معاشرتی، تمدنی، بلکہ ضرورت ہو تو سیاسی الجھنوں کے سلجھانے کا ذریعہ بھی اس اجتماع کو بنا سکتے ہیں، لیکن کام لینا، یا لے سکنا یہ دوسری بات ہے اور جس کام کے لیے حج کی عبادت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہو یہ الگ مسئلہ ہے، آپ آم کی گٹھلی جب بوتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درخت بن جانے کے بعد آپ اس درخت کے پتوں، اور لکڑیوں سے ایندھن کا کام بھی لے سکتے ہیں، لیکن بجائے پھلوں کے ایندھن میں پتوں اور لکڑیوں سے کام لینے کو گٹھلی بونے کی غایت ٹھہرانا، آپ ہی بتائیے کہ جنون کے سوا اور کیا ہے، سیدنا المعنوی نے سچ فرمایا ہے۔

ہر کہ کارد قصد گندم بایدش
کاہ خود اندر تبع می آیدش

گیہوں کی کاشت تو دانۂ گندم کے فراہم کرنے ہی کے لیے کی جاتی ہے، اور طفیل میں اس کے پتوں اور ڈنٹھلوں کو چور کر کے بھوسہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن بھوسہ ہی حاصل کرنے کے لیے آجتک کسی نے گیہوں کی کاشت کی ہے؟ بقول حکیم الامت تھانوی نوراللہ ضریحہ "اسلامی عبادات" کی فلاسفی نکالنے کا عصری طریقہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ عرق گلاب کے قرابوں کا کبھی استعمال استنجا بتا دیا جائے، فرمایا کرتے تھے کہ اپنی مائیت اور صفت سیلان کی وجہ سے ازالۂ نجاست کا کام یقیناً گلاب کے اس عرق سے بھی اگر چاہا جائے آ لیا جا سکتا ہے، لیکن اسی کو عرق گلاب کے وجود کی غائت ٹھہرانا عقلی گندگی اور ذہنی خباثت کے سوا اور کیا ہو؟

اور میں تو کہتا ہوں کہ دین میں ان عبادات عناصر کے شریک کرنے کی جو واقعی غرض وغائت ہے اس کے ساتھ اپنی من مانی خود غرضیوں کے حصول کا ذریعہ ان کو بنا لینا، ممکن ہے کہ بعض حالات میں مضر نہ ہو، بلکہ مفید ہی ہو مگر مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں نے کبھی کبھی خطرناک نتائج کو بھی پیدا کر دیا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، ذکر یہ ہو رہا تھا کہ حج اور اس کے اعمال و اشغال کی تجزیہ و تحلیل ہی سے نہیں بلکہ خود قرآنی الفاظ کے اشاروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسانی میں حسن و جمال کی جستجو و تلاش کا جو جبلی جذبہ ہے اسی جذبہ کے صحیح استعمال کی راہ حج کے ذریعہ کھولی گئی ہے، اسی حسن و جمال کے لازوال سرچشمے سے، ربط قائم کرنے کی یہ حکیمانہ تدبیر ہے۔ --------

---

دجّالی فتنہ

اور

سورۂ کہف

اس مضمون میں عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے کہیں
کہیں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں تقدم و تاخر، تبدیلی یا
اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تصرف صرف لفظی ہے معنوی بالکل نہیں۔
اور اس کو ممتاز کرنے کے لیے اس [ ] علامت کے اندر
کر دیا گیا ہے، دو چار جگہ توضیحی حواشی لکھے گئے ہیں ان
کے آخر میں بھی "مرتب" یا "ع" لکھ دیا گیا ہے۔ علی ہذا مضمون
کی، مختلف عنوانات میں تقسیم اور تمام بغلی سرخیاں یہ سب بھی
مرتب کی جانب سے ہو، اس میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کا ذمہ دار
وہی ہے۔

—— مرتب

مقدمہ

مشہور حدیث جو ابوداؤد، مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد، بیہقی وغیرہ محدثین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال کے فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہو، اس کو چاہیے کہ سورہ کہف کی ابتدائی یا خاتمے کی آیتوں کی تلاوت کرے۔ بعض روایتوں میں ابتدا یا خاتمہ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ مطلقاً سورہ کہف کی دس آیتوں کی تلاوت، پڑھنے والوں کو دجال کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری، ابو درداء، ابن عمر، ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) صحابیوں سے الفاظ کی کمی و بیشی کے ساتھ مندرجہ بالا کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ سورہ کہف کے مضامین کا دجال کے فتنے سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہے۔ آئیے نبوت کے اسی اشارہ کی روشنی میں اس سورہ کے مشمولات پر غور کریں۔ مجھ سے پہلے بھی بعض بزرگوں اور عزیزوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے، کچھ حرج نہیں کہ افادات سابقہ کے ساتھ جو کچھ اس وقت پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ ممکن ہے کہ قرآن کی اس خاص سورہ کو سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد ان معروضات سے بھی مل جائے۔ پہلے بطور مقدمہ کے چند تمہیدی باتیں سُن لیجئے۔

موضوع بحث "المسیح الدجال" کی شخصیت اور حقیقت سے بحث نہیں، یہ ایک مستقل جداگانہ مسئلہ ہے، یہاں مقصود صرف وہ "فتنہ" ہے جسے "المسیح الدجال" کی طرف پیغمبرانہ پیشین گوئیوں میں منسوب کیا گیا ہے۔

دجال کی علامات دجال کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا ہوگا، یا کتابوں میں جن چیزوں کا انتساب اس کی طرف کیا گیا ہے سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد کلی تعبیر ان کی یہی ہو سکتی ہے کہ بعض قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار اس کو بخشا جائے گا۔ مثلاً مسافت یعنی مکانی فاصلوں کو صفر کے درجہ تک گویا اس کے زمانے میں پہونچا دیا جائے گا۔

تیز رفتاری اس کی تیز رفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "جیسے بارش کو تیز آندھی اُڑائے لیے جاتی ہو" کچھ

یہی صورت اس کی رفتار کی ہوگی[۱] صحیح مسلم کے الفاظ "کالغیث استدبرتہ الریح" کا مطلب یہی ہے، اور یہ کہ کرۂ زمین کے ملکوں اور شہروں میں نہیں بلکہ ایشیا، افریقہ، یورپ و امریکہ وغیرہ کے ایک ایک گاؤں تک رسائی اس کی کل چالیس دن میں ہوجائے گی، نواس بن سمعان والی روایت کے الفاظ "فلا تدع قریۃ الا ھبطہا فی اربعین لیلۃ" (مسلم) سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

مشرق سے مغرب تک آواز کی رسائی

اور یہ حال تو اس کی تیز رفتاری کا ہوگا [آواز کی رسائی کا حال سنئے!] حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کنز العمال میں جو خطبہ منسوب کیا گیا ہے، اس میں آئندہ پیش آنے والے حوادث کے سلسلہ میں آپ نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ بھی فرمایا تھا کہ

ینادی بصوت لہ یسمع بہ ما بین الخافقین — پکارے گا دجال ایک ایسی آواز سے جسے خافقین (مشرق و مغرب) کے درمیان رہنے والے سنیں گے۔

(خلاصہ کنز العمال ج ۲ ص ۵۳، بر مسند احمد)

جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف رفتار، بلکہ "آواز" کے سلسلہ میں بھی فاصلہ کا مسئلہ دجال کے زمانہ میں غیر اہم ہو کر رہ جائے گی۔ اسی کتاب میں مستدرک حاکم کے حوالہ سے عبداللہ بن عمرو کی ایک روایت دجال ہی کے متعلق جو پائی جاتی ہو۔

---

[۱] آج لوگوں کے سامنے ہوائی جہاز کی شکل میں جو سواری آچکی ہو ان کے لیے نبوت کی بیان کی ہوئی اس تشبیہ کے سمجھنے میں شاید کچھ دشواری نہ ہوگی، باقی اسی سلسلے میں دجال کے گدھے کا عام چرچا عوام میں جو پھیلا ہوا ہے، اس میں شک نہیں کہ عام شہرت اس گدھے کو ضرور حاصل ہوگئی ہے۔ لیکن صحاح کی کتابوں میں دجال کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس کو اس گدھے کے ذکر سے ہم خالی پاتے ہیں۔ البتہ ابن عساکر وغیرہ کی ایسی کتابیں جن کی روایتوں کا معیار صحت بہت کچھ بحث طلب ہے، ان میں حمار کے لفظ سے ضرور دجال کی سواری کا ذکر آیا ہے۔ مگر آگے جو تشریحی صفات اس حمار گدھے کے بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہی کہ اس گدھے کے دونوں کانوں کے بیچ کا فاصلہ اسّی ہاتھ ہوگا یعنی ۴۰ باع ہوگا۔ اور حضرت علی کے خطبہ میں تو اس گدھے کے ایک ایک کان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ تیس تیس ہاتھ کے برابر ہوں گے، اور اس سے بھی عجیب تر اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اس گدھے کی ایک ٹاپ کا فاصلہ دوسرے ٹاپ سے اتنا طویل ہوگا کہ عام حالات میں اس فاصلہ کو لوگ ایک دن اور ایک رات یعنی ۲۴ گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں الفاظ عربی کے یہ ہیں "ابین حافر حمارہ الی الحافر الآخر مسیرۃ یوم ولیلۃ" (ج ۲ ص ۵۳ خلاصہ کنز) ایسی صورت میں گدھے والی روایتوں کی صحت اگر تسلیم بھی کرلی جائے جب بھی "حمار" کے لفظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے دجال کے گدھے کی حقیقت یقیناً اس سے مختلف ہو، یہ بظاہر تفہیم کا یہ ایک تمثیلی طریقہ معلوم ہوتا ہے، ورنہ ہمارے سامنے جو گدھے ہیں ان میں یہ خصوصیتیں کہاں مل سکتی ہیں، آج مچھلی کی شکل ہوائی جہازوں کی بنائی جاتی ہے، اگر کبھی گدھے کی شکل یا قالب ان ہی کو عطا کر دیا جائے تو کیا تعجب ہے؟۔

اس میں بھی ہے کہ "دجّال کی آواز کو مشرق و مغرب کے باشندے سُنیں گے"۔ (ص ۲۲ کنز)

علاج و معالجہ کی قوتیں اسی طرح روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ علاج و معالجہ کے طریقے ترقی کر کے اس حد تک پہونچ جائیں گے کہ الاکمہ (مادر زاد اندھوں) الابرص (کوڑھی) تک کو چنگا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ (کنز ص ۲۲ ج ۲)

دریاؤں اور ہواؤں پر قابو یہ بھی بیان کیا گیا ہو کہ "سخرت لہ انھار الارض" (یعنی زمین پر بہنے والے دریاؤں اور نہروں پر بھی اس کو قابو عطا کیا جائے گا، جس سے معلوم ہوا کہ سیرابی کے ذرائع میں غیر معمولی ترقیاں رونما ہوں گی۔ اسی کے بعد ہے "و آثارھا" یعنی زمین کی پیداواروں پر اس کو قابو بخشا جائے گا، ظاہر ہے کہ سیرابی کے ذرائع پر قابو یافتہ ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے، اور یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مون سونی (برساتی ہواؤں) سے بھی کام لینے کی تدبیر اس پر منکشف ہو جائے گی، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

یامر السماء فتمطر والارض فتنبت (ج ۲ ص ۳۰ کنز برسند)	بادل کو حکم دے گا تو برسنے لگے گا، اور زمین کو حکم دے گا تو اگانے لگے گا۔

معدنیات پر اقتدار اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نباتاتی پیداواروں کے سوا زمین کے پیٹ کے معدنی ذخیروں کو بھی برآمد کرنے میں غیر معمولی کرشموں کا دجّال اظہار کرے گا، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

ویمر بالخربۃ فیقول لھا اخرجی کنوزک فتتبعہ کنوزھا (ج ۲ ص ۳۰ کنز)	اُجاڑ زمینوں پر گذرے گا اور کہے گا کہ نکال اپنے ذخیروں کو بس یہ ذخیرے اس کے پیچھے ہو لیں گے۔

احیاء موتیٰ اور ان ہی روایتوں میں دجال کی طرف جو یُحی الموتیٰ (یعنی وہ مردے کو زندہ کرے گا)، کے الفاظ منسوب کیے گئے ہیں اُن سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کی بھی قدرت اس میں پیدا ہو جائے گی، یہ بھی ہو کہ مردے کو زندہ کر کے دکھائے گا بھی، صحاح میں ہے کہ ایک زندہ آدمی کو چیر کر رکھ دے گا اور پھر دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر اسی کو زندہ کرے گا۔

مردوں سے مکالمہ اور کچھ قصہ اسی نقطہ پر ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ روایتوں کے اس حصے پر بھی غور کیجئے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال لوگوں کو ایک کرشمہ یہ بھی دکھائے گا کہ "بعض خبیث روحیں یعنی شیاطین لوگوں کے سامنے نمودار ہو کر کہیں گے کہ ہمارا یہ نام ہے، اور تمھارے ہم مرے ہوئے باپ، یا مری ہوئی ماں، یا دوسرے عزیز ہیں"۔ الفاظ روایت کے یہ ہیں کہ

ویبعث معہ الشیاطین علیٰ صورۃ من قد مات من الآباء والاُمہات والاخوان والمعارف فیاتی احدھم	اور اٹھائے جائیں گے دجال کے ساتھ بعض شیاطین ان لوگوں کی شکلوں میں جو مر چکے ہیں۔ یعنی باپ، ماں، بھائی اور جانے پہچانے لوگ

الیٰ ابیہ او اخیہ فیقول الست فلانا الست تعرفنی

پھر کوئی اپنے باپ یا بھائی کے پاس آئے گا، تب وہی پوچھے گا کہ میں فلاں آدمی کیا نہیں ہوں، کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟

(کنز ص۳)

بعض روایتوں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ

"دجال کے ساتھ کچھ شیاطین ہوں گے جو مردوں کی سی شکل بنا کر زندوں سے کہیں گے کہ مجھے تم پہچانتے ہو، میں تمہارا بھائی یا تمہارا باپ یا تمہارا فلاں رشتہ دار ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ ہم مر چکے ہیں۔" (صفحہ ۱۱)

الغرض اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ مردوں کے ساتھ زندوں کا تعلق پیدا کرانے کا دعویٰ بھی اسی طریقہ سے کیا جائے گا جیسے سنا جاتا ہے کہ یورپ و امریکہ میں آج کل مردوں کو حاضر کرانے اور ان سے مکالمہ کے مواقع ان مردوں کے زندہ عزیزوں کے لیے اسپرچولزم والوں کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابو سعید الخدری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے مسند احمد میں دجال ہی کے متعلق ایک طویل حدیث پائی جاتی ہے جس کا ایک جزء یہ بھی ہے۔

"دجال کسی دیہاتی سے کہے گا کہ تمہارے ماں باپ کو زندہ کر کے میں کھڑا کر دوں تو تم مجھے اپنا رب مانو گے؟ دیہاتی کہے گا کہ اچھا ایسا کر کے دکھاؤ، تب دو خبیث روحیں اس دیہاتی کے سامنے اس کے ماں باپ کی شکل اختیار کر کے نمایاں ہوں گی اور دیہاتی سے کہیں گی کہ اے میرے بیٹے تم دجال کا ساتھ دو اور اس کی پیروی کرو، یہی تمہارا رب ہے۔" (صفحہ ۱۲ کنز العمال)

بہر حال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار جو دجال کو عطا کیا جائے گا وہ یہی یا اس قسم کی دوسری باتیں ہیں جن کی تفصیل دجال کی متعلقہ حدیثوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔

دجال کو دجال بنانے والی چیز

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے دجال کو دجال بنانے والا اس کا وہ طرز عمل ہوگا جو اپنے اس غیر معمولی اقتدار کے استعمال میں وہ اختیار کرے گا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو دجال بنا دے بلکہ پرانی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسل انسانی کے مقام خلافت کا اقتضا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا اسی اجمالی علم کی یہ تفسیر ہے، ماسوا اس کے کون نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی اقتدار بخشا گیا تھا، علوی اجرام یا سفلی اجسام کی تسخیر کی مثالوں سے ان کی زندگی معمور نظر آتی ہے، سمندر کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضرب سے پھٹ جانا، یا شق القمر کا معجزہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف منسوب ہے، خود قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اکمہ وابرص کو چنگا بھی کرتے تھے بلکہ مردوں کو زندہ کر کے بھی دکھاتے تھے۔ بہر حال پیغمبروں کی زندگی میں اس قسم کی چیزوں کی کیا کمی ہے، مگر پیغمبروں کو یہی اقتدار جب بخشا گیا تو اپنے ان اقتدارے جو کام وہ لیتے تھے، اس سے دنیا واقف ہو۔ یعنی اقتدار بخشنے والے قادر و توانا کے شکرے ان کے قلوب بھی معمور ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی خدائے بخشائندہ مہربان کی طرف کھینچتے تھے۔ تسخیری مظاہر کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے سامنے پاکر فرمایا کرتے تھے کہ

هذا من فضل ربي ليبلوني أأشكر ام اكفر ومن شكر فانما يشكر لنفسه ومن كفر فان ربي غني كريم۔

(النمل)

یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے، مجھے وہ جانچتا ہو کہ میں اس کا گن گاتا ہوں یعنی شکر کرتا ہوں، یا ناشکری کرتا ہوں، جو شکر کرتا ہے خود اپنے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے اسے معلوم ہو کہ میرے رب کی ذات سب سے بے پروا اور عظمت والی ہے۔

لیکن بالکل اس کے برعکس جیسا کہ سب جانتے ہیں دجال اپنے اقتداری کرشموں کو اقتدار بخشنے والے خدا سے خود باغی بننے اور دوسروں کو بھی خدا سے بیزار و باغی بنانے میں استعمال کرے گا۔ اس کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں ہوگی کہ عوام و خواص ہر ایک پر بشرطیکہ مومن ہو حدیثوں میں آیا ہے کہ پہلی نظر میں اس کے مشن کا یہ امتیازی نصب العین خود بخود واضح ہو جائے گا۔ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ مشہور روایت جو دجال ہی کے متعلق پائی جاتی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انه مكتوب بين عينيه ك ف ر يقرءه كل مومن كاتب او غير كاتب۔

دجال کی دونوں آنکھوں کے بیچ ک، ف، ر (کفر) لکھا ہوا ہوگا جسے ہر مومن پڑھ لے گا۔ خواہ وہ کاتب ہو یا غیر کاتب"

کاتب" یعنی لکھنے پڑھنے والے لوگ اور "غیر کاتب" یعنی نوشت و خواند کا سلیقہ جن میں نہ ہو کسی سے بھی دجال کی یہ خصوصیت مخفی نہ رہے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ کفر یعنی "ک، ف، ر" یہی دجالی تمدن و تہذیب کا امتیازی چھاپ ہوگا۔ ماحول ہی ایسا پیدا ہو جائے گا کہ دنیا بے ایمانی، الحاد، بے دینی کی شکار ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ "دجال کے دیکھنے کا موقع جسے مل جائے، اس کو چاہیے کہ اس سے دور ہی دور رہے" اسی کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ

فوالله ان الرجل ليأتيه وهو

تو اللہ کی قسم ہے کہ دجال کے پاس آدمی آئے گا

يحسب انه مومن فيتبعه مما يبعث به الشبهات (ابو داؤد وغیرہ)

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مومن ہو۔ مگر دلنے کے ساتھ ہی) اس کا پیرو بن جائے گا، جس کی وجہ وہ شبہے اور شکوک ہوں گے جو دجال سے ملنے کے ساتھ ہی پیدا ہو جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی غیر معمولی مہارت اس میں پائی جائے گی۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں کو بھی وہ متاثر کرے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

آخر من يخرج اليه النساء حتى ان الرجل ليرجع الى امه وابنته واخته و عمته فيوثقها رباطاً۔

دجال کے ساتھ آخر میں عورتیں بھی نکل پڑیں گی۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ آدمی اپنی ماں بہن بیٹی، پھوپھی کو اس اندیشے سے باندھے گا کہ کہیں دجال کے ساتھ نہ نکل پڑیں۔

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار کا غلط بلکہ قطعی معکوس استعمال یہی وہ "فتنہ" ہے جس میں المسیح الدجال خود بھی مبتلا ہو گا، اور کوشش کرے گا کہ اس کی بھڑکائی ہوئی، فتنے کی اس آگ میں دوسرے بھی جھونک دیے جائیں۔

دجال کی کرشمہ نمائیوں کے ذرائع؟

باقی یہ مسئلہ کہ اپنی کرشمہ نمائیوں میں وہ کن ذرائع سے کام لے گا؟ ظاہر ہے کہ جب تک "المسیح الدجال" خود دنیا کے سامنے نہ آجائے، اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیا سحر و جادو یا اسی قسم کے غیر مادی ذرائع پر اس کو قابو بخشا جائے گا۔

حافظ ابن حزم کا خیال

یا جیسا کہ حافظ ابن حزم محدث کا خیال ہے۔

انما هو حيل يتحيل بحيل معروفة كل من عرفها عمل مثله (الملل والنحل ج ۲ صـ ۱۲۱)

دجال حیلوں سے کام نکالے گا، ایسے حیلے جن کا علم جو بھی حاصل کرے گا وہی سب کچھ کر کے دکھا سکتا ہو جو دجال دکھائے گا

جس کا حاصل یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک دجال "حیل" سے کام لے گا، جو "حیلہ" کے لفظ کی جمع ہے۔ عام طور پر میکانکی طریقوں کی تعبیر عربی زبان میں "حیل" کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً جر ثقیل کے طریقوں کا ذکر "حیل" کے ذیل میں کرتے ہیں۔ "علم الحیل" نام ہی اس علم کا ہے جس میں میکانکی طریقوں سے چیزوں پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ اور یہی ابن حزم کا مقصود بھی ہے۔ انھوں نے دوسری جگہ "دجالی کرشموں" کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مثالوں سے "دجالی کرتبوں" کو سمجھانا چاہا ہے۔ مثلاً لکھا ہے کہ اس کی نوعیت ایسی ہو گی جیسے بعض لوگ مرغیوں کو ہڑتال کھلا کر دکھا دیتے ہیں کہ گویا مرغیاں مر گئیں، ان کی حس و حرکت غائب ہو گئی۔ پھر ان ہی مرغیوں کے حلق میں زیتون کا تیل

جب ٹپکاتے ہیں تو پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہیں۔ بھڑوں کے متعلق بھی اپنا ذاتی تجربہ نقل کیا ہے کہ پانی میں ان کو ہم ڈال دیا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب مر گئیں۔ پھر ان ہی مردہ بھڑوں کو دھوپ میں لاکر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیتے تو وہ زندہ ہو جاتی تھیں۔ اسی سلسلے میں اپنے وطن (اندلس) کے ایک آدمی محمد محرق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ بند کمرے میں یہ تماشہ دکھاتا تھا کہ کوئی دوسرا بولنے والا اس کمرے میں موجود نہیں ہے۔ لیکن بولنے کی آواز اسی کمرے میں گونجتی تھی، حافظ کا بیان ہو کہ اس کمرہ کی دیوار کے مخفی تگان میں نلکی لگی ہوئی تھی جس سے لوگ ناواقف تھے، اسی نلکی کے دوسرے سرے پر کمرے سے باہر بات کرنے والا بات کرتا تھا مگر محرق باور کراتا تھا کہ کسی بولنے والے کے بغیر اسکے سامنے آوازیں آتی ہیں۔ (الملل والنحل جلد ۱ صفحہ ۹)

راہِ صواب | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدیثوں میں بھی اس کی تصریح نہیں کی گئی ہو کہ "دجال" اس راہ میں کن ذرائع سے کام لے گا۔ نہ اس کی تصریح پائی جاتی ہے کہ سحر و شعبدہ وغیرہ سے وہ کام لے گا، اور نہ یہ بیان کیا گیا ہو کہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے ان کو اپنے قابو میں لائے گا۔

اور یہ قصہ کچھ دجالی کرشموں ہی تک محدود نہیں ہو۔ قیامت سے پہلے آئندہ پیش آنے والے جن واقعات کا حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہو، سب ہی کے متعلق یہ مناسب ہو کہ دیکھنے سے پہلے خواہ مخواہ اپنی طرف سے ان کے اسباب و علل کے متعلق فیصلہ نہ کر دیا جائے[۱]۔

ایک عاجلانہ فیصلہ | پچھلے دنوں بعض لوگوں نے عجلت سے کام لے کر یورپ و امریکا کے موجودہ تمدن و تہذیب کو دجالی

---

[۱] ۔ مثلاً روایتوں میں آتا ہو کہ یاجوج و ماجوج کے اچانک مر جانے اور ختم ہو جانے کے بعد جب زمین ان کی گندگیوں سے صاف ہو جائے گی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل ایمان کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر زمین پر آئیں گے تو بیان کیا گیا ہو کہ نشو و نما کی قوت زمین کی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ ایک ایک انار سے بڑی بڑی ٹولیاں سیر ہو جائیں گی، اور انار کا خول دانوں کے نکالنے کے بعد جو رہ جائے گا وہ اتنا بڑا ہوگا کہ یہی بڑی ٹولیاں اس کے سائے میں قیام کریں گی۔ ایک طرف اس خبر کو رکھیے اور دوسری طرف غور کیجیے ان تجربات پر جو جاپان میں ایٹم بم کے چلنے کے بعد کیے گئے، کہتے ہیں کہ جس علاقہ میں بم چلایا گیا تھا وہاں کی زمین میں جو چیزیں بعد کو بوئی گئیں تو اپنی مقدار میں حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا کہ وہ بڑھی ہوئی ہیں، شلجم، مولی وغیرہ کی جو جسامت اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہو، عام حالات میں اس کا باور کرنا مشکل ہو۔ علیٰ ہٰذا "دخان مبین" یعنی قرآن میں جس کھلے ہوئے دھوئیں کا ذکر ہو اور فرمایا گیا ہو کہ لوگ خدا کے متعلق جب شک میں کھیلنے لگیں گے اور ان کے پاس "رسول مبین" کھلا ہوا رسول جو آیا تھا اس پر معلم اور مجنون ہونے کا اتہام لگائیں گے (یعنی اس کو دوسرے مذاہب کے علماء سے باتیں سیکھ کر بیان کرتا ہو، یا اس کے دماغ میں فتور ہو) ان دونوں جرائم کی سزا میں دھمکی دی گئی ہو کہ تب کھلے ہوئے دھوئیں کا انتظار کیجیو۔ خاکسار نے اپنے ایک مضمون میں عرض کیا تھا کہ یورپ ان جرائم کا مجرم بھی ہو۔ اور آپس میں جن آتشیں ہتھیاروں سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تمدن و تہذیب قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی جو کر دیا کہ "المسیح الدجال" جس کی حدیثوں میں پیشین گوئی کی گئی ہے وہ آگیا اور اب مسلمانوں کو "دجال" کے انتظار کی زحمت نہ کھینچنی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ بھی زود فکری اور زود بیانی کے عارضہ کا نتیجہ تھا، اور اب بھی جن لوگوں کو اس خیال پر اگر اصرار ہو تو سمجھنا چاہیے کہ زود فکری کے مرض سے وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں۔

یورپ اور امریکا میں ابھی دجال کی علامات پوری طرح موجود نہیں ہیں

یہ صحیح ہو کہ قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ و امریکا والوں کا مسلسل قائم ہوتا چلا جا رہا ہو اور اپنے اس اقتدار کو ان ممالک کے باشندے بھی ان ہی "دجالی اغراض" میں جیسا کہ دیکھا جا رہا ہو استعمال کر رہے ہیں۔" ک۔ ن۔ "یعنی کفر و الحاد یا خدا سے بیزاری یا انحراف موجودہ مغربی تہذیب کا ایسا عام چھاپ ہے، جسے ہر جاہل و عالم بشرطیکہ ایمان کی کوئی کرن اپنے اندر رکھتا ہو، جانتا اور پہچانتا ہو، خالق کی مرضی کے مطابق اس کے بندوں کے آگے زندگی کا جو نظام خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے اس نظام زندگی سے پژمردگی اور افسردگی پیدا کرنے میں آج یورپ جن چابکدستیوں سے کام لے رہا ہو ان کو دیکھتے ہوئے نبوت کی وہ پیشین گوئی سمجھ میں آتی ہے کہ مومن دجال کے پاس جائے گا، لیکن جب واپس لوٹے گا تو طرح طرح کے شکوک و شبہات کی چنگاریاں اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پائے گا، یہ بھی دیکھا جا رہا ہو کہ مردوں سے متجاوز ہو کر عورتوں کو بھی فتنہ کی یہ آگ گھیرتی چلی جا رہی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسپرچولیزم کے شیطانی تجربات کے دعوے پیش کر کے اس معیار ہی کو یورپ والوں نے چاہا ہے کہ مشتبہ کر دیں، جس پر مذاہب و دیانات کے سلسلہ میں حق و باطل کو جانچا جا سکتا تھا، اگر واقعی یہ مان لیا جائے کہ جن مخفی روحوں سے مکالمہ کا ادعا اس طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے یہ شیاطین نہیں بلکہ گزشتہ مرے ہوئے لوگوں کی واقعی روحیں ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ مرنے کے بعد والی زندگی کی بھلائی اور برائی، خیر و شر کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جن کے ساتھ خیر و شر کے نتائج کو مذاہب وابستہ قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ گو صاف صاف واضح لفظوں میں خدائی کا دعویٰ یورپ کی طرف سے ابھی دنیا کے سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن جس فطری رفتار کا لوگوں کو اس زمانے میں عادی بنا دیا گیا ہے، اس رفتار کا آخری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو رہا ہے کہ بجائے خدا کے سب سے آخری اقتداری قوت کائنات کی بنی نوع انسانی ہی کو تسلیم کر لیا جائے، مسئلہ ارتقاء جو مغربی طریقۂ فکر کی نمایاں خصوصی راہ ہو وہی اسی نتیجہ تک سوچنے سوچنے والوں کو پہنچا دیتا ہے، بلکہ انسانوں میں بھی چونکہ آج ہر قسم کی طاقتوں اور قوتوں کا مرکز یورپ و امریکا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہو کر تباہ ہوا ہو (اگر غور کیا جائے تو قرآن میں) "دخان" یعنی دجال مشترک نظر آئے گا، اور یہ ہم ہیں کہ تو دنیا کو "مبین" بنا کر دکھا دیا ہے اس سے دنیا واقف ہے۔"

ہی بنا ہوا ہے، اس لیے "مغرب" کے لفظ کا اطلاق خواہ مغربی تہذیب و تمدن کے نمائندوں پر نہ کیا جائے، لیکن خدا اگر اس طاقت کا نام ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے، تو آج ان دلوں کو چیر کر دیکھئے جو مغربی تمدن کے زیر اثر ہیں یہی عقیدہ اور احساس باہر نکل آئے گا کہ یورپ امریکا والوں سے بڑا کوئی نہیں ہے ان ہی پر سارے کمالات کی انتہا ہوتی ہے، جو کچھ اس تہذیب و تمدن کے متعلق لکھا پڑھا جاتا ہے اور جس قسم کی گفتگو یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ کے متعلق عوام و خواص کی مجلسوں میں کی جاتی ہے، رسالوں، اخباروں، سنیماؤں اور تھیٹروں میں جو کچھ سنایا اور دکھایا جاتا ہے شعوری و غیر شعوری طور پر یہی اثر ان سے دماغوں اور دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جا رہا ہے، کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

مگر بایں ہمہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کھلے اور صاف لفظوں میں خدائی کا دعویٰ بھی ابھی نہیں کیا گیا ہو اور قوانین قدرت پر بھی ان کا اقتدار بلندی کے اس نقطہ تک ابھی نہیں پہونچا ہے جس پر حدیثوں میں بیان کیا گیا ہو کہ "المسیح الدجال" کی نادرہ نمائیاں پہونچ جائیں گی، اس کی کوشش جیسا کہ سنا جاتا ہے ان ممالک میں ہو رہی ہو کہ مردوں کو زندہ کرنے کا راز بھی دریافت کر لیا جائے۔ ایسی خبریں بھی کبھی کبھی آجاتی ہیں کہ بعض حیوانوں بلکہ شاید انسانوں کے متعلق احیاء موتی (مردوں کو زندہ کرنے) کا عمل کامیاب ہو چکا ہے، یہ بھی سننے میں آتا ہو کہ بادلوں پر بھی قریب ہو کہ قابو پا لیا جائے گر انصاف کی بات یہی ہے کہ صحیح کامیابی جیسی کہ چاہیے اس راہ میں مغرب کی جدید تہذیب اور ارتقائی و صنعتی کوششوں کو ابھی نہیں ہوئی ہے، اور اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ و اسباب ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ نبوت کی پیشین گوئیوں میں جس "المسیح الدجال" کا ذکر جن خصوصیتوں کے ساتھ کیا گیا ہو، اس کے خروج و ظہور کا دعویٰ ابھی قبل از وقت ہو۔

ہاں! اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج کی زمین تیار کر رہا ہے۔ کیونکہ اپنی اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ میں بھی لیا جا رہا ہے، جس میں "المسیح الدجال" اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرے گا، خدا بے زاری یا خدا کے انکار کو ہر دلعزیز بنانے کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے، لیکن بجائے خدا کے خود اپنی خدائی کے اعلان کی جرأت اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے، "المسیح الدجال" اسی قصے کی تکمیل کر دے گا۔

خروج دجال کا دعویٰ تو ابھی قبل از وقت ہو مگر دجالی فتنہ کی ابتدا ہو چکی ہو

کچھ بھی ہو، صحیح اور صاف جنچی تلی ہوئی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی، یہی ہو کہ "المسیح الدجال" کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہو، مگر "المسیح الدجال" جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا، اس فتنہ کا ظہور کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہیے کہ ہو چکا ہے، دوسرے لفظوں میں چاہیئے تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو یا نہ آیا ہو، لیکن "دجالیت"

کی آگ یقیناً بھڑک چکی ہو، آخر حدیثوں ہی میں یہ بھی تو آیا ہو کہ "المسیح الدجال" سے پہلے "دجاجلہ" کا ظہور ہوگا بعض روایتوں میں ان کی تعداد تیس اور بعض میں ستر چھیتر تک بتائی گئی ہے "دجال" سے پہلے ان "دجاجلہ" کی طرف "دجالیت" کا انتساب بلاوجہ نہیں کیا گیا ہو، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" جس فتنے کو بیدار کرے گا، کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے پیدا ہونے والے "دجاجلہ" دنیا کو مبتلا کریں گے۔

سورۂ کہف ہر دجالی فتنہ کے لیے تریاق ہے

اسی بنیاد پر میرا خیال ہو کہ "المسیح الدجال" کے زہر کا علاج جیسے بتایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہو، اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر "دجالی فتنے" کے زہر کا ازالہ بھی اسی سورہ کی آیتوں اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں، ان میں تلاش کیا جا سکتا ہو۔

موجودہ دجالی فتنہ اور سورۂ کہف

چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آچکی ہے اور آتی چلی جارہی ہے دجالی جراثیم، کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہو سرچشمہ بنی ہوئی ہو، تقریباً وہی فتنے جن کے ظہور کی خبر "المسیح الدجال" کے عہد میں دی گئی ہو، یورپ کی اس تہذیب و تمدن سے ابل رہے ہیں

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فقیر نے سورۂ کہف کے مضامین اور مشتملات میں جب غور کیا تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ شاید دوسروں کو بھی اس سے کچھ فائدہ ہو ان کو قلم بند کر لیا گیا۔ آج ان ہی کی اشاعت کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

دجالی فتنہ، جسے چاہیں تو آپ "ہماری تہذیب و تمدن" بھی کہہ سکتے ہیں، اس فتنے کے نمایاں خط و خال، آثار و لوازم آپ کے سامنے پیش ہو چکے، اگر ان نشانیوں اور علامتوں سے آپ اس فتنے کو پہچاننے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، تو اس کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کے ان اشاروں سے انشاء اللہ مستفید ہونے کی صلاحیت آپ میں پیدا ہو چکی ہوگی جو آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

—— (۱) ——

سورۂ کہف کے مضامین کی اجمالی فہرست

سورۂ کہف کے مشتملات اور مضامین کی اجمالی فہرست کا پہلے جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہے۔

۱۔ ابتدائی رکوع اور خاتمہ کی رکوع میں چند کلیاتی اشارے پائے جاتے ہیں، جیسا کہ انشاء اللہ معلوم ہوگا، دجالی فتنے سے ان اشاروں کا کافی گہرا تعلق ہے۔

---

[۱] حمار عربی میں گدھے کو کہتے ہیں: "المسیح الدجال" کی طرف جس گدھے کا انتساب کیا گیا ہے، روایۃً و درایۃً اس کا حال جو کچھ بھی ہو وہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اسی کے ساتھ اگر اس کو بھی سوچا جائے کہ تمدن جدید کے ائمۂ اجتہاد کارل مارکس کو سب سے بڑی کارفرما جو انسانی قوت انسانی جدوجہد میں پیٹ اور پیٹ کے تقاضے جو نظر آئے ہیں، اور اسی کے ساتھ فرائڈ نے "جنسی میلان" کی نشان دہی، بنی آدم کی ساری تگ و دو میں جو کی ہو، ان دونوں نظریات کو اگر ملا لیا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ انسانیت جن جذبات کی رو میں تمدن جدید کے ان محققوں کو بہتی نظر آتی ہے ان کی مثالی صورت کے لیے گدھے کے قالب سے بہتر قالب شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ آخر شکم پروری اور خر نفسی کے سوا غریب گدھا اور بھی کچھ ہے؟ عہد جدید کا انسان جب ان ہی دو کارفرما قوتوں کی سواری پر سوار ہو کر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے، کد و کاوش، جد و جہد کے تمام شعبے چھوٹے پیمانے پر ہوں یا بڑے پیمانے پر، جب ان ہی دو محرک قوتوں کے زیر اثر گردش کر رہے ہیں، نسل انسانی کی ساری اچھل پھاند جب ان ہی دونوں جذبات سے زور حاصل کر رہی ہے تو گدھے کی سواری کے سوا "المسیح الدجال" کی ران کے نیچے آپ ہی بتائیے کہ اور نظر ہی کیا آتا، سوار جب خود کہہ رہا ہو کہ میں گدھے پر سوار ہوں، تو دیکھنے والوں نے کیا غلطی کی جب اس کو گدھے پر سوار دیکھا۔ ۱۲

۲۔ ان کلیاتی اشاروں کے سوا چند قصص اور حکایتیں ہیں۔ یعنی اصحاب کہف کا قصہ، لدنی (خدا کے حضور سے علم و رحمت پانے والی ایک شخصیت سے موسیٰؑ کی ملاقات، ذوالقرنین کا قصہ (اسی قصہ کے ضمن میں یاجوج و ماجوج کا ذکر بھی پایا جاتا ہے) دو آدمیوں کی مثالی سرگذشت اور مکالمہ جن میں ایک کے قبضے میں قدرتی پیداواروں کے حصول کے بڑے اہم ذرائع و وسائل تھے اور دوسرے کا دامن ان ذرائع و وسائل سے خالی تھا۔ دنیا کی موجودہ پست زندگی کی ایک تمثیل آدمؑ اور شیطان کے قصے کا اعادہ بعض جدید اضافوں کے ساتھ۔

ان قصص کی نوعیت اور مقصد بیان

ان تمثیلی قصص و حکایات کو بیان کرتے ہوئے، بعضوں کے شروع میں تو صراحتہً یہ کہہ دیا گیا ہو کہ اس کا ذکر بطور مثال اور نمونہ کے لوگوں کے سامنے کیجئے۔ مثلاً فرمایا گیا ہو:۔ واضرب لھم مثلا رجلین (اور بیان کر بطور مثال کے دو آدمیوں کا حال الخ) یا دنیا کی اس پست زندگی کی مثال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔ واضرب لھم مثل الحیٰوۃ الدنیا (اور بیان کر ان کے لیے اس پست زندگی کی مثال) اور بعضوں میں اس کی تصریح تو نہیں کی گئی ہو، مگر سباق و سیاق، اور قرآن کے شیوۂ بیان کے جو مذاق شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ محض کسی گذرے ہوئے واقعہ کا دہرانا، یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل و تمیز کا مضحکہ ہے، اسی لیے قرآنی قصص و حکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری شغلہ ہے۔

قرآن کا عام دستور

قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف ان ہی اجزاء کا وہ انتخاب کر لیتا ہو جن سے کسی خاص مقصد کے ذہن نشین کرانے اور سمجھانے میں مدد ملتی ہو، نہ صرف گذرے ہوئے واقعات و حوادث بلکہ جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا اور ایک عالمگیر تاریخی انقلاب کے متعلقہ حوادث مسلسل یکے بعد دیگرے پیش آتے چلے آ رہے تھے، ان کے ذکر کی بھی ضرورت کہیں اگر پیش آگئی ہے تو اس وقت بھی حسب دستور ذکر کے لیے ان ہی اجزاء کو اس نے چن لیا ہے جن سے اس خاص مقام میں کسی قسم کا تفہیمی کام وہ لینا چاہتا تھے۔ بدر و احد، فتح مکہ، جیسے اہم فیصلہ کن معرکوں کا تذکرہ آپ کو قرآن میں اگر ملے گا بھی تو اسی نوعیت کے ساتھ جو میں نے عرض کیا۔ ورنہ بعض اہم واقعات مثلاً شعب ابی طالب میں نظر بندی، ہجرت حبشہ، فتح خیبر اور اذیں قبیل بیسیوں چیزیں اسی سلسلے کی ایسی ہیں کہ اُن کے ذکرے ہم قرآن کو خالی پاتے ہیں، یا ذکر ملتا بھی ہے تو اتنا مجمل کہ جب تک واقعہ کی تفصیلات کا علم نہ ہو۔ ان اجمالی اشاروں سے واقعہ کا علم نہیں ہو سکتا، اور یہی اس کی وجہ وہی ہے کہ قرآن نہ قصے کہانی کی کوئی کتاب ہو اور نہ وہ کوئی تاریخی یادداشت یا ریکارڈ ہے، اس کا ایک متعین موضوع ہے۔ اس

لہ یعنی جس کی استدعا "اھدنا الصراط المستقیم" کی دعا میں کی جاتی ہے، وہ سیدھی راہ جس پر چڑھ کر انسانیت قدرت اور اس کے قوانین سے وفاق تعلق پیدا کر لیتی ہو، قرآنی تعبیر جس کی "انعام" کے لفظ سے کی گئی ہے۔

لیے اس کے سارے مباحث اسی ایک موضوع کے گرد گردش کرتے ہیں، اسی موضوع خاص کے لیے جہاں جہاں مناسب تھا، بعض گذرے ہوئے واقعات اور قصص کا بھی اس نے ذکر کیا ہے مگر اسی التزام کے ساتھ، یعنی صرف اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے جس کی اس خاص مقام میں ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے آپ پائیں گے کہ ایک ہی قصہ کا افادہ مختلف مقامات میں مختلف طریقوں سے قرآن میں جو کیا گیا ہو تو کہیں نسبتاً تفصیل و بسط کا رنگ پایا جاتا ہے، اور کہیں اسی قصے کے کسی خاص جز کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔

قرآن کے اس اسلوب کی ایک مثال

مجھے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہڈی" جیسے ایک ہی ہوتی ہے، مگر جسدی نظام میں وہی "ہڈی" کسی جگہ کافی طویل و عریض نظر آتی ہے، اور دوسری جگہ بھی ہڈی ہی ہوتی ہو مگر ایک انچ ڈیڑھ انچ سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی، کچھ یہی طریقہ قرآنی قصص کے استعمال میں اختیار کیا گیا ہے [یا یوں سمجھئے کہ] ایک ہی لکڑی ہوتی ہے، بڑھئی مختلف پیمانوں پر اسی ایک لکڑی سے ٹکڑے بنا بنا کر اپنی اپنی جگہ پر ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو فٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآنی قصص کے متعلق، قرآن پڑھنے والے اس خاص نقطۂ نظر کو اگر سامنے رکھیں گے تو ان پر قرآن کا ایک عجیب و غریب اعجازی نظام واضح ہو گا۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہو کہ سورۂ کہف کی ان قصص و حکایات کی تاریخی تحقیق یعنی کہاں کب یہ واقعات پیش آئے، تاریخی آثار اور کتابوں سے ان کے متعلق کس قسم کے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہو، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس غرض سے قرآن اتارا گیا ہے اس کے لحاظ سے بحث و تحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری ہے، یوں علمی نقطۂ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سراغ رسانی علم کی خدمت ہے، [اسی طرح قرآنی قصص سے متعلق] اس خدمت کو بھی کوئی انجام دے تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی یقیناً قدر و قیمت کی مستحق ہو گی۔ لیکن جس نتیجے تک پہونچانے کے لیے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہو اس کے لیے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

۲

جو براہِ راست عربی زبان میں قرآن سے استفادہ نہیں کر سکتے، ان کے سمجھانے کا مرحلہ کافی دشوار ہے۔ پہلے قرآنی الفاظ نقل کروں، پھر ان کا ترجمہ کروں، مطلب بیان کروں، اس کے بعد بتاؤں کہ دجالی فتنے کی سمیت کے ازالہ میں سورۂ کہف کے اس جزء سے مدد لینے کی کیا شکل ہے، دماغ میں مختلف تجویزیں آئیں مگر دل کسی پر جا نہیں، حق تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں کچھ کہنا شروع کرتا ہوں، آپ پڑھتے جائیے، دیکھئے اسی راہ سے فائدے کی صورت خدا چاہے گا تو نکل آئے گی۔

موجودہ دجالی فتنہ کا پہلا سبق سب سے پہلی بنیادی بات دجالی فتنے سے ماؤف فطرتوں کی آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ باور کرایا جاتا ہو کہ جس میں کچھ نہ تھا، یقین کرو کہ سب کچھ اسی سے ملا ہو ، سب کچھ تا اینکہ زندگی بھی اسی سے ملی ہے جس میں زندگی نہ تھی، علم اسی سے ملا ہے جس میں علم نہ تھا، الغرض جس میں بینائی نہ تھی اس سے بینائی، جس میں شنوائی نہ تھی اس سے شنوائی، جس میں ارادہ نہ تھا اس سے ارادہ، جس میں اختیار نہ تھا اقتدار نہ تھا، اسی سے اختیار و اقتدار سب کچھ ــــ یہی بنیادی احساس ہے جسے ہر اس دل اور دماغ میں آپ آج پائیں گے، جس پر دجالی فتنے کی عفریتی پرچھائیاں پڑ چکی ہیں۔ ان کے تاریک سائے میں آنے کے ساتھ ہی، پانے والے کچھ اسی قسم کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء صرف ایک لفظ "ارتقاء" جادو کا کوئی چمچہ ہے جس میں بھر بھر کر وہ سب کچھ پلا دیا جاتا ہے جسے انسان کی فطرت کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی، ہستی ہی سے ہستی کی پیدائش کا سلسلہ جس کے سامنے جاری ہو "کچھ نہیں" سے "کچھ" بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو اس کے تصور سے بھی عاجز ہے، اسی غریب انسان کو ہضم کرا دیا جاتا ہے کہ کمالات و صفات کا یہ بحر بے کراں جو کائنات کے نباتی، حیوانی، انسانی طبقات میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ابتداءً یہ سب کچھ نیست و نابود تھا، پھر وہی کمالات و صفات جو "نیست و نابود" تھے، ارتقائی عمل کی راہ سے ہست و بود کے قالب میں جلوہ گر ہوتے چلے گئے اور چلے جا رہے ہیں۔ گویا جو نہ تھے وہ ہو گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی منوایا بھی جاتا ہے اور ماننے والے اسی کو مان بھی رہے ہیں۔ جس خیال کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اسی کے منگوا دینے میں کامیابی کیسے ہو گئی؟ خصوصاً اس دعوے کے ساتھ کہ عقل و مشاہدے کے سوا دلیل و حجت کی حیثیت سے کوئی تیسری چیز پیش نہیں ہو سکتی۔ اسی عقل و مشاہدے کے برخلاف یہ کیسے مان لیا گیا کہ جس مادے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا۔ حالانکہ نہ باور کرنے والوں کے سامنے کی یہ بات ہو اور نہ باور کرانے والوں کے سامنے کی۔ دنیا جب پیدا ہو رہی تھی اس وقت نہ یہ موجود تھے نہ وہ۔ مگر جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جانے بغیر ہم کسی چیز کو مان نہیں سکتے، وہی ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں جانے بغیر ماننے پر خود بھی تیار ہو گئے اور دوسروں کو بھی تیار کرنے کی کوششوں میں منہمک ہیں۔

بہر حال جس میں کچھ نہ تھا اسی سے یہ سب کچھ کیسے نکل آیا۔ صفر سے عدد کیسے پیدا ہوا۔ نابود نے بود کا، نیستی نے ہستی کا لباس کیسے اختیار کر لیا؟۔ ان قصوں کو تو جانے دیجئے، زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب "الدین القیم" کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں میں ایک دوسرے نفسیاتی مسئلے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں[1]۔

---

[1] اگلے پیراگراف میں اسی "نفسیاتی مسئلہ" کی تشریح ہے، جو ہمارے خیال میں عام ناظرین کے فہم کے لحاظ سے کچھ مشکل تھی۔ مولانا کا (باقی اگلے صفحہ پر)

عہد حاضر کے انسان کی نفسیاتی بے چینی اور سورۂ کہف کا پہلا جز

"جس میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا" جس کی فکری تعمیر اس بنیاد پر قائم ہو گی مادے کی کیچڑ سے اُبل کر باہر آنے والے[1] اس شخص کے احساسات کیا ہوں گے؟ کائنات کے اس بحرِ مواج کی ہر موج میں عہد کام نہنگ کے پھیلے ہوئے حلقوں کو توڑتے پھوڑتے ہوئے [وہ] سمجھتا ہے کہ موجودہ زندگی کے پانے میں وہ کامیاب ہوا ہو۔ کس زندگی کے پانے میں؟ جو خود مستقل "قیدِ غم" ہے اور "غم کی اس قید" پر بھی مسلسل حوادث وآفات کے ہتھوڑے پڑتے چلے جاتے ہیں، تا اینکہ بالآخر غم ہی کی شکل میں جو زندگی ملی تھی، جب تک ساتھ رہی سوزش بن کر ساتھ رہی، جس دن سوزش اس کی ختم ہوئی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ الغرض ایک بے سہارے تنکے کی طرح ہستی کے سمندر میں "کچھ نہیں سے نکل کر" "سب کچھ بن جانے والا" یہ انسان تیرتا رہتا ہے۔ جس کا کوئی محافظ کوئی نگراں نہیں، جس کی سعی کا کوئی حاصل، اور جس کے وجود یا زندگی کا کوئی انجام نہیں۔

"دجالیت" کے اس عہد میں ساری بے قراریاں، جن میں آدمی کا دل تہ وبالا ہوتا رہتا ہے، سچ پوچھئے تو ان کی ضمانت درحقیقت بے کسی کے اسی احساس میں پوشیدہ ہے، جو زندگی کی اس ارتقائی توجیہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

اب ایک طرف دجالی ذہنیت کے اس قدرتی نتیجے اور لازمی احساس کو رکھیے اور سورۂ کہف کی پہلی سطر کے پہلے جزء "الحمد للہ" پر ٹھہر جائیے۔ میں آپ سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آگے پڑھیے یا نہ پڑھیے، صرف

بقیہ حاشیہ صد ۱۰۲

مطلب یہ ہو کہ اس عہد کے انسان میں بے کسی کا جو ایک عام احساس پایا جاتا ہے جس کی بدولت پوری زندگی بے قراری اور بے اطمینانی کی تصویر بنی ہوئی ہو وہ درحقیقت نتیجہ ہو اس نظریۂ ارتقاء کا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ حقیقت ہو کہ زندگی ایک مستقل "قیدِ غم" ہو، اور قید بھی پرسکون نہیں! بلکہ مسلسل حوادث وآفات کا بھی اس میں سامنا ہو۔ اور دوسری طرف اس نظریہ (ارتقاءِ حیات) کی رو سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر کسی خالق و پروردگار کے حیات کے مختلف مراحل سے گزرتا اور کشمکش کرتا ہوا اس مرحلہ تک پہونچا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کا یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس قیدِ غم اور بحرِ الم میں وہ اکیلا اور بے سہارا ہو نہ اس کا کوئی نگراں ہو نہ محافظ۔ اور پھر اس احساس سے لازمی طور پر وہی اندرونی بے اطمینانی اور بے قراری ہونی چاہیے جس میں اس عہد کا انسان مبتلا ہے ——— اب پڑھیے مولانا کی عبارت! — مرتب

[1] نظریۂ ارتقاء کی رو سے کائنات کے اندر زندگی کے اولین آثار اس کیچڑ میں نمودار ہوئے تھے جو سطحِ ارض پر سمندروں کے وجود میں آجانے کے بعد ان کے کناروں پر پیدا ہو گئی تھی، اس کیچڑ میں نمودار ہونے والے زندگی کے ابتدائی آثار کہا جاتا ہے کہ ترقی کرتے کرتے انسانی قالب میں جلوہ گر ہو گئے۔ — مرتب

"الحمدللہ" سے علم کی جو روشنی پیدا ہوتی ہے، وہ تاریکی کے ان مہیب بادلوں کو چھانٹنے کے لیے کافی ہے۔

الحمدللہ کا مطلب

"سمجھا آپ نے "الحمدللہ" کا کیا مطلب؟ کھولا گیا ہے [یعنی "الحمدللہ" فرما کر انکشاف کیا گیا ہے]
کہ ہر وہ کمال یا صفت جو تعریف و توصیف کی مستحق نظر آتی ہے یہ "اللہ" یعنی اس ذات کے ساتھ مختص ہے جس کی
کارفرمائیوں کی یہ کائنات جلوہ گاہ ہو، جس کا حاصل یہی تو ہوا کہ جس میں کچھ نہ تھا اس سے نہیں! بلکہ جس میں سب کچھ ہو
اسی سے ملا ہے جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے! جس کا سب کچھ ہے اور جس میں سب کچھ ہے، حیات ہو، علم ہو، قدرت
ہو، ارادہ ہو، رحم ہو، رافت ہو، جو اس سے پیدا ہوا ہو، خیال تو کیجیے کہ ان مایوسیوں اور دسواسی محرومیوں
سے اس کو کیا واسطہ؟

نزول کے بعد ارتقاء

جس کے پاس سب کچھ ہے وہ اگر دستگیری کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے جن کے پاس کچھ
نہیں ہو۔ الغرض وہ بے یاروں کی یاوری، غمخواروں کی غمخواری، ناداروں کی دارائی کرے اور ان کی خالی جھولیوں کو بھر
سے بھر دے، بھرتا چلا جائے تو سوال یہ ہو کہ
(پستی سے نکال کر بلندی کی طرف چڑھانے کے لیے) کچھ نہ رکھنے والوں کی طرف سب کچھ رکھنے والی ہستی کی اپنے
مقام رفیع سے یہ نزولی توجہ کیا کسی حیثیت سے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کے تسلیم کرنے میں انسانی فطرت اپنے
اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھنجلاہٹ محسوس کرے؟۔

الحمد للہ (یعنی تمام قابل تعریف خوبیوں اور زیبائیوں کے سرچشمہ اور اسی کامل وجود) کو بنیاد بنا کر نزول
کے بعد ارتقاء کا یہی وہ قرآنی نظریہ ہو جسے سورۂ الکہف کی پہلی سطر میں الحمد للہ کے بعد ان الفاظ میں ہم پاتے ہیں۔[1]
فرمایا گیا ہو:۔

اَلَّذِی اَنْزَلَ الْکِتَابَ عَلٰی عَبْدِہٖ　　　جس نے اتاری کتاب، اپنے بندے پر۔

ان الفاظ سے یہی علم تو بخشا گیا ہو کہ عبد یا بندہ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا، اس پر الحمد والے اللہ نے (یعنی
جس کے پاس سب کچھ ہو) اپنی کتاب اتاری، اور یوں جو نیچے تھے ان کو اونچا کرنے کی راہ اس نے کھولی۔

قرآن کے ارتقائی نظریہ کا مقابلہ موجودہ ارتقائی نظریہ سے

نزول اور رفتار کے بعد ارتقاء اور چڑھاؤ کے اس فطری اور طبعی طریقے کا مقابلہ عہد
دجالیت کے اس ارتقائی وسوسہ سے کیجیے جس میں "کچھ نہیں" سے باور کرایا جاتا ہو کہ
"سب کچھ" نکل آیا ہے۔ سمجھایا جاتا ہے کہ مادہ جس میں کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم، نہ ارادہ، وہی ان کمالات

---

[1] یعنی الحمدللہ کے ذریعہ جو حقیقت منکشف فرمائی گئی ہو، اسی کو بنیاد بنا کر، اگلے الفاظ میں نزول کے بعد ارتقاء کا یہی قرآنی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مرتب

وصفات کی تلاش میں اُٹھ کھڑا ہوا، جو اس کے لیے نامعلوم اور مجہول ہی نہیں تھے، بلکہ بذاتِ خود معدوم قطعاً معدوم
تھے، جاہل طالب اور مجہول بلکہ مطلق معدوم مطلوب، یہ عجیب وغریب بار تعالیٰ لطیفہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کتنی پیچ
در پیچ الجھنوں میں گتھا ہوا ہو، جس میں کچھ نہ تھا اس میں ان مجہول و معدوم کمالات وصفات کی طلب کیسے پیدا ہوئی،
اس طلب کے بعد اپنی انتخابی قوت سے کام لے کر ناقص صفات کو چھوڑتے ہوئے، کامل صفات کو چنتے ہوئے وہ
آگے آخر کس بل بوتے پر بڑھ رہا ہے، اور اسی بے جان، بے عقل وتمیز طالب کو یہ معدوم مطلق معدوم صفات
آخر کیسے مل گئے، کہاں سے مل گئے، جن سے آج مادے کا وجود آراستہ وپیراستہ نظر آرہا ہے۔

ٹیڑھی راہ اور بھرو طبائع

یہ کتنی ٹیڑھی کبڑی پیچ وخم والی راہ ہے جس پر "کچھ نہیں سے سب کچھ نکل آنے" کے فلسفہ یا دوسرے نے
ان کو ڈال دیا جس معمہ کو اس توجیہ سے آج حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ تفہیم کے اس
طریقہ سے، انصاف شرط ہے، سلجھتا ہے، یا اس کی الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں؟ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں
جن کی فطرت ابھی سلامتی کے نقطۂ نظر سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہو۔ ورنہ توڑی اور مڑوڑی طبیعتوں میں یہی اُلٹی
باتیں "سیدھی" بن بن کر اُترتی چلی جا رہی ہیں [اور اسی بنا پر] وہ سمجھتے ہیں کہ عہد جاہلیت کی یہ باتیں سیدھی
ہیں۔ لیکن سرشت بشری کے سب سے بڑے نباض عارف رومی کا فیصلہ تو یہ ہے کہ: ؎

چوں فنونِ دیو در دلہائے کج
می رود چوں کفش کج درپائے کج

[پس] ٹیڑھے پاؤں میں ٹیڑھا جوتا اگر فٹ ہو جائے تو آپ ہی بتلائیے اس کے سوا اور ہوتا کیا؟۔

الکتاب کی پہلی خصوصیت

بہرحال میں تو سمجھتا ہوں کہ سورۂ کہف کے مذکورۂ بالا الفاظ میں الحمد للہ پر جیسا و قائم کر کے
نزول کے بعد ارتقاء کی جو راہ پیش کی گئی ہو اس پر چلانے والی "الکتاب" یا قدرتی دستور العمل اور ہدایت نامے
کی پہلی خصوصیت:-

"وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجاً"　　اور نہ رکھی (کتاب کے اتارنے والے اللہ نے)، اس میں کسی قسم کی کوئی کجی

جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ، عوج یعنی پیچ وخم، کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا
کوئی رشتہ نہیں ہو۔ وہ خود سیدھی ہے، سیدھی بات بتاتی ہو، سیدھی راہ پر لے چلتی ہے۔

اس کی اسی خصوصیت نے اس کو موجودہ دماغوں کے لیے ناقابل قبول بنا دیا ہے

فکر و نظر کی مصنوعی ورزشوں اور سوفسطائیت کے مغالطی کرتبوں سے جن
کے دل، جن کے دماغ الٹے پلٹے مسلے وسلے نہیں گئے ہیں، تجربہ کر کے دیکھ
لیجئے۔ ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی، اُترتی چلی جائے گی، ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لیے پیدا

کیے گئے ہیں اور یہ کتاب ان کے لیے پیدا کی گئی ہو، مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے جھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ذہنیتوں اور "عصری تقاضوں" کے مطابق ڈھلے ہوئے کج دماغوں، پھرے ہوئے سروں سے یہ کتاب اُچٹ جاتی ہے، نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں، اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو انھیں محسوس کرا سکتی ہے۔

موجودہ دماغوں کی ساخت | ان کے لیے بھینس کے انڈے اور انڈے سے روغن گل، روغن گل سے ساری دواؤں کا نکلنا اور نکالنا آسان ہے[1]، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، صفر سے عدد کی پیدائش کا تو وہ تصور کر سکتے ہیں، بلکہ اسی کو واقعہ ٹھہرا رہے ہیں، مگر جس تھیلی میں سو روپے ہوں اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دس یا بیس روپے کیسے نکلے[2]؟۔

کانٹوں کی سیج پر نیند کا منظر | خود جن مسئلوں میں الجھنوں کے کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، انھیں کانٹوں کی سیج پر انھیں نیند آ گئی ہو اور یقین کیے بیٹھے ہیں کہ زندگی کے سارے اساسی سوالوں کی گرہیں الجھنوں کے ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ بھی کھلتی چلی جائیں گی، اور یہ سب اسی لیے ہو رہا ہو کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو نظر آ رہا ہے کہ ٹیڑھا جوتا ان کے لیے سیدھا بن گیا ہو۔

دوسری خصوصیت | مگر ان کی ذہنیت و فکر کی یہ مصنوعی کجی، جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی پا رہی ہو، اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں، یہ ایک مرض ہو جو باہر سے ان کے اندر آیا ہے، شاید اسی کو بتانے کے لیے اور اسی خارجی سمیت کو نکالنے کے لیے دوسری خصوصیت اس "الکتاب" اور زندگی کے قدرتی دستور العمل کی ایک اور صرف ایک لفظ "قیِّمًا" سے ظاہر کی گئی ہو، دیکھنے میں ہے تو بظاہر یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسا کہ فقیر کا خیال ہو اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال کی مؤید ہے، یہ ہو کہ لازوال، غیر فانی، اَبٹ اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے، قیام و بقاء کی شدت اور حد سے زیادہ استحکام و استواری پر "قیم" کا یہ لفظ دلالت کرتا ہے جس کے سوا کچھ نہ رہے گا، جو ایسا برقرار باقی رہنے والا ہے، اور ہر چیز جو کچھ بھی اس کے سوا ہو سب کے قیام و بقا کی ضمانت جس کی قدوس پاک ذات کے ساتھ وابستہ ہے، اس کو "القیوم" بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود قائم و برقرار ٹھہرا ہوا ہو، اور سب کو وہی، اس کا ارادہ قائم و برقرار رکھے ہوئے، ٹھہرائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہو، خیر یہ تو "قیم" کے

---

[1] آخر جس مادے میں کچھ نہ تھا، جب یہ مانا جاتا ہو کہ اس سے سب کچھ نکل آیا تو اس میں اور بھینس کے مذکورۂ بالا مشہور لطیفہ میں کیا فرق ہے؟۔

[2] الحمد للہ کو خشت اول قرار دے کر قرآن کائنات کی تعبیر کی جو توجیہ پیش کر رہا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ لامحدود کمالات والے خدا نے اپنے کمالات کو محدود پیمانوں پر نمایاں کیا ہے۔

اس قرآنی لفظ کی گویا لفظی تحقیق تھی، اب غور کیجئے اس لفظ کی معنویت کے اس پہلو پر جس کی وجہ سے اس خاص مقام پر وہ داخل اور شریک کیا گیا ہے۔

لفظ قیم کی معنویت جیسا کہ میں نے عرض کیا، طبائع میں کجی اور ٹیڑھ پن پیدا کرنے کے بعد ٹیڑھی باتوں کے آثار دینے میں کامیاب ہو جانا، اس میں شک نہیں کہ تجربہ کی اور سامنے کی بات ہو۔ کامیابی حاصل کرنے والے آج اسی راہ سے کامیابی حاصل کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ دوسری بات بھی جس کی طرف میرے خیال میں "قیم" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہو، یہ بھی تو دور کی نہیں بلکہ قریب کی ایسی بات ہو جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، آخر ہم یا آپ کیا یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ وہ سارے اعوجاجی خرافات اور دجّالی نظریات جن کا چرچا دنیا میں آج پھیلا ہوا ہو۔ تعمیر کے ساتھ ہی خرابی کی صورتیں بھی کتنی سرعت کے ساتھ اس میں مضمر ہوتی چلی جاتی ہیں، مشرق میں کسی پرانے از کار رفتہ مسئلہ کو دقیانوس کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو دقیانوسی خیال ہے، دقیانوس بے چارا خدا ہی جانتا ہو کہ کتنے ہزار سال پہلے دنیا کا بادشاہ ہوا تھا، مگر آج عصری نظریات کی دقیانوسیت کے لیے کون نہیں جانتا کہ غریب ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا جاتا ہو کہ یہ تو "وکٹورین ایج" یعنی عہد وکٹوریہ کی بات ہو، حالانکہ ولادت کے نہ سہی، مگر اس ملکہ کی موت کے زمانے کے پانے والوں کی تعداد کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ابھی زندہ ہو۔ "قیم" کے برعکس بے ثباتی کی اس خصوصیت کے لیے اس سے زیادہ اعترافی شہادت اور کیا ہو سکتی ہو۔ ع "مردہ زاید از بطون الامہات" یہی دجّالی عہد کے نظریات کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز ہے، کلیات تو کلیات جن کی بنیاد صرف تخمینی ٹٹول، یا ان تیروں پر عموماً قائم ہے، جنھیں چلانے والے اندھیرے میں چلاتے رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے دیکھے بھالے جزئیات، مثلاً آدمی کے لباس کا مسئلہ کہ سوچ سمجھ کر آرام و آسائش زیب و زیبائش کے عام پہلوؤں کا لحاظ کر کے اس کی وضع و قطع متعین کی جاتی ہے، مگر سنتے ہیں کہ بسا اوقات بازار سے گون یا ٹوپی، یا اسی قسم کی کوئی چیز خریدنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ گھر کی طرف بھاگے بھاگے چلے یا چلی جا رہی ہو، تاکہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو استعمال کر لیں، ورنہ گھر پہونچنے تک ممکن ہو کہ اس خاص لباس کا فیشن اور چلن نہ رہے۔

دھوپ چھاؤں کا فلسفہ جن سیمابی بے قراریوں پر "تمدن جدید" اور "دانش نو" کی بنیاد قائم ہو اس کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہو۔ ممکن ہے کہ یہ لطیفہ ہو، مگر زود فہمی اور زود لاغری کی اس خصوصیت کے اظہار کی یہ بہت اچھی تمثیل ہے، بعض کارٹونی تصویروں میں اسی لطیفہ کو مصور کر کے دکھایا گیا ہے، میں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ عہد دجالیت کے صرف لباسی جزئیات ہی کا یہ حال نہیں ہو، بلکہ دجّالیت کا سارا فلسفہ، سارا تمدن، دھوپ چھاؤں کا فلسفہ اور دھوپ چھاؤں کا تمدن ہے، اس کے نیچے پناہ ڈھونڈھنے والوں کو نہ دھوپ ہی سے استفادہ کا

موقع میسر آسکتا ہے اگر وہ دھوپ کھانا چاہتے ہوں، اور نہ چھاؤں کے سایہ میں آرام ہی کی امید لگانی چاہیے اگر اس سایہ کے نیچے کوئی آرام لینا چاہتا ہو۔

ارتقاء کا مطلب

"قیم" کے مقابلہ میں "غیر قیم" ہونا، اس فلسفہ یا تمدن کی یہی خصوصیت اس پیچ و خم یا ٹیڑھ اور کجی کے راز کی غمازی کر رہی ہے جو "دجالی" یا "ارتقائی تمدن" کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کی رگوں اور ریشوں میں رواں دواں ہو۔ "ارتقاء" نام ہی اس کا ہو کہ ہر آنے والے دن میں گذرے ہوئے کل کی مسلمہ مانی ہوئی بات غلط ثابت ہو جائے، کل تک جمہوریت کا نظام انسانیت کے ارتقاء کا آخری نقطۂ عروج تھا، لیکن آج سرمایہ داری کے رسوا کن طوق کے گلے میں ٹنگے ہوئے، گلی کوچوں کے بچوں کی تالیوں کا وہ نشانہ بنا ہوا ہو۔ اور اب انسانیت کا "فردوس گم گشتہ" باور کرایا جا رہا ہو کہ اشتراکی نظام میں مل جائے گا۔ ....

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض کر رہا تھا کہ "قیم" کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی "الکتاب" کے مشتملات و تعلیمات کی خصوصیت ظاہر کی گئی ہو، [اس کی رو سے یہ کتاب] لازوال، غیر فانی حقائق کا وہ مجموعہ ہو، تاریخ کے نامعلوم عہد سے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہو۔ نوحؑ نے بھی ان ہی کی طرف بلایا اور ابراہیمؑ نے بھی، موسیٰؑ نے بھی اور عیسیٰؑ نے بھی، سارے "النبیون" اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں، ہر بستی کے رہنے والوں کو ان ہی کی طرف پکارا، جس کے پاس کچھ نہیں ہو، مگر سب کچھ کے پانے اور حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر وہ رکھتا ہے، چاہیے کہ وہ آگے بڑھے اور جس کے پاس سب کچھ ہو اس سے جو کچھ پانا چاہتا ہے پاتا چلا جائے، پہلوں کو جو "الکتاب" دی گئی اس میں بھی یہی تھا اور اسی "الکتاب" کی آخری شکل میں بھی، اسی کا صلائے عام دیا گیا ہو۔

الکتاب کی مذکورہ خصوصیات اور موجودہ دجالی ادبیات

بہر حال "لم یجعل لہ عوجا" نہ رکھی اس میں کسی قسم کی کجی، کی سلبی یا منفی خصوصیت اور اسی کے ساتھ "قیما" (لازوال، غیر فانی، امٹ اور اٹل) ہونے کی ایجابی و مثبت خصوصیت، قانون نزول کے تحت ناقصوں کو ساحل کمال تک پہونچانے کے لیے وجود کامل یا الحمد والے اللہ کی طرف سے "الکتاب" یعنی زندگی کا جو دستور العمل دیا گیا ہو اسی دستور العمل کی مذکورۂ بالا دونوں منفی و مثبت یا سلبی و ایجابی ایسی دو خصوصیتیں ہیں کہ ان کی روشنی میں "دجالی ادبیات" کی تاریکیاں خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں۔

دجالی نقطۂ نظر کے پیچ و خم

آپ جائزہ لیتے چلے جائیے، واضح ہوتا چلا جائے گا کہ ہر سیدھی سادی بات تک جہد و جل میں پیچیدہ ترین راہوں سے پہونچنے اور پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے، دل کا سکون، قلب کی

راحت، جو مٹی کے لوٹے میں بھرے ہوئے پانی سے وضو کر لیجئے اور وضو کے بعد کسی کے قدموں پر سر ڈال دینے جس وقت چاہے حاصل ہو سکتی ہے (مگر غم غلط کرنے لگے)، اسی مقصد کے لیے دیکھئے کروڑہا روپے کی سنیمائی تصویریں تیار ہو رہی ہیں۔ اربوں کی لاگت سے ملک کے طول و عرض میں "تماشا گھروں" کا جال بچھا دیا گیا ہو، اور ملک نہیں ایک ایک شہر بلکہ اب تو قصبات تک کے باشندوں کی کمائی کا معقول حصہ روزانہ غم غلط کرنے کے اسی قصے میں بھسم ہو رہا ہے۔ اور پھر بھی جو خنکی وضو کے مفت پانی اور بغیر کسی ٹکٹ کے لاہوتی دربار کی باریابی سے دلوں کو میسر آ رہی ہو، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ خنکی اور ٹھنڈک کی اس کیفیت کو اس سارے جال جنجال سے حاصل کرنے میں آپ قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔

امن و امان کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے اخلاقی تصحیح کی ضرورت کا احساس آج بھی کیا جا رہا ہو جیسے پہلے کیا جاتا تھا، لیکن اسی غرض کو حاصل کرنے کے لیے پیچ و خم کی کتنی ٹیڑھی ترچھی راہ اختیار کی گئی ہو، آئندہ دنیا میں جو نسلیں پیدا ہونے والی ہیں، پیدا ہونے سے پیشتر ان کو [بلکہ] ان کے خیال (صرف خیال) کو دماغوں میں ابھار ابھار کر دھمکیاں دی جا رہی ہیں، کہ موجودہ نسلوں کو اپنی اخلاقی غلطیوں کا جواب ان ہی آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کو دینا پڑے گا۔ (اس وقت دینا پڑے گا جب جواب دینے والے دنیا سے ناپید ہو جائیں گے) کبھی تاریخ کے فن کو پیشہ بنانے والے یعنی مورخین سے ڈرایا جاتا ہے، کہ جب وہ کتابیں لکھیں گے، یا مدرسوں میں سبق پڑھائیں گے تو تمہارا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کریں گے، کیسی عجیب بات ہو، امید باندھی جاتی ہے کہ اخلاقی بدکاروں کو ان دھمکیوں کے دباؤ سے دبا لیا جائے گا۔ کامیابی کی یہ راہ ان کو سیدھی راہ نظر آتی، اور پیدا ہونے والوں کو اپنے پیدا کرنے والے خالق کے سامنے کھڑا کر کے جواب دہی کی ذمہ داری ان میں جو ابھاری جاتی تھی، یہی راہ ان کو ٹیڑھی دکھائی دے رہی ہو، وہم اور صرف وہم سے زیادہ جو اور کچھ نہیں ہو، باور کرایا جا رہا ہو کہ وہی واقعہ ہو، اور واقعہ ہی کو وہم ٹھہرایا جا رہا ہو، بغیر کسی معاوضے کے جس نے وجود بخشا، وجود کے کمالات بخشے، اسی بخشنے والے ارحم الراحمین، "علیٰ کل شیءٍ قدیر" کی رحمتوں اور دستگیریوں پر بھروسہ کرنے والے وہم کا شکار ٹھہرائے گئے، مگر وہم کے ان ہی الزام لگانے والوں کی زبانوں سے جب یہ یا اسی قسم کے فقرات نکلتے ہیں کہ "میں تو فطرتاً رجائی پیدا ہوا ہوں" "پُر امید رہنا اور مستقبل سے مایوس نہ ہونا، یہی ہماری جبلت ہو۔" [الخ] پوچھا جاتا ہے کہ اس رجاء اور امید کی بنیاد کیا ہے، تو پھر ان کی، جو جاہلانہ ہنیتوں اور الجھی ہوئی توجیہوں کی گتھیاں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی کو روک سکتا ہو۔

اور میں کہاں تک گناؤں، مجھے تو دجالی تمدن کے ہر پہلو میں "پیچا پیچ" اور گرہ در گرہ کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا، عدالت ہو یا انصاف، علاج ہو یا معالجہ، تعلیم ہو یا تعلم یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز، پہلی نظر

میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہی "عوج" "وہی پیچا پیچ" کا گورکھ دھندا سامنے آجاتا ہے۔[۱]

فلسفۂ ارتقاء اور مستقبل کی بے یقینی

اور یہ تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ "قانون ارتقاء" کو بنیاد بنا کر زندگی کا جو دستور العمل بھی مرتب کیا جائے گا اس کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ آج جو کچھ مان لیا گیا ہے کہ وہی سچ اور صرف سچ ہے، کل تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہی جھوٹ اور صرف جھوٹ تھا، ورنہ جو کچھ آج مانا جا رہا ہے اگر کل بھی وہی مانا گیا تو ارتقاء کا یہ لفظ ہی بے معنی اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے، گویا ارتقائی اصول پر ساحلِ مراد تک پہونچانے کے لیے انسانیت کے آگے نجات کی جو "کشتی" پیش کی جاتی ہے اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ساحل تک پہونچانے کا سوار ہونے والوں کو یقین نہیں دلایا جا سکتا، بلکہ ممکن ہو کہ منجدھار میں پہونچ کر وہی چیز جس کا نام آج نجات کی کشتی ہو، ممکن ہے کہ کل وہی "گرداب بلا" اور "لطمۂ موت" کی شکل اختیار کر لے۔

کامیاب مستقبل کی ضمانت

اور اسی کے مقابلہ میں دوسرا "جہاز" بھی کھڑا ہوا ہے جس میں ضمانت کی جاتی ہے کہ سیدھی راہ سے لے جاتے والوں کو لے جائے گا، اور قطعی طور پر ہر ایک کو ڈگمگائے بغیر، ساحل تک پہونچا

---

[۱] اس موقع پر ایک دلچسپ مثال کا خیال آ رہا ہو، حاشا و کلّا کسی کی دل شکنی مقصود نہیں ہو بلکہ جو سمجھانا چاہتا ہوں اسکی صرف توضیحی مثال کی حیثیت سے اس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں، سر سید مرحوم نے جب علی گڑھ کالج قائم کیا تو انھوں نے اعلان فرمایا کہ

"ہم اس دن خوش ہوں گے جب کہ ہماری قوم نہ خدا کے واسطے نہ اپنے ثواب کے لیے بلکہ اپنی قوم کے لیے کوشش کرے گی، اور کہے گی کہ میں اپنے ہاتھ اپنے پاؤں، اپنی جان، اپنی محنت سے، اپنے روپے کے بدلے نہ خدا کو خریدنا چاہتا ہوں، اور نہ بہشت کو، بلکہ اپنی قوم کو۔"

(تہذیب الاخلاق ص۵۷۵ و ص۵۰۰)

الغرض یہ سیدھی سادی راہ کہ بغیر کسی معاوضہ کے جھکے دینے کا تجربہ تم کر چکے ہو، اسی کی راہ میں دو، معاوضہ میں جتنا تم دوگے اس سے بہت زیادہ پاؤگے۔ سید صاحب بیچارے نے اس کا انکار کیا۔ آمدنی مسلمانوں سے جتنی توقع تھی وصول نہ ہوئی تو ان ہی سید صاحب نے جو فرماتے تھے کہ "اللہ کے لیے، ثواب کے لیے، جنت کے لیے جو دے گا میں اس سے خوش نہ ہوں گا۔" ان کو دیکھا گیا کہ کالج کی آمدنی کی توفیر کے لیے جیسا کہ مولوی طفیل احمد صاحب نے "روشن مستقبل" میں لکھا ہو (سر سید نے)، روپیہ حاصل کرنے کے لیے یورپ کے طریقے مثل لاٹری یعنی چھٹی وغیرہ کے اختیار کیے۔ اور اسی پر بس نہیں فرمایا "بلکہ ایک بار علی گڑھ کی سالانہ نمائش میں قومی تھیٹر نے: ٹکٹ لگا کر ایک قومی ناٹک ہوا" یعنی باضابطہ تماشے کا نظم کیا گیا اور خود سر سید اور ان کے شرکاء کار کا جس میں حصہ تھا۔ ... بڑی بڑی ڈاڑھیوں والے ان بزرگوں نے ایکٹروں کا فرض انجام دیا، مگر سیدھی راہ کو چھوڑ کر اس ٹیڑھی ترچھی راہ میں بھی جیسا کہ طفیل احمد صاحب نے لکھا ہے "ان تمام طریقوں میں کوئی حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوئی۔" (ص۲۰۹ روشن مستقبل)

دیا جائے گا، اس ضمانت نامے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ترین ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں، نوح کی ابراہیمؑ کی، موسیٰؑ کی، عیسیٰ کی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، الغرض سارے انبیاء اور بنی آدم کے سامنے رہنماؤں کے دستخط روشن حروف میں اس ضمانت نامے پر جگمگا رہے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہو کہ ان دونوں سفینوں میں سے اپنی "نجات" کے لیے جس کا جی چاہے انتخاب فرمالیجئے۔

سورۂ کہف کی تلاوت اور دجالی فتنے سے حفاظت کا ربط

اب سمجھ میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی ان حدیثوں کا مطلب جن میں فرمایا گیا ہو کہ سورہ کہف کی ابتدائی آیتوں کے یاد رکھنے والے دجال کے فتنے سے محفوظ رہیں گے۔ حالانکہ ابھی آپکے سامنے کہف کے ابتدائی حصّے کی پہلی سطر سے حاصل کیے ہوئے صرف ان ہی نتائج کو پیش کیا گیا ہو جن کے متعلق یہ امید کی جاتی ہو کہ خواص کے ساتھ عوام بھی اگر غور کریں گے تو مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسی سطر کے بعض الفاظ سے کچھ اور بھی چیزیں سمجھ میں آ رہی ہیں، خصوصاً عبد کے لفظ کی اضافت بجائے ذاتی یا صفاتی اسم کے "ہ" کے ضمیر غائب کی طرف جو کی گئی ہو اپنے خاص مقام کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہو۔ مگر اس کی تشریح میں غیر معمولی طوالت بھی ہوگی، اور عوام بے چاروں کی رسائی سے اندیشہ ہے کہ کہیں دور نہ ہو جائے۔ پس، الکہف کی پہلی سطر یا پہلی آیت کے متعلق جو کچھ بھی ادا کر دیا گیا۔ اسی پر قناعت کر کے آئیے اب آگے بڑھیے۔

دوسری آیت کا آغاز اور اشارے

لِيُنْذِرَ (تاکہ دھمکائے) کے لفظ سے دوسری آیت کا آغاز کیا گیا ہو، اور بجائے کنائے و اشارے کے نسبتاً زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں قرآن کا یہ بیان شروع ہوتا ہے۔

تین سوال

جیسا کہ میں نے عرض کیا دھمکی سے اس بیان کی ابتدا کی گئی ہو، قدرتی طور پر تین سوال اس دھمکی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں، یعنی

۱۔ کس چیز کی دھمکی دجالی فتنے سے تعلق رکھنے والی اس سورہ میں دی گئی ہے۔

۲۔ کیا یہ دھمکی عام ہے یا کسی خاص طبقہ اور خاص قسم کے صفات و احساسات رکھنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رُخ ہو۔

۳۔ اگر عام نہیں بلکہ دھمکی کا رُخ کسی خاص طبقہ کی طرف ہو، اور یہی بیان بھی کیا گیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ جن کی طرف دھمکی کا رُخ ہے اُن کے خصوصیات کیا ہیں، . . . .

. . . .

ان تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہو۔ اب میں آپکے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں

ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرتا ہوں۔

(۱)

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہو؛ یہی پہلا سوال تھا، دجالی فتنے کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں، ذرا ان کو دماغ میں تازہ کر لیجئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ تیرہ سو سال پیشتر سرزمین عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا۔

کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا وہ "باس" کا لفظ ہو یوں تو لغت میں مثلاً قاموس کے فارسی ترجمہ منتہی الارب میں "باس" کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کیے ہیں، یعنی "بیم و عذاب" و "سختی و قوت در حرب و دلیری" مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کیے جاتے ہیں، قدر مشترک ان کا، اگر نکالا جائے تو یہی ہو سکتا ہو کہ فطرت انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے، منجملہ دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی ایک تعبیر "باس" بھی ہے، مگر یہ تو "باس" کی لغوی تشریح ہے، قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہو، مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہو۔ "بأسهم بينهم شديد" یا عذابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے، اسی طرح عذاب ہی کی ایک شکل یہ بھی ہو کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر "يذيق بعضهم بأس بعض" کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہو جس کا مطلب یہی ہو کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے "وحين البأس" بھی فرمایا گیا ہے، الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں "باس" کے لفظ کی جو تعبیر کی گئی ہے، اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حرب و قتال یا جنگ کی وجہ سے جو دکھ اور تکلیف لڑائی کے ہر فریق کو پہونچتی ہو، قرآن اسی دکھ اور تکلیف کو "باس" کہتا ہے گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہو۔ اس محاورے کو پیش نظر رکھیے، اب سوچئے ان قرآنی الفاظ کو۔

لینذر بأسا شدیدا من لدنه — تاکہ دھمکائے باس شدید سے جو لدنی ہے۔

"باس" کا مفہوم تو متعین ہی ہو چکا، جو جنگ اور جنگ سے پیدا شدہ مصائب اور تکلیفوں کی تعبیر ہو آگے "شدید" کی قید کا اضافہ کیا گیا ہو جس کا مادہ شدت سے ہو، شدت سختی کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ جنگ اور اس کے لائے ہوئے مصائب جن کی دھمکی دی گئی ہو وہ معمولی نہ ہوں گے، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوتی، قرآن میں شدید کے بعد "من لدنه" کا لفظ ہو۔ "لدنی" اسی کا اردو ترجمہ کیا گیا ہو [جس کا مطلب ہو غیر اسبابی طور پر براہ راست قدرت کی طرف سے پہونچنے والی چیز، یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ علم کی ایک

قسم کو "علم لدنی" کہا جاتا ہے] ایک قسم علم کی تو وہ ہوتی ہے جسے تعلیم کے مقررہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہو، اور دوسری قسم علم ہی کی ایک یہ بھی سمجھی جاتی ہو جو عالم کو اسباب کے توسط کے بغیر براہ راست حق تعالیٰ کے حضور سے عطا کیا جاتا ہو، اسی قسم کا نام اردو میں بھی "علم لدنی" مشہور ہو گیا ہو، بظاہر یہ محاورہ اسی سورۂ کہف کے دوسرے مقام سے ماخوذ ہو، یعنی موسیٰ (علیہ السلام) کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی، سمجھا جاتا ہو کہ ان کا نام خضر (علیہ السلام) تھا، ان ہی کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت

اٰتَیْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۔ دیا تھا میں نے اس کو (یعنی حضرت خضر علیہ السلام کو) اپنے حضور سے علم!

بھی بتائی گئی ہے۔

بہرحال "بأساً شدیداً" کے ساتھ "من لدنہ" کا اضافہ دھمکی میں جو کیا گیا ہے، بغیر کسی تاویل کے اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شدید جنگ جس کی دھمکی دی گئی ہے؛ اسباب وعلل سے بالاتر ہوگا اور براہ راست قدرت کی طرف سے ایسے "من لدنی" حالات پیش آئیں گے کہ اسباب کی راہ سے مقابلہ کرنے والوں کے سامنے عقلی داؤ پیچ اور فکری تگ و دو، ذہنی ادھیڑ بُن سب بے کار ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ اسباب کی راہ سے تو ان ہی چیزوں کا مقابلہ ممکن ہے جو اسباب ہی کی راہ سے ہو رہی ہوں، لیکن اسباب کا حجاب جب اٹھا دیا جائے، اور من لدنی قانون کے تحت براہ راست جن حالات کو قدرت کا ہاتھ پیدا کرے اُن کا مقابلہ کس کے بس کی بات ہے[1]۔

---

[1] قرآن کے جن الفاظ پر بحث کرتے ہوئے مولانا یہاں تک پہونچے ہیں اُن کے بعد یہ آیت آتی ہے

وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا

اور بشارت دیتا ہے اُن ماننے والوں کو جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں۔ بلاشک وشبہ ان کے لیے اجر حسن ہو۔ مگن رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔

اس آیت کا تعلق چونکہ نہ تو دجالی فتنہ کے علمبرداروں پر تنقید یا ان کے طرز فکر کی تغلیط اور اُن کے لیے کسی وعید و تحذیر سے ہو نہ اس فتنہ کے ایام میں اہل ایمان کے لیے کسی ہدایت و رہنمائی سے، غرض سورۂ کہف کے جن خاص اشارات کی طرف متوجہ کرنا اس مضمون کا مقصود ہے اُن سے آیت کا بظاہر کوئی تعلق نہیں ہو اس لیے طوالت سے بچنے کی خاطر مناسب تو یہی تھا کہ مضمون کے اس حصہ کو حذف کر دیا جاتا، مگر آگے ایک موقع پر چونکہ مولانا نے اس حصہ کا حوالہ دیا ہو اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہو کہ اس موقع پر مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے

(۲)

من لدنی باس شدید کی دھمکی کا نشانہ

"تاکہ دھمکائے ان لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے صاحبزادہ بنالیا"
"نہیں ہے اس کا علم ان کو کچھ بھی، نہ اُن کو ہے اور نہ ان کے باپ دادوں کو ہے"
"بڑی بات ہے جو ان کے منھ سے نکل رہی ہے"
"نہیں بول رہے ہیں وے مگر صرف جھوٹ"

تقریباً یہ لفظی ترجمہ ہے قرآن کی [سورۂ کہف کی] ان آیتوں کا، یعنی:-

"لِيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا"
"مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَائِهِمْ"
"كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ"
"اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا"

اور اب آپ کے سامنے سورۂ کہف کے ان ہی چار فقروں پر بحث کی جائے گی۔

عرض کرچکا ہوں کہ من لدنی باس شدید (خود حضوری سخت جنگ) کی جس دھمکی سے اس سورۃ کی گویا ابتدا کی گئی ہو، اس دھمکی کے متعلق یہ سوال کہ اس کا رُخ آیا ساری انسانیت کی طرف ہو یا بنی آدم کے کسی خاص طبقہ کو اس دھمکی کا قرآن نے نشانہ ٹھہرایا ہے؛ دراصل اسی سوال کا جواب مذکورۂ بالا آیات میں دیا گیا ہے۔[1]

جیسا کہ ظاہر ہے کہ خالقِ عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں، بلکہ اسی "اعتقاد" پر عیسائیت یا کرسچنٹی کی بنیاد قائم ہے۔ عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ

اس کا خلاصہ ذکر کر دیا جائے

اس آیت کے ذیل میں مولانا نے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ من لدنی باس شدید کی دھمکی نہ ماننے والوں کو دینے کے بعد اہلِ ایمان کو اطمینان دلایا گیا ہو کہ ان کے لیے اس میں لدنی عذاب کے دور میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہو بلکہ اسبابی کاروبار کا قصہ ختم ہو جانے کے بعد چاہیے کہ تم "خوش ہو جاؤ کہ تمھاری سعی و عمل جس کا رخ "مسبب" ہی کی طرف تھا، اب اس کی قیمت تمھارے سامنے آئے گی" اور وہ خیر فانی ہوگی۔ مرتب۔

[1] ناظرین کو یاد ہوگا کہ گزشتہ صفحات میں مولانا نے تین سوال قائم فرمائے تھے۔ ایک کا جواب تو گزر چکا، باقی سوال نمبر ۲ و ۳ چونکہ حقیقت میں ایک ہی سوال کے دو جز و تھے اسلئے مولانا نے ان دونوں کے جوابات کو ایک ہی میں ملا دیا ہے۔ مرتب۔

یہی ہے، اور آج عیسائیوں کی بڑی اکثریت یورپ و امریکا میں آباد ہے۔ جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ براہ راست رُخ اس من لدنی یا ماسِ شدید کا ان ہی ممالک اور ان کے آباد کاروں کی طرف ہے۔

قابلِ غور بحث یہ ہو سکتا تھا کہ کسی مختصر لفظ مثلاً "نصاریٰ" یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ سے اسی مفہوم کو قرآن ادا کر دیتا مثلاً کہہ دیا جاتا کہ دھمکایا جاتا ہے، نصاریٰ کو یا عیسائیوں کو، مگر باوجود شدید اختصار پسندی کے ان ہی عیسائیوں کی تعبیر مذکورہ بالا الفاظ سے جو کی گئی ہو اور ساتھ ہی ان کے اس عقیدے کی تنقید میں ایک سے زیادہ فقرے جو قرآن نے اس موقع پر استعمال کیے ہیں، کیا صرف یہ نذر خطابت ہو؟ ایسے الفاظ ہیں کہ ان پر غور کیے بغیر صرف یہ کہتے ہوئے کہ مراد ان الفاظ سے عیسائی ہیں، ہم بھی اسی طرح گذر جائیں، جیسے عموماً لوگ گذر رہے ہیں۔

کسی آدمی کی کتاب کے ساتھ تو اس قسم کا سلوک شاید قابل برداشت بھی ہو سکتا ہے، مگر علام الغیوب الحکیم الخبیر کے کلام کے ساتھ اس کی جسارت دلوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ میں تو اس کو سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں، یہ خالق عالم کا کلام ہے، اسی خالق عالم کا کلام ہے جس کا کام عالم کا موجودہ نظام ہے، جب اس کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں خواہ وہ جتنا بھی مختصر اور چھوٹا نظر آئے، ایٹم کے حقیر ذرات ہی کیوں نہ ہوں؟ لیکن ان ہی ذرات میں سے کسی ذرے کو لے کر لوگوں نے جب سوچا اور سوچنے کا جو حق تھا اسے ادا کیا۔ تو کون نہیں جانتا کہ اسی ایک ذرے سے قوت کا طوفان اُبل پڑا، کیسا طوفان؟ ——— جس کے کام کا یہ حال ہو، انصاف شرط ہے، اسی عجیب و غریب نرالے کام والے کا کلام جب ہمارے سامنے آئے تو کیا اس کے ساتھ یہ انصاف ہوگا کہ جس مطلب کو چار مستقل فقروں میں اس نے ادا کیا ہے اسی مطلب کو ایک لفظ "عیسائیوں" یا "النصاریٰ" یا اسی قسم کے ایک دو لفظ سے ادا کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا کے کلام کو ہم نے سمجھ لیا، اور اس کے سمجھنے کا جو حق تھا اُسے ادا کر دیا؟ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۔

بہر حال اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے اور قرآن کی مندرجہ بالا ان چار آیتوں اور جن الفاظ پر یہ آیتیں مشتمل ہیں اُن پر غور کیجیے۔

(۱)

خاص توجہ کا مستحق لفظ يُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا (تاکہ دھمکائے اُن لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ولد بنا لیا) یہی پہلا فقرہ ہے، جن الفاظ میں عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی تعبیر قرآن نے اس مقام کی ہو، ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق میرے نزدیک "ولد" کا لفظ ہو۔ اردو میں عموماً لڑکا، بیٹا، بچہ وغیرہ الفاظ سے ولد کا ترجمہ کر دیا جاتا ہو، شاید کچھ ایسا سمجھا جاتا ہو کہ عربی ہی میں ابن کا جو دوسرا لفظ ہو اس میں اور ولد ان لفظ میں معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے گویا دونوں ہم معنی مرادف الفاظ ہیں۔

بگر بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ ولد کا لفظ ولادت سے ماخوذ ہے، فارسی میں زادن اور اردو میں جننا جس کے معنی ہیں، جس کا مطلب یہی ہوا کہ ولد کسی کا جب کسی کو ہم ٹھہراتے ہیں تو گویا ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولد وہ شخص ہے جس کا وہ ولد ٹھہرایا گیا ہو، ولادت اور زائیدگی، یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے، اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ...دن، یا جننے یعنی ولادت کے اس لفظ کا اطلاق حالی کی جس صورت پر کیا جاتا ہے اس کی واقعی حقیقت کیا ہوتی ہے؟۔

والد اور ولد کے باہمی تعلق کی نوعیت

فرض کیجئے کہ زید ولد ہو اور عمرو مثلاً اس کا والد ہے، ان دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟۔

کیا عمرو والد اپنے ولد زید کا خالق ہوتا ہے، یعنی زید کو کتم عدم، اور مطلق نیستی کے پردے سے نکال کر اور اس کو وجود عطا کرتا ہے؟ یقیناً واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہوگی۔ زید جوینہ کی شکل میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے اور عمرو جو والد ہے صرف اسی جوینہ یا نطفہ کو زید کی ماں کے رحم میں منتقل کر دیتا ہے، ولد یعنی زید ......، وہ، وجود کے سارے صفات، صفات کے ثمرات ونتائج، ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے نہیں پاتا، بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گذرگاہ ہوتی ہو جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص منزل (یعنی عالم جوینیت یا نطفیت) میں ولد کو گذرنا پڑتا ہے۔ "نیست کو ہست کرنا" اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو معنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا، اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے جیسے سنار سونے چاندی کا زیور گھڑتا ہے، یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کر کے بت تراش مجسمہ یا بت وغیرہ بناتا ہے تو اس معنی کے رو سے بھی ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ولد میں صفات وکمالات کا جو سرمایہ بھی پایا جاتا ہے، اس میں والد کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قطعاً دخل نہیں ہوتا، والد بیچارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا ہے مرد بن کر پیدا ہوگا، یا عورت بن کر، اس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟۔

ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہوتا

یہ پہلی قابل غور بات ہو جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہو، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہ ہو کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے، کسی معنی اور کسی حیثیت سے مخلوق نہیں ہے۔

ولد اپنے والد کا ہم جنس ہوتا ہو

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضا ہے، اسے بھی سوچئے، آپ جانتے ہیں کہ گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہوگی وہ گھوڑا ہی ہوگی، اور جیسے گھوڑے سے ... نہیں، بلکہ گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے، یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد و ولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو،

آخر نطفے سے چھچھوندر اور چوہے سے چیل، گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا ہے؟

عقیدۂ ولدیت کے لوازم یہ دونوں مقدمات جو بداہۃً بغیر کسی تاویل و توجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں ان کو سامنے رکھ لیجئے، اور اب سوچئے کہ اللہ یا خالق عالم (تعالیٰ عما یقولون علواً کبیراً) کے لیے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعوے کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے، اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد انھوں نے کس چیز پر قائم رکھی ہے؟ یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہو جو خدا کی مخلوق نہیں ہے، نہ خود خدا کی مخلوق ہو اور نہ اس کے صفات و کمالات خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں، یہ تو عقیدہ ولدیت کا سلبی پہلو ہوا یعنی ولد، ولد کی ذات، اس کے صفات و کمالات، اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں، یعنی خدا کے وہ مخلوق نہیں ہیں، یہ تو پہلے مقدمہ کا اقتضا رہا۔

اور دوسرا مقدمہ، یعنی وہی بات کہ گھوڑے سے گھوڑا، ہاتھی سے ہاتھی، اونٹ سے اونٹ ہی پیدا ہوتا ہے، تو قانون ولادت کے تحت خدا سے (العیاذ باللہ) پیدا ہونے والا ولد بجز خدا کے اور کیا ہوگا؟

"گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے" اس کا مطلب جیسے یہ ہے (اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے) کہ پیدا ہونے والے (ولد) گھوڑے میں گھوڑا پنے کے ان سارے صفات و لوازم کا ظہور ضروری اور ناگزیر ہو جو اس کے والد گھوڑے میں پائے جاتے ہیں، تو خدا کے لیے ولد [کا عقیدہ رکھنے] کے کیا یہی معنے نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

لفظ "ولد" کا فائدہ یہ ہے وہ مہیب و مدہش شکل اس عقیدے کی جس پر عیسائیت کی بنیاد قائم ہے، اس حقیقت سے سچ پوچھئے تو "ولد" ہی کا یہ لفظ پردہ ہٹا سکتا تھا۔ ورنہ ابن کا لفظ جسے عموماً ولد کا مرادف سمجھا جاتا ہے، خود اس لفظ کی ساخت میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہے جس کے سوراخ سے عیسائیت کی اس بھیانک اور مکروہ ترین شکل کو ہم جھانک سکتے.......

ابن اور ولد کا فرق بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے ولد یعنی زائیدہ اولاد سے محبت اور شفقت وغیرہ کے جس تعلق کو آدمی نظر انداز رکھتا ہے، یہی تعلق کسی ایسی ہستی سے اگر پیدا ہو جائے جو ولد نہ ہو تو ابن کے لفظ سے اس کو مخاطب کرنے کا عربی میں معلوم ہوتا ہو، کہ عام رواج تھا، خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نحن ابناء اللہ (ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں) یہود بھی اس کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ دوسری نسلوں کے مقابلہ میں اسرائیل کی اولاد یعنی بنی اسرائیل سے خدا اسی قسم کا ربط اور تعلق رکھتا ہو جو کسی بیٹے کے ساتھ باپ کا ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنے آپ کو یہودی "خدازادہ" یا ولد اللہ (العیا

باللہ، نہیں سمجھے تھے، بلکہ "بارگاہِ رب العزت میں غیر معمولی امتیازی مقام ہم رکھتے ہیں" وہ اس کے مدعی تھے اور
اسی کی تعبیر نحن ابناء اللہ سے کرتے تھے، قرآن میں حضرت یہ فرماتے ہوئے کہ :-

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ۔

کہہ دو کہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے خدا تمہیں سزا کیوں دیتا ہو، بلکہ تم آدمی ہو، ان ہی چیزوں میں سے ایک جز ہو جنھیں خدا نے پیدا کیا۔

ان کے اس دعوے پر اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

آخر "ابن اللہ" کا دعویٰ اور "ولد اللہ" کا دعویٰ دونوں کا مآل ایک ہی اگر قرار دیا جائے تو پھر عیسائیوں کی اس عقیدے کے ساتھ خصوصیت ہی کیا باقی رہتی ہو۔ "ابناء اللہ" ہونے کے مدعی تو قرآن ہی کے رو سے خود یہودی بھی تھے۔

عیسائیوں کے عقیدے میں لفظ ولد کے استعمال سے قرآن کا مقصد

کچھ بھی ہو، ولد کا قرآنی لفظ جس کا بار بار اعادہ تقریباً ہر اس موقع پر کیا گیا ہو جہاں جہاں عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہو، میرے نزدیک براہ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہو کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہو جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہو، اور سارے خدائی صفات و کمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو، اگرچہ عیسائی اس کو اللہ نہیں، بلکہ ولد اللہ کہتے ہیں، مگر ولد اللہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہو کہ وہ بھی اللہ ہے۔

شرک کے تمام مذاہب میں توحید خالق کا اعتقاد

اس میں شک نہیں کہ الٰہیات (یا دوسرے الفاظ میں چاہیے تو کہیے کہ حق تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل) میں طرح طرح کے شاخسانے مختلف زمانوں میں نکالے گئے، شرک و بت پرستی اور ان کی بے شمار گوناگوں پیچیدہ شکلوں میں قومیں ان ہی شاخسانوں کی راہ سے الجھتی رہی ہیں، مگر تاریخ کی شہادت یہی ہو کہ شرک کی بدترین شکلوں میں بھی اس کا یقین کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے، دلوں سے کبھی نہیں نکلا، تاریخ مذاہب کا جو طومار آج دنیا میں موجود ہو اس میں صرف ایران کے ایک فرقہ مجوس نامی کے متعلق کچھ اہرمن و یزدان یا نور و ظلمت کے عقیدے کو منسوب کر کے کہنے والے کہتے ہیں کہ بجائے ایک کے دو ہستیاں مجوسیوں کے نزدیک ایسی مانی جاتی ہیں جن میں کوئی ایک دوسرے کا خالق نہیں، بلکہ کائنات کی بعض چیزوں کو کہتے ہیں کہ یزدان نے پیدا کیا ہو اور بعضوں کو اہرمن نے، یا ان میں بعض نور سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض ظلمت سے، اگرچہ مجوسیوں کی طرف اس عقیدے کے انتساب کو تحقیق نے افترا قرار دیا ہے، لیکن مان بھی لیا جائے کہ مجوسی کسی زمانے میں اس کے قائل بھی رہے ہوں، تاہم ان کی بات اتنی

بودی اور پھسپھسی تھی کہ ہلکی سی ذہنی چوٹ چونکانے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔[1]

[بہرحال] "شرک" کی پوری تاریخ ایک سے زائد خالق کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے، بحر و بر کے کونے کونے کو لوگوں نے چھان مارا، مگر جہاں کہیں انسانی آبادی ملی وہاں خالقِ عالم کی توحید کا عقیدہ بھی ملا، اور خالق کے سوا جن چیزوں کو بھی بنی آدم نے مختلف زمانوں میں پوجا یا اپنی امیدوں کا ماویٰ ملجا اور ٹھکانا ان کو ٹھہرایا تو [اس مغالطہ کی بنا پر] ٹھہرایا کہ باوجود مخلوق ہونے کے زندگی کے مشکلات کے حل میں ان کو دخل ہو۔

مشرکین کے مغالطہ کی بنیاد

مگر اس مغالطہ کی بنیاد بھی صرف ایک لفظ کے نہ سمجھنے پر موقوف ہے۔ یعنی خود "مخلوق" کا لفظ۔

مخلوق کا غیر مخلوق پر قیاس

ایسی ہستی جو مخلوق ہو اس کے تعلق کی نوعیت اپنے خالق کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟ یا اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ لوگوں نے سامنے کی مثالوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کر لی اور یہی بے بنیاد رائے سارے مغالطوں کی بنیاد بنی ہوئی ہو، یعنی ان کے سامنے یا تو ایسی چیزیں ہیں، جن میں کوئی دوسرے کی مخلوق نہیں ہے، مثلاً زید اور عمرو دو آدمی ہیں، ظاہر ہے کہ نہ زید ہی عمرو کا مخلوق ہو اور نہ عمرو زید کا، ہم اسی قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زید و عمرو ان دو ہستیوں کے تعلق کی جو نوعیت ہو، کچھ یہی نوعیت یا اسی قسم کی

---

[1] ان کی طرف اس عقیدہ کی توجیہ میں بڑی سے بڑی بات جو منسوب کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عالم کا موجودہ نظام خیر و شر یا بھلائیوں اور برائیوں سے بھرا ہوا ہے، پس خدا یا یزدان، جو خیرِ مطلق ہے اس سے یہ کیسے منسوب کیا جائے کہ تمام شرور اور برائیوں کا پیدا کرنے والا بھی یہی ہے؟ کہتے ہیں کہ ان ہی شرور اور برائیوں کی پیدائش کی تصحیح کے لیے اہرمن کے وجود کا یزدان کے ساتھ اضافہ کیا گیا تھا؛ مگر ذرا سوچئے بھلائی اور برائی کے جن صفات کو ہم دنیا کی چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کی واقعی حالت کیا ہے، در اصل ایک ہی چیز ہوتی ہے، مثلاً "آگ" ہے، جب تک ہمارا کھانا پکاتی ہے، ہمیں روشنی بخشتی ہے تو ہم اس کو خیر ٹھہراتے ہیں، مگر اسی آگ سے جب ہمیں کبھی نقصان پہونچتا ہے، گھر جل اٹھتے ہیں، جانور یا آدمی بھننے لگتے ہیں تو اسی آگ کو ہم بدترین چیز ٹھہرانے لگتے ہیں۔ الغرض استعمال کے اختلاف سے ایک ہی چیز ہوتی ہے جو کبھی خیر، کبھی شر بنی رہتی ہے، غریب مجوسیوں نے خیال کر لیا کہ شر و خیر کے الفاظ جیسے الگ الگ ہیں۔ اسی طرح واقع میں بھی شر کا وجود خیر سے اور خیر کا وجود شر سے الگ ہو کر اس عالم میں پایا جاتا ہے، مگر اس لفظی مغالطہ پر متنبہ ہو جانے کے بعد کہ ایک ہی چیز اس عالم کی شر بھی بنی رہتی ہے، اور خیر بھی، کیا ایک مخلوق کے دو خالق کی تلاش کا جذبہ ان میں زندہ رہ سکتا ہے؟

نوعیت خالق ومخلوق کے تعلق کی بھی ہوگی، یا زیادہ سے زیادہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اسی قسم کی چیزیں جن میں کوئی دوسرے کا خالق تو نہیں ہے، لیکن ان میں صنعتی تعلق کبھی جو پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً پتھر کو صنعتی کاریگری سے بت تراش مجسمہ بنا لیتا ہے، یا اینٹ چونے گچ کو جوڑ کر معمار مکان تیار کر لیتا ہے، لکڑی کے ٹکڑوں کو خراش تراش کے عمل سے بڑھئی کرسی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ صانع اور مصنوع میں جو تعلق اور رشتہ پایا جاتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ خالق ومخلوق کے رشتہ اور تعلق کی نوعیت بھی کچھ یہی ہوگی، حالانکہ پہلی صورت ہو یا دوسری، خالق ومخلوق کے تعلق کو سمجھنے میں جب ان سے مدد لی جائے گی تو حقیقت نظر کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گی۔ اور طرح طرح کی الجھنوں میں آدمی مبتلا ہو کر رہ جائے گا۔

جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ صانع ہو یا مصنوع، یا صانع ومصنوع کا تعلق نہ ہو، کسی حال میں بھی ایک کا وجود دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا، جن چیزوں میں صانع ومصنوع کا تعلق نہیں ہو ان کا حال تو ظاہر ہی ہے، باقی خود صانع ومصنوع میں بھی دیکھئے، پتھر یا لکڑی، یا اینٹ چونا وغیرہ، جن پر صانع صنعتی عمل کرتا ہے، ان میں کوئی بھی ایسا ہے جسے صانع اور کاریگر وجود اور ہستی عطا کرتا ہو، یعنی نیست سے ہست یا جو چیز معدوم اور نیست مطلق تھی اس کو موجود کیا ہو؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں جو قدرتی صلاحیتیں پہلے سے پائی جاتی ہیں صانع اور کاریگر ان ہی صلاحیتوں کو صنعتی عمل سے ظاہر کر دیتا ہے۔ پتھر میں بت بننے کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی، بت تراش اسی صلاحیت کو فعلیت کا رنگ عطا کر دیتا ہے، آخر اسی صنعتی عمل سے کیا ہوا کے کسی ٹکڑے سے وہ بت بنا کر دکھا سکتا ہے؟

خالق ومخلوق کی صحیح مثال

خالق ومخلوق کی کوئی مثال چونکہ سامنے کی چیزوں میں نہیں پائی جاتی، اسی لیے غلط مثالوں کا سہارا لے کر شعوری یا غیر شعوری فیصلہ ہر شخص خالق ومخلوق یا خدا اور عالم کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے حالانکہ مثل نہ سہی، مثال اس کی آدمی کے باہر نہ سہی، اندر میں خود پائی جاتی ہے، یعنی خیالی قوت سے بحالت بیداری یا [بحالت] خواب جن خیالی چیزوں کو اپنے اندر آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، کچھ ہلکی سی جھلک خالق و مخلوق کے تعلق کی اگر پائی جاتی ہے تو اسی خیالی مثال میں پائی جاتی ہے، تخیل کی قوت سے بغیر کسی مادہ کے جس وقت ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پیدا کرنے کا ارادہ اس خیالی مخلوق کی پیدائش کے لیے کافی ہوتا ہے، بڑی سے بڑی عمارت، پہاڑ، سمندر، آفتاب، ماہتاب کو عالم خیال میں آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، گو یہ بھی ایک ہلکی سی نامکمل مثال ہو۔ مگر ذرا سوچئے کہ ان خیالی مخلوقات کا تعلق ان کے خالق سے کیا ہوتا ہے، اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق بنا کر ہم جن چیزوں کو اپنے خیال میں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً دلی کی جامع مسجد کا خیال کیجئے

یعنی اپنے تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کیجئے، اور دیکھئے آپ کی یہ خیالی مخلوق اپنی ذات اپنے صفات اور حالات ہر اعتبار سے اپنی پیدائش میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کی محتاج نظر آئے گی" اور پیدا ہو جانے کے بعد بھی مسلسل اپنے قیام و بقاء میں اس کی ذات بھی، اس کے صفات بھی، حالات بھی آپ کی تخلیقی توجہ اور التفات کے دست نگر دکھائی دیں گے، جب تک اپنے تخیل کی قوت سے آپ اس کے قیوم بنے ہوئے اور اسے تھامے ہوئے ہیں وہ موجود ہوگی، جوں ہی توجہ و التفات کے اس سہارے سے وہ محروم ہوئی، اسی وقت وہ ناپید ہو کر رہ جائیگی۔

مخلوقیت کی حقیقت | الغرض کمزور آدمی کی مخلوق کا حال جب یہی ہے تو اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ قادر و مقتدر و اقعی جو عالم کا خالق حقیقی ہے، اس کے ساتھ اس کے مخلوقات کے احتیاجی تعلق کی نوعیت یقیناً اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوگی، اس کے مخلوقات میں خود مخلوقات کا کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ خالق کا ہوتا ہے، ان کا وجود بھی ان کی ذات بھی، ان کے صفات بھی، ان کے افعال بھی ہر لمحہ ہر لحظہ مسلسل صرف خالق کے فیض توجہ کے ساتھ بندھے پھندے رہتے ہیں۔ "مخلوقیت" کا حقیقی ترجمہ یہی احتیاج مطلق ہے، جس پر "مخلوقات" کی یہ حقیقت کھل جاتی ہے، وہ ان سے اسی حد تک بے نیازی اپنے اندر پانے لگتا ہے کہ ان سے لین دین کے مراسم تو بڑی بات ہے، ان مخلوقات کے وجود تک میں اس کو شبہ ہونے لگتا ہے، اور شبہ کیا بعض تو ایسی یافت کے بعد چیخ اٹھے ہیں، کہ ع

گر او ہست حقا کہ من نیستم[1]

بہرحال باوجود اجمال کے پھر بھی یہ ذیلی گفتگو کچھ زیادہ طویل ہوگئی، ورنہ یہ عرض کر رہا تھا کہ "مخلوق" کو مخلوق مان کر اس کو "معبود" بنانے کی غلطی میں آدمی اسی وقت تک شاید مبتلا رہ سکتا ہو جب تک کہ اس پر "مخلوقیت" کی اصل حقیقت صحیح معنوں میں منکشف نہ ہوئی ہو، مگر "خالق و مخلوق" کے باہمی تعلق کو سمجھ لینے کے بعد جب اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ "مخلوقیت" دراصل خالص بے چارگی، اور حد سے گذری ہوئی بے بسی کا نام ہو تو جن مثالی مغالطوں سے پھسل کر شرک کی اندھیری کھائی میں آدمی گر پڑتا ہے، اس سے اچانک باہر نکل آتا ہے، آخر ایسے "معبود" کو آدمی کب تک پوجتا چلا جائے گا، جس کے متعلق جانتا ہو کہ وہ خود اپنے وجود اپنی ذات، اپنے صفات، اپنے افعال، سب میں دوسرے کا دست نگر اور دوسرے کے ارادے کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

عیسائیوں کے شرک کی انفرادیت اور پیچیدگی | اسی لیے شرک اور مشرکیت کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سواہر

---

[1] یہ بڑا تفصیل طلب مسئلہ ہے "مخلوقیت" کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کا اجمالی تذکرہ بیان کر دیا گیا زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو خاکسار کی کتاب "الدین القیم" میں مطالعہ فرمائیے۔"

معبود کو مخلوق مان کر معبود بنایا گیا ہے، ان کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہو، کم از کم اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری "شرک" کی اس عجیب و غریب قسم کی وجہ سے پیش آگئی جس کی بنیاد "ولدیت" کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا کسی ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہو جو مخلوق نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ ہے کہ "مولود" مان کر یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ خدا یعنی خالق عالم کی ذات تو ہمارے ہاں بھی ایک ہی ہے، حالانکہ آپ دیکھ چکے کہ "ولد اللہ" اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے، اور ولدیت کا لازمی اقتضا یہ ہو کہ اللہ کا ولد بھی (العیاذ باللہ) اللہ ہی ہو

دوسرا شرمناک پہلو | اور قصہ کچھ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا، اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ "نظریۂ ولدیت" کی بنیاد پر ولد کے متعلق ماننے والوں کو کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا، مگر دوسرا پہلو یعنی اسی "نظریۂ ولدیت" کے لحاظ سے خود والد کی طرف کن ناگفتہ امور کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بے بس ہیں، اب اسے [صرف چند لفظوں میں] ملاحظہ فرمائیے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ والد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی آدمی کے سامنے کر دیتا ہے، جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں ہم جن کے ذکر سے کیا معنے؟ خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں، مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بدترین، گھنونے نظریہ کا یہ نتیجہ ہو کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا، پہلی آیت، یعنی "لینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولدا" کا اب آگے چلئے۔

(۲)

ارشاد ہوا ہے:۔

مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ — نہیں ہو ان کو اس کا کچھ بھی علم، نہ ان کے باپ دادوں کو۔

بلا علم بے دلیل دعوے | سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہو؟ کھلی ہوئی بات ہو کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی براہ راست جاننے والے کو اس کا علم حاصل ہوا ہو، یا براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ، یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہونچی ہو، بالواسطہ یا بلا واسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں، اب غور فرمائیے کہ "نظریۂ ولدیت" یعنی بجائے مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہٗ کا "مولود" ٹھہرا لینا اور مولود ٹھہرا لینے کے بعد

انسانیت کے اس متفقہ کلی فیصلے کے خلاف کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے .... ایک خاص ذات کو خدا کی "مخلوقیت" کے دائرے سے خارج کر دینا، اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت تثلیث اور اللہ کو مان لینا، پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لیے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم کر لینا کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے، اور اس سلسلہ میں جن ناگفتہ بہ تصورات سے دل و دماغ کو گندہ کرنا پڑتا ہے. ان کو دینی عقیدے کی حیثیت دینی ایک پورا فلسفہ اسی ولدیت کا بنا لینا ہزاروں لاکھوں کتابوں کے سوا اسی عقیدے کی خیالی صورتوں کو معابد اور گرجوں کے در و دیوار پر تصویری لباس بھی عطا کرنا اور جہاں جہاں موقع ملتا چلا گیا، وہاں مجسموں اور سنگی و برنجی پیکروں میں بھی ان کو ڈھالنا.

سوال یہی ہے کہ اس سارے اعتقادی طوفان کے نیچے کسی حیثیت سے کسی جگہ، کسی منزل میں کوئی ایسی بات بھی نظر آتی ہے جس کے متعلق اعتقاد رکھنے والوں کا یہ گروہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہو کہ براہ راست اس بات کا علم اسے حاصل ہوا، یا اسے نہیں تو اس کے باپ دادوں میں کوئی ایسا گزرا جسے اس سلسلہ میں کسی قسم کے مشاہدے تجربے کا کسی حیثیت سے کبھی موقع میسر آیا تھا.

کتنے مہیب، کتنے دہشت ناک، کتنے مکروہ اور گھناؤنے، ناگفتہ بہ دعووں پر "ولدیت" کا یہ عقیدہ مشتمل ہے، لیکن عقیدہ رکھنے والے انصاف سے بتائیں کہ ان میں سے کل نہیں کسی ایک ہی جزء کے جاننے کا بلا واسطہ یا بالواسطہ دعویٰ وہ کر سکتے ہیں؟ انھوں نے اپنے اوپر کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں لادی ہیں، خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کے خارج ہونے کے مدعی ہیں، اللہ کے ساتھ معناً ایک نئے اللہ کا اضافہ کر رہے ہیں. ملک الملک القدوس کی طرف وہ ایسی باتوں کو منسوب کر رہے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں شاید وہ خود بھی سوچ نہیں سکتے. مگر ان ذمہ داریوں کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے، آپ دیکھ رہے ہیں "کچھ نہیں" کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

زیادہ سے زیادہ | زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے کی یہ جرأت اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب بغیر "والد" کے "والدہ" (مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام) سے پیدا ہوئے تو آخر ان کا والد کس کو ٹھہرایا جائے؟ سوال تو خیر ایک حد تک پیدا ہو سکتا ہے، مگر ابھی سوال سے نہیں، بحث جواب سے ہے، یعنی یہ کہہ دینا کہ جب انسانوں میں ان کا کوئی والد نہ تھا، تو ہم نے اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا والد مان لیا. اسی جواب کے متعلق میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا زید کا باپ، اگر عمرو نہ ہو تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ زید کا باپ بکر ہے، خود سوچئے کیا ایسا دعویٰ علم پر مبنی ہو گا؟ پھر اتنی بات کہ کوئی آدمی حضرت مسیح (علیہ السلام) کا باپ نہ تھا، محض اس سے منطقی نتیجہ کیسے نکل آیا کہ آدمی جس کا باپ نہ ہو اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے؟

(۳)

عقیدۂ ولدیت پر قرآن کی پرزور تنقید

اور اب اس کے بعد اندازہ کیجئے اس تیسری آیت[1] کے صحیح وزن کا جو مذکورہ بالا دو آیتوں کے بعد ہو یعنی نظریۂ "ولدیت" کے متعلق یہ بتانے کے بعد کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے۔ قرآن نے

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝

بہت بڑی بات ہو جو ان کے (عیسائیوں کے) منھ سے نکل رہی ہے، نہیں بول رہے ہیں وہ مگر صرف جھوٹ۔

کے پرزور الفاظ میں جو تنقید کی ہے، کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہو؟ اس سے بڑی بات خود سوچئے اور کیا ہوگی کہ ایک ایسی بادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی، اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کرکے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط، مہمل سے مہمل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریۂ ولدیت کے معتقدوں کے منھ سے نکل رہی ہو، اور کمال یہ ہو کہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہو، بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کو یہ حاصل نہیں کر سکتے، نہ خود اپنے حواس کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں، اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو، اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہو، واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے، بجز تردید کے عقل کی راہ میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا۔

اور یہ تو خیر "نظریۂ ولدیت" کی وہ باتیں ہیں، جو "ولدیت" کے اس لفظ سے پیدا ہو رہی ہیں، باقی اس عقیدے سے خود اس عقیدے کے ماننے والوں کی آئندہ تاریخ کو، اور ان کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو جن روح گداز، جاں فرسا، حوادث و واقعات سے گزرنا پڑا اور گزرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل اس اشارے میں ملے گی جو اسی کے بعد والی آیت میں کیا گیا ہو۔

---

[1] واضح رہے کہ ان آیات پر بحث شروع کرتے وقت مولانا نے ان کو چار الگ الگ آیتیں قرار دیا تھا مگر یہاں "تیسری آیت" میں وہ فقرہ بھی شامل ہے جسکو وہاں چوتھی آیت قرار دیا تھا۔ مرتب

"عقیدۂ ولدیت" کے روح فرسا آثار و نتائج

"تو کیا ایسا ہو گا کہ تم اپنی جان کے کھونے والے بن جاؤ گے، ان کے (یعنی عقیدۂ ولدیت کے ماننے والوں کے) آثار پر، اگر نہ ایمان لائے وہ اس بات (قرآن) پر، مارے غم واندوہ کے۔"

سورۂ کہف اٹھایئے، آگے آپ کو یہ آیت ملے گی، یعنی

"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا"

پیشانی کی عبارت اسی قرآنی آیت کا حاصل اور ترجمہ ہے۔

پوری سورت کی اہم ترین آیت اور اہم ترین لفظ یوں تو سورۂ کہف اوّل سے آخر تک عجیب وغریب اشارات پر مشتمل ہے، لیکن کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سورۃ میں بھی یہ آیت اور آیت میں بھی "آثارھم" کا جز وغیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔

آثار کی لغوی تشریح آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے، جو اردو میں بھی مستعمل ہے، جس [کی وجہ] سے شائد وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے، جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے، لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے "منتہی الارب" میں ہے۔

"اثر بقیہ چیزے ونشاں"

آگے بیان کیا ہے کہ نقشِ قدم کو بھی اسی لیے اثر کہتے ہیں، پھر عربی کا ایک محاورہ نقل کیا ہے، کہتے ہیں "اثراً بعد عین" در حق کسے گویند کہ حاصل از دست دادہ آثار ونشان او طلب نماید" یعنی اپنی چیز کوئی کھو بیٹھا ہو، اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد چیز اپنے جن نتائج اور نشانوں کو چھوڑتی ہے، ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں آثار کے لفظ سے کرتے ہیں، یہ لغوی تشریح تو آثار کے لفظ کی ہوئی۔

"باخع" کی تشریح دوسرا لفظ آیت میں باخع کا ہے، جس کا مادہ بخع ہے، عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا کر دیا جاتا ہے، مگر عربی زبان کے اپنے محاورے اور زبان زد فقرے مثلاً "بخع الارض بالزراعۃ" جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کہ، روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی، اسی طرح "بخع الرکیۃ" اس وقت بولتے ہیں جب

کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہونچ جائے جہاں سے پانی اُبلنے لگے بہرحال کسی معاملہ میں جد وجہد کو اس کے آخری حدود تک پہونچا دینا بخع کے عربی لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

لفظ "اسف" کی تشریح | تیسرا لفظ اسف کا ہے، غم و اندوہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم و اندوہ حزن و ملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے، لیکن یہی کیفیت جب آخری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بے چینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جا سکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر نہ پائی جاتی ہو، عربی میں، اس کو ارض اسیفۃ کہتے ہیں۔

خلاصہ آیت | ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجۂ بالا آیت کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لا کر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم و عمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی، تو خود [اپنے اوپر] نہیں بلکہ عقیدۂ ولدیت رکھنے والی اور اس پر اصرار کرنے والی یہ امت، اپنے پیچھے جن نتائج و عواقب یا آثار کو پیدا کر کے دنیا میں چھوڑتی چلی جائے گی ان پر، ان کے تصور سے صاحب وحی مہبطِ قرآن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر غم و الم کرب و قلق کی ایسی غیر معمولی کیفیت کا طوفان برپا تھا کہ اس راہ میں اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی اور جان تک کو قربان کرنے پر آپ آمادہ تھے۔

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا، اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح جنچے تلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اسی سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

"آثارھم" کی تاریخی تفصیل | پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ نفسیاتی کیفیت اگر واقعہ تھا، اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے، تو سوال یہ ہوتا ہے کہ "عقیدۂ ولدیت" کے وہ مہیب روح فرسا، جاں گداز آثار و نتائج کیا تھے، جن سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حد تک متاثر تھے، یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لیے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ و تامل کا مستحق "آثارھم" کا جزو ہے، اور اب میں اسی "آثارھم" کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ آثار، اور ھم ان دو لفظوں میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک خاص طبقہ کی ایک طویل تاریخ کو بند کر دیا ہے۔

عقیدۂ ولدیت کو کیسے منوایا گیا؟ | مطلب یہ ہو کہ "عقیدۂ ولدیت" یا کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا ٹھہرانا خواہ آدمی کے عقلی اور جذباتی اقتضاؤں کے لیے جس حد تک ناقابل برداشت ہو، دماغ سے بھی ٹکرا کر یہ خیال واپس ہو جاتا ہو، اور دل بھی اسے اگل دیتا ہو[1]

[1] کلمۃ تخرج من افواھھم" (بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہو) اس میں (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر کیا کیجئے آدمی جب طے ہی کر لیتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بہر حال مان ہی کر رہیں گے، تو کوئی نہ کوئی راہ اس کی نکال ہی لیتا ہے۔

مذہب کے متعلق ایک مسلّمہ مذہب کے متعلق اتنی بات تو بہر حال مسلّم ہے کہ حواس و عقل کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں وہیں سے راہ نمائی کا فرض مذہب ادا کرتا ہے، فطرتِ انسانی کے جن بنیادی سوالوں کے جواب عقلی دسترس سے باہر ہیں، ان کے حل کا ذمہ دار مذہب ہے، یہ ایک واقعہ ہے اور مذہب کی ضرورت اُس کے اسی فرض کی بجاآوری میں پوشیدہ ہے، اسی واقعہ کی تعبیر میں عموماً کہنے والے اس قسم کی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ "مذہب ماوراء عقل یا دین وراء طور عقل ہے"۔ یعنی عقل سے بالاتر حدود کے سوالوں کے جواب سے اس کا تعلق ہے، لیکن ظاہر کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہے کہ بشری جبلت کی بے چینیوں کی تسکین کا جو سامان اپنے پیش کردہ جوابوں سے مذہب کرتا ہو یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے ماننے کی گنجائش آدمی کی عقل اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتی۔

[بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ] جن بنیادی سوالوں کو ہم مذہب کی روشنی میں حل کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ، ان سوالوں کے جوابوں کے علم یا جاننے کا ذریعہ نہ ہم اپنے حواس کو بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی عقل کو، لیکن ایمان یعنی ان جوابوں کے ماننے کی صلاحیت ہم میں ہونی چاہیئے، ورنہ جن باتوں کے ماننے کی بھی صلاحیت ہم میں نہ ہوگی تو ان ہی پر ایمان لانے یا ان کے ماننے کا مطالبہ مذہب کی طرف سے کیسے پیش ہو سکتا ہو؟ کیا آنکھ کو سننے کا اور کان کو دیکھنے کا مکلّف بنایا جا سکتا ہے؟۔

مسیحیوں کا نرالا اصول مذہب اور مذہبی حقائق وامور کے متعلق مذکورۂ بالا اصول ایک ایسی جانی پہچانی بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مقابلہ و موازنہ میں عموماً دنیا اسی اصول سے کام لیتی رہی ہے لیکن اسی یورپ میں [جس نے پچھلے دنوں، مذہبی امور کو ماننے کے لیے، عقل و حواس سے ان کو جاننے کی شرط کا فتنہ اٹھایا ہے] اسی مسئلہ کا سہارا لے کر کہ مذہب میں عقل کو دخل ہے یا نہیں، ایک مدت تک نفی کے پہلو کو متعین کر کے یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ مذہب کی سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کے ماننے کی صلاحیت بھی آدمی کی عقل و فطرت میں نہ ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۹) "افواہ" یعنی منھ کی طرف جو اسکو منسوب کیا گیا ہے، اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہو کہ اس عقیدہ کا تعلق نہ دل سے ہو اور نہ دماغ سے، بلکہ عقیدہ رکھنے والوں کے منھ سے ایک بات نکلتی ہے، ابتدا بھی اس کی منھ سے ہو اور انتہا بھی منھ سے آگے اس کی نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

کہا جاتا تھا کہ اس معیار پر سب سے بڑی صداقت "عقیدۂ ولدیت" ہے اسی کی جامع تعبیر یہ تھی کہ "تین ایک ہے اور ایک تین ہے" یہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے، اس لیے سب سے بڑی سچائی ہے کہ عقل ہو یا فطرت اس کے ہضم کرنے سے قطعاً معذور ہے۔ یوں سب سے بڑے جھوٹ کو سب سے بڑی سچائی کا قالب عطا کر دیا گیا۔

بہرحال اسی کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا کہ ایسا مسئلہ جو دماغ کے لیے بھی ٹھیس اور دل کے لیے بھی صرف ٹھوکر ہو، وہ ماننے والوں کے "افواہ" یا دہنی دائرے ہی میں گھومتا رہے۔

عقیدۂ ولدیت اور کلیسا اگر خود یہ مسئلہ تو "افواہ" کے چکروں ہی میں گھومتا رہا، لیکن اس سے پھوٹ پھوٹ کر جڑوں، جڑوں کے باریک باریک ریشوں اور رگوں کا ایک طویل سلسلہ اندر ہی اندر ماننے والوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور جوں ہی کہ کچھ سازگار حالات میسر آئے ان ہی جڑوں سے شاخیں نکلیں، برگ و بار آئے، آخر میں

"کلیسا"

کے نام سے مذہبی دنیا میں ایک ایسے تناور بلند و بالا گھنے درخت کی شکل اس نے اختیار کر لی جس کی نظیر مذاہب و ادیان کی تاریخ میں نہ پہلے ملتی ہے اور شاید اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بعد کو بھی اس کی مثال مشکل ہی سے ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔

بظاہر عیسائی دنیا کلیسا کی اس چھاؤں کے نیچے سمٹی ہوئی سمجھی جاتی تھی، لیکن درحقیقت وہ ان جڑوں میں جکڑی ہوئی تھی، جو اندر ہی اندر پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی زنجیروں، لوہے کی زنجیروں کی طرح سر سے کر پاؤں تک عیسائیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

کلیسائی نظام اور یورپ میں دین صلیبی کے داخلہ کی سرگزشت "کلیسا" کا نظام کیسے قائم ہوا، ابتداءً اس کی کس شکل میں ہوئی، یہودیوں یا اولادِ اسرائیل کے محدود دائرے سے نکال کر عیسائیت کے پیغام کو یورپ کی غیر مختون غیر اسرائیلی قوموں میں پہونچانے میں تدبیر کرنے والوں نے کن کن گفتہ و ناگفتہ بہ تدبیروں سے کام لیا۔ شاول جس کا نام بعد کو پولس اور آج کل سینٹ پال ہے، یہ شخص کون تھا، ایشیاء کوچک کے صوبہ کلکیہ کے شہر ترسیس (اپنے مولد) سے یہ فلسطین کیسے پہونچا، اور وہاں یہودی علماء کے وفادار شاگرد کی صورت اختیار کر کے مسیح کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ پہلے جو اس نے توڑے، اور آخر میں عیسائیوں کو ستانے کے لیے ہیکل کے یہودی علماء کے تصدیقی خطوط لے کر جب وہ دمشق جا رہا تھا تو اچانک اس کا یہ دعویٰ کہ مسیح علیہ السلام کی روح اس پر متجلی ہوئی، اور غیبی آواز آئی۔

"اے شاؤل اے شاؤل تو مجھے کیوں ستاتا ہے"

پھر جیسا کہ اس کا بیان ہے اُس کے یہ پوچھنے پر اے خداوند تو کون ہے؟ اُسے یہ جواب ملا کہ :-

"میں یسوع ہوں، جسے تو ستاتا ہے، مگر اُٹھ شہر میں جا، اور تجھے
جو کرنا چاہیئے، وہ تجھ سے کہا جائے گا۔" (اعمال ۹/۵-۶)

پھر بجائے دشمن کے مسیحیت کا مبشر اور منادی کرنیوالا وہ کیسے بن گیا؟ کہاں کہاں پھرا، اور آخر میں بعہد شاہ نیرو رومیوں کے دارالسلطنت رومتہ الکبریٰ میں قیدیوں کی شکل میں وہ کیسے پہونچا، وہیں وہ مارا گیا، دفن ہوا، پھر اس کے مدفن اور اس کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری پطرس[1] کی جعلی قبر کا دعویٰ کر کے رومہ میں عیسائیت کا مرکز کیسے قائم کیا گیا، جس نے آخر میں "کلیسائے رومہ" کا نام پایا۔ اور اسی رومی کلیسا کی اجتماعی طاقت کا شخصی مظہر یا اقتدار اعلیٰ پوپ کے نام سے گدی پر کیسے آگیا۔ پھر ایک کے بعد ایک اسی طرح پوپوں کی جانشینی کا سلسلہ شروع ہوا، رفتہ رفتہ بالآخر کلیسائے روم کے پوپ کا اقتدار مطلق، اور اس کے غیر محدود اختیارات عروج کے اس نقطہ تک پہونچ گئے کہ ان کے آگے عوام تو عوام سلاطین اور بادشاہوں کی بھی نہیں چلتی تھی، یورپ کے عیسائیوں کی جان ومال عزت و آبرو کے مالک پوپ اور پوپ کے وہ نمائندے تھے جو اس ملک کے طول وعرض میں گرجے بنا بنا کر کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے، سب کماتے تھے، اور وہ کھاتے تھے۔

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کے جواب کے لیے ہزارہا ہزار صفحات کی ضرورت ہے، تفصیل کے لیے تو یورپ کی عام تاریخ اور کلیسائے رومہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے، لیکن بطور نمونہ کے چند تاریخی شواہد کا پیش کر دینا غالباً ان لوگوں کیلئے مناسب ہوگا جنھوں نے "دین صلیبی" اور یورپ جس صورت حال سے اس دین کے داخل ہونے کے بعد دوچار ہوا، اس کی تاریخی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

---

[1] کلیسائے رومہ کی عظمت کا زیادہ تر دارومدار مدت تک پطرس کا مصنوعی مدفن تھا، لیکن حال میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا ہے، اب سمجھا جاتا ہے کہ پطرس عراق اور ایران کے درمیانی علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کرتے ہوئے کہیں مر گیا، سینٹ پال اور پطرس میں اختلافی نقطۂ نظر یہی تھا کہ پال کے نزدیک "حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا" محض یہی نجات کے لیے کافی ہے۔ لیکن پطرس موسوی شریعت کے احکام کی تعمیل ضروری قرار دیتا تھا، جرمنی کے ارباب تحقیق کچھ دن ہوئے اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ سینٹ پال کی ساختہ پرداختہ عیسائیت، حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کردہ عیسائیت سے مختلف تھی، اور یہ اختلاف شروع ہی سے چلا آرہا تھا۔

(دیکھو تاریخ بائبل ملکی ترجمہ طالب الدین ص۲۰۵)

کلیسا کا غیر معمولی اقتدار اور عجیب و غریب ہتھکنڈے

مختصر یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک تو سینٹ پال کا پھیلایا ہوا "صلیبی دین" اور نظریہ ولدیت کے ساتھ کفارہ کا مسئلہ[1]، اندر ہی اندر یورپ کے باشندوں میں پھیلتا رہا۔ بت پرست رومی حکومت نے اس جدید دینی تحریک کی مخالفت میں اپنا آخری زور صرف کر دیا، مگر جتنا اس کو دبایا جاتا تھا اسی قوت کے ساتھ یہ تحریک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تا اینکہ تین سو سال بعد کہتے ہیں کہ بت پرست رومی بادشاہ قسطنطین نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ خود اس دین کو وہ قبول کر لے، گویا یوں رومی حکومت بجائے دشمن کے صلیبی دین کی دوست اور پشت پناہ بن گئی۔ حکومت کی اسی پشت پناہی کے زیر اثر رومہ کے کلیسا کا اقتدار غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔

جعلی وثیقہ

یورپ کی مستند تاریخ جس کے مصنف گرانٹ صاحب ہیں اپنی کتاب میں انھوں نے چند وثائق کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق کلیسائے رومہ کا دعویٰ تھا کہ وقتاً فوقتاً رومی حکومت کی طرف سے اسے عطا ہوئے جن میں ایک مشہور قدیم وثیقہ وہی ہے جس کا نام "عطیۂ قسطنطین" تھا، گرانٹ صاحب نے اس کا ترجمہ یہ درج کیا ہے :-

"شاہنشاہ کانس ٹن ٹائن (قسطنطین) وفادار، رحمدل، قادر و نیک منش بادشاہ اقوام المانی و سریانی و جرمانی و برطانی و ہونی، پارسا و خوش نصیب فاتح و غازی و ذی شاہی، مرضِ جذام میں مبتلا تھا، اور بت پرست پجاریوں نے اسکو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں نہیں ہو سکتی، مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اُسے صحت حاصل ہوئی، اور صحت یابی کے شکریہ میں اس نے حکم دیا کہ کلیسا رومہ کا "قسیس اعلیٰ" تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا، اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات رومہ

---

[1] کہا جاتا تھا کہ ایک گناہ کی دو دو سزائیں خدا کی طرف سے نہیں مل سکتیں، اپنے ماننے والوں کے گناہ کی سزا میں مسیح جب ایک دفعہ صلیب پا کر سزا جھیل چکا تو ماننے والوں کو ان کے ان ہی گناہوں کی سزا دوبارہ کیسے دی جا سکتی ہے۔ یہی کفارہ کا مسئلہ ہے ـــــ مسیحی دنیا میں یہ سوال و جواب یعنی "میں کیا کروں کہ نجات پاؤں؟" "تو مسیح یسوع پر ایمان لا تو بچ جائے گا" ایک عام زبان زد فقرے کی حیثیت سے مشہور ہو۔ ۱۲ [یہ حاشیہ اس سے پہلے ایک مقام پر کفارے کے متعلق مولانا مرحوم نے تحریر فرمایا تھا وہ مقام حذف کر دیا گیا ہے اور وہاں کے حاشیہ کو مسئلہ کفارہ کی توضیح کے لیے یہاں درج کر دیا گیا ہے۔ ع]

اور خود شہر رومہ اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک
غرب (یورپ) پر قابض رہے گا"۔

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے، اسی عطیۂ قسطنطین کے آخر میں یہ الفاظ بھی تھے:۔
"ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے"۔
(دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ صـ۲۰۲ ترجمہ اردو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

مطلب یہ تھا کہ رومہ جہاں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ، حضرت مسیح علیہ السلام کے براہِ راست صحابی یا حواری پطرس جن کا اصلی نام شمعون تھا، اُن کی درگاہ ہے، اور اسی کے ساتھ پولس یعنی سینٹ پال کا مدفن بھی وہیں بتایا جاتا تھا، [ان] دونوں درگاہوں کے مجاوروں کی طرف سے بادشاہ کو خوش خبری صحت کی سنائی گئی، صحت کے بعد یہ صلہ شاہی دربار سے ملا۔۔۔ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

"پندرھویں صدی عیسوی تک جب تک یورپ میں پھر علوم کا دور دورہ نہ ہوا کسی میں ہمت نہ تھی، کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے، یا اس کی صحت میں شک و شبہ کرے"۔
(صـ۲۵۱ کتاب مذکور)

بعد کو جو کچھ ہوا اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے، اتنی بات تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس کی درگاہ ہی کو اس زمانے میں فرضی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بقول گرانٹ صاحب ۸۶۰ء جس میں مذکورہ بالا وثیقہ کا اعلان کلیسا کی طرف سے کیا گیا تھا، اس وقت سے ہزار بارہ سو سال تک اس کے متعلق شک کا خیال بھی ارتداد و کفر کے ہم معنے تھا۔

اقتدار کی انتہا اور رایک یہی کیا، اسی قسم کے بیسیوں ذرائع مسلسل اختیار کیے گئے تا آنکہ بقول گرانٹ صاحب گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گری گوری ہفتم کے زمانہ میں کلیسا کی طرف سے یورپ کے حکمرانوں اور سلاطین و امرا و عام باشندوں کو خطاب کر کے یہ اعلان شائع کر دیا گیا، کہ:۔

"پاپائے رومہ کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسائے رومہ کو نہ کبھی دھوکہ ہوا ہے اور نہ ہوگا"۔

اسی میں یہ بھی تھا کہ:۔

"پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے، انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی، اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی"۔

"پوپ شاہنشاہوں کا آقا ہے۔"

(کتاب مذکور ص ۲۶۹)

اور یہ صرف دعویٰ ہی نہ تھا جنھوں نے یورپ کے قرون متوسطہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی واقعہ بھی تھا، اس قسم کی تحریریں جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہو عموماً پوپوں کی طرف سے بادشاہوں کو دھمکانے کے لیے شائع ہوتی رہتی تھیں، کہ :-

"خدا نے ہمیں (یعنی پوپ اور پوپ کے چیلے چانٹوں کو) بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کر دیں، اور اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں، اور نئی عمارت بنائیں۔"

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا، کہ :-

"اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کرسکتی ہے، اور اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو، تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔"

اور یوں یورپ کی ساری دنیاوی حکومتوں کے حکمران، روحانی حکمران یعنی پوپ اور پوپ کے نمائندوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ باچون وچرا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتے چلے جائیں، اس کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔

عام رعایا برایا ان ہی حکمرانوں کے قبضے میں تھی، اس لیے نتیجۃً یورپ کے عام باشندے کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جرات نہیں کرسکتے تھے۔

عوام کو براہ راست قابو میں لانے کے ہتھکنڈے | ماسوا اس کے "اعتراف گناہ" کا ایک طریقہ بھی کلیسا کی طرف سے عوام میں جاری کیا گیا تھا پوپ کے نمائندے ملک کے طول وعرض میں بیس بیس دو دو میل کے فاصلوں سے اپنے تھانے "چرچ" بنائے بیٹھے رہتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کی فہرست کی خلوت میں سماعت کریں اور جو معاوضہ طے ہو جاتا تھا اس کو لے لے کر مغفرت اور بخشش کا لائسنس توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا، اس مغفرت نامہ کو تاریخوں میں آج بھی لوگ نقل کرتے ہیں جو مقامی گرجوں سے توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا، جو یہ ہوتا تھا کہ :-

"ہمارا رب مسیح تجھ پر رحم کرے، اور جن مقدس تکلیفوں کو اٹھا کر حقوق مسیح کو

جو حاصل ہوئے ہیں، ان کے معاوضہ میں تیرے گناہ معاف ہوں "

مغفرت نامہ کی پیشانی کی اس عبارت کے بعد آگے یہ ہوتا تھا، کہ :-

"پس معلوم ہو کہ مسیح کے رسولوں پطرس و پولس اور جلیل القدر پوپ کی حکومت نے اس خاص علاقے میں جو یہ اقتدار مجھے بخشا ہے کہ تمہارے ان گناہوں کو میں معاف کر دوں، جو تم سے صادر ہو چکے ہیں، یا کلیسا کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں، خواہ وہ جیسے کچھ ہوں، اور جو کچھ بھی ہوں، نیز ایسے سارے گناہ جن کے بخشنے اور جن کی بندش سے کھولنے کا اختیار پوپ صاحب کو ہے، وہ سب تیرے بخشے گئے۔ اسی طرح "کلیسائے رومہ" کی کنجی جتنی دراز ہے، اسی کی نسبت سے تیرے ایسے گناہ بھی معاف کیے گئے جو آئندہ تجھ سے سرزد ہوں۔ اب میں تجھے کلیسا کے رموز اور اسرار میں شریک کرتا ہوں، اور جس وحدت کو کلیسا نے پیدا کیا ہے، وحدت کے اسی دائرے میں تجھے داخل کرتا ہوں۔

آخر میں لکھا ہوتا تھا، کہ :-

اب جو تو مرے گا، تو عذاب کے دروازوں کو اپنے اوپر بند پائے گا، اور فردوس بریں کے دروازوں کو اپنے اوپر کھلا پائے گا۔ بہر حال جس زمانہ میں بھی تو مرے گا تو اس "مغفرت نامہ" کی تاثیری قوت سے، ہمیشہ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے تو مستفید ہوتا رہے گا" (۱)

(منقول از اظہار الحق عربی ص ۳۹/۲)

مغفرت ناموں پر باضابطہ فیس کی ابتدا اگرچہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں کہتے ہیں کہ ہوئی، لیکن جب رواج پڑ گیا تو اس کی تجارت نے رفتہ رفتہ سارے یورپ میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ سلاطین کے عزل و نصب کے مسئلہ کو قابو میں لانے کے ساتھ "اعتراف جرم" کے پردے میں لوگوں کی شخصی زندگی کی کمزوریوں کا علم کلیسا کے پاس ایک ایسا شکنجہ تھا کہ پادری سب کچھ کر رہے تھے، عوام دیکھتے تھے، مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے، عوام کا مال، ان کی جان، اور آخر میں عزت و ناموس سب پر اطلاقی تصرفات کا اقتدار پادریوں کو حاصل تھا۔

گندی رہبانیت | کلیسائی رہبانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے، قرآن میں

کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس قرآنی آیت کی تفسیر سے یورپ کی تاریخیں معمور ہیں۔ موشیم نے تاریخ کلیسا میں لکھا ہو کہ:-

"متاہل اور شادی شدہ لوگوں پر مانا جاتا تھا، کہ شیطان کا اثر ہے اس لیے جو لوگ کلیسا میں عہدہ حاصل کرتے تھے، وہ شیطانی اثر سے محفوظ رہنے کے لیے شادی نہ کرتے تھے، اسی طرح عورتیں بھی تجرد کی زندگی اختیار کرتی تھیں"

مگر اس ابتداء کی انتہا کیا ہوئی، موشیم ہی کا بیان ہے:-

"لیکن یہ ساری باتیں صرف دکھاوے کی تھیں، مجرد مردوں کے بستر رات کو مجرد عورتوں سے آباد نظر آتے تھے، یہ عورتیں مردوں کی ناجائز خواہشوں کو پورا کرتی تھیں"

اسی نے لکھا ہے، کہ:-

"ایک عورت معمولاً ایک مرد کے تصرف میں نہیں رہتی تھی، آج ایک عورت آئی تو کل دوسری، اسی طرح در پردہ یہ سلسلہ قائم رہتا، مگر بظاہر یہی کہا جاتا تھا کہ مجرد مرد اور مجرد عورتیں اپنی پارسائی اور عفت کو قائم رکھتی ہیں"

"مقدس کلیسا" کی ان اندرونی غلاظتوں اور گندگیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کبھی کبھی بعض نیک دل پادریوں کو بھی بے چین کر دیتا تھا۔ برنردوس نامی اسقف کی ایک نظم اس سلسلہ میں خاص طور پر مشہور رہی ہے، جس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے:-

"نکاح کے معزز اور پاک آہنی طریقہ کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا، جس سے پاک خوابگاہ آدمی کو میسر آتی تھی، اور بجائے اس کے کلیسا کی خوابگاہوں کو عیاشی کا چکلہ بنا دیا گیا ہے، .... جن چکلوں میں مرد اور عورتیں جو ماں اور بہنیں ہیں، ہر قسم کے گندہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں"

ایک پرتگالی پادری الفاروس بلاجیوس نامی نے مغربی ممالک کے عام کلیساؤں کی ان ہی اخلاقی زبوں حالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، خصوصاً اسپین کے متعلق لکھا ہے، کہ:-

"کاش! ایسا ہوتا کہ کنوارے رہنے کا جو عہد کلیسا میں شریک ہونے والوں سے لیا جاتا ہو، یہ عہد نہ لیا جاتا، آج اسی عہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسپین کے عام باشندوں کے بچوں میں زیادہ اکثریت کلیسا کے مذہبی خدام کی ہو" (اظہار الحق ج۔ ۲۔ عربی)

الغرض کلیسا کی "رہبانیت" باہر سے جیسی کچھ بھی نظر آتی ہو، لیکن بہ تدریج اندر ہی اندر یہی "رہبانیت" "فسق کی اکثریت"[ع] کے قالب میں ڈھل گئی۔ قرآن کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید سے کلیسا کی تاریخیں لبریز ہیں۔

پوپ کا فرعونی اقتدار ان اندرونی گندگیوں، اور غلاظتوں کے ساتھ اسی کلیسا کی قوت کے بدولت باہر میں "پوپ" کا لاہوتی اقتدار بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہونچ گیا تھا کہ کلیسا کی طرف سے فرنیسس زابادلا جو پوپ کی مجلس خاص (ڈیکن) کا کرڈینال[1] تھا، اسی نے یہ اعلان عام کر دیا تھا، کہ:۔

"پوپ کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے، تا اینکہ خدا نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، پوپ چاہے تو ان کو حلال قرار دے سکتا ہے۔"

آخر کے الفاظ (العیاذ باللہ) اس "اعلان عام" کے یہ تھے، کہ:۔

"پوپ (کا اقتدار) خدا سے بھی بڑھا ہوا ہے۔"[2]

اور آئے دن پوپ اپنے اس فرعونی اقتدار سے عموماً کام لیا کرتا تھا۔ پروفیسر میکائیل (میخائل)، کی عربی کتاب جو بیروت میں سنہ ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے، اس میں آپ کو طویل فہرست ان چیزوں کی ملے گی، جن میں پوپ نے اپنے اقتدار سے، ردوبدل کیا تھا۔ میخائل نے لکھا ہے، کہ:۔

"روپیہ لے کر حرام کو حلال، حلال کو حرام کر دینا یہ پوپ کا عام دستور تھا۔"

کمائی کے طریقے مغفرت نامہ کی تجارت، یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانے کا مقدس معاوضہ، اور عام نذرو نذور اوقاف وغیرہ وغیرہ کی آمدنی کے بے شمار ذرائع کے سوا[3] یہ شاعری نہیں واقعہ ہے کہ خدا کی رحمت تیرا اور پاؤ کے حساب سے کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے عموماً بکتی تھی۔ عام قاعدہ تھا کہ سکرات موت کے وقت علاقہ

ع وکثیر منہم فاسقون۔ ع

[1] کلیسائی نظام میں مختلف عہدوں کے مختلف نام تھے، اسقف جو یونانی لفظ کا معرب ہے، یہ سب سے بڑا عہدہ تھا، انگریزی میں اسی کو "آرچ بشپ" کہتے ہیں۔ اسقفوں کے بعد قسیس، قسیس کے بعد بشپ اور پریسٹ کا درجہ تھا۔ پوپ کی کونسل اعلیٰ کا نام ڈیکن تھا، جس کے ارکان کی تعداد ستر تھی، اس کونسل اعلیٰ کے ہر رکن کو "کارڈینال" کہتے تھے۔ ۱۲

[2] اظہار الحق عربی ج ۲ ص ۳۰ ۔ ۱۲

[3] چرچ کے ساتھ کسی سینٹ (ولی)، یا شہیدوں کی قبروں کا جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا، اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر تازہ مردہ بہ نسبت پرانے مرنے والوں کے عقیدت و نیاز کی مرکزیت میں آگے بڑھ جاتا تھا۔ انگلستان کی تاریخ میں لکھا ہو کہ (ص ۱۳۶ پر)

کے پادری کا مرنے والے کے سرہانے رہنا ضروری تھا۔ کوئی جاگیردار مر رہا ہے، پادری صاحب بلائے گئے ہیں مراقبہ میں ان کو محسوس ہوا کہ مرنے والے کی روح کو لینے کے لیے سیاہ سیاہ آتشیں آنکھوں والی خبیث روحیں اتر رہی ہیں۔ پادری اس حالی سے لوگوں کو مطلع کرتا ہے، پھر کیا کیا جائے؟ کلیسا کے نام سے جائداد وقف کی جائے، او وقت مانی جائے، یہ کیا جائے وہ کیا جائے! جب سارے مراحل طے ہو جاتے تب پھر پادری مرگ پر بیاں ہو جاتا، اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بشارت سناتا کہ خبیث روحیں واپس ہو گئیں، اور مجھے دکھایا گیا کہ نورانی ہستیاں پاک روحیں اب اتر رہی ہیں۔

الغرض گوناگوں نت نئے طریقے کلیسا کی طرف سے اس لیے تراشے جاتے تھے کہ ملک کے باشندوں کی کمائی ہوئی آمدنی کسی نہ کسی طرح کلیسا کے حکام اور خدام کے پیٹ میں اترتی چلی جائے۔

بالکل نرالی ابلہ فریبیاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غریب عوام کی مذہبی زود اعتقادیوں سے ناجائز نفع اٹھانے والے دنیا کے اکثر مذاہب و ادیان میں پیدا ہوتے رہے ہیں، اور کسی نہ کسی شکل میں آج تک ابلہ فریبیوں کا سلسلہ دنیا میں جاری ہے، لیکن دین صلیبی میں کلیسا اور پوپ کے نام سے جو نظام قائم ہوا تھا اس کی نوعیت "ابلہ فریبیوں" کے اس عام قصے سے قطعاً الگ تھلگ تھی، اسی لیے باوجود اہتمام اختصار کے مجھے کچھ تفصیل سے کام لینا پڑا جس سے کلیسا اور پوپ کے غیر معمولی اقتدار کا کچھ اندازہ پڑھنے والوں کو ہو سکتا ہے۔

دوسرے مذاہب و ادیان میں زیادہ سے زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وقت کے حکمرانوں پر کسی "مذہبی شخصیت" کا اثر قائم ہوا، اور اس "اثر" سے اچھا یا برا کام اپنے اپنے وقت پر لینے والے لیتے رہے۔ لیکن یورپ کے "دین صلیبی" کا کلیسائی نظام شخصی نظام نہ تھا، بلکہ وہ باضابطہ ایک ایسا مستقل نظام تھا کہ ہزار بارہ سو سال تک بقول مسجوک

"شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب "چاند اور سورج" سے دی گئی ہو۔"

(کتاب ارتقائے نظم حکومت صفحہ ۲۶۲ ج ۱)

(صفحہ ۱۳۵ کا بقیہ حاشیہ) صلیبی لڑائیوں کے جنگجوؤں نے "خیرے بجو گھر کو آئے"۔ اس کی خوشی میں انگلستان کی قربان گاہوں، بارگاہوں اور جنتوں میں جو نذریں چڑھائیں، تو طامس بکٹ اسقف جو تازہ مردہ تھا، اس کی قبر پر تو اسی ہزار تین سو چھبیس روپے (۸۰۳۲۶) چڑھاوے کی آمدنی ہوئی، لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت مریم کی قربان گاہ کے چڑھاوے کی میزان کل تین سو تیس روپے (۳۳۰) تھی، اور اس سے بھی طرفہ ماجرا یہ تھا کہ خود خدا کے بیٹے مسیح کی قربان گاہ پر اکتیس روپے کی آمدنی ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کے باپ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہ آیا۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کے عام سلاطین و ملوک ہی نہیں بلکہ شہنشاہی کا اقتدار رکھنے والی ہستیوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی قوت کا نور کلیسائے روم کے پوپ کے نور اقتدار کا عکس ہے، جیسے چاند کا نور آفتاب کے نور کے ساتھ وابستہ ہے۔

مسجوگ ہی نے لکھا ہے، کہ:-

"سیاسی حکمرانوں کو کلیسا کے مذہبی حکمران کے ماتحت رکھنے کے لیے یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اس کا فریضہ نائب عیسیٰ (پوپ) کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، کیوں کہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا۔"

کہا جاتا تھا کہ پوپ حضرت مسیح کے حواری کا جانشین ہے، اور پطرس حضرت مسیح کا جانشین تھا، بقول مسجوگ۔

"اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمران (اور بادشاہ) مقدس پطرس کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اسے معزول کر دے، اور اس سے مزید یہ ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار معزول کر سکتا ہے وہ نصب اور تقرر سے انکار بھی کر سکتا ہے۔"

یہی ایک ایسی صورت حال ہے جس کی نظیر یورپ کے "دین صلیبی" کے سوا اور کسی دین میں نہیں مل سکتی۔

ایک ضرورت جسے پورا کرنے کے بجائے اقتدار کو نفسانی اغراض کا آلۂ کار بنایا گیا

اگر کلیسا کے اس اقتدار سے کام لینے والے صحیح کام لیتے تو اس میں شک نہیں، جیسا کہ مسجوگ نے لکھا ہے، کہ:-

"اس بے لگام خود غرض (یعنی شاہی اقتدار کے مطلق العنان حکام) کے لیے بھی کسی تدارک کا ہونا ضروری تھا اور اس کا صاف و سہل علاج یہی معلوم ہوتا تھا کہ قسیسوں (حکام کلیسا) کی طرف سے زجر و توبیخ ہوتی رہے۔"

مگر آپ دیکھ چکے کہ "کلیسا" کی آڑ لے کر صلیبی دین کے ان نمائندوں نے کتنی گھنونی قسم کی بے دینیوں سے یورپ کو بھر دیا، جان و مال، عزت و ناموس اس ملک کے ہر باشندے کی مذہب کے ان نمائندوں کی حیوانی اور نفسانی خواہشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

اہل یورپ کی قدرتی بے چینی لیکن بے بسی کا طویل عرصہ

سال دو سال نہیں، بلکہ چوتھی صدی عیسوی سے مذہبی غارتگریوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا، اور ہزار سال سے زیادہ مدت تک دن دونی ترقیوں کے ساتھ اس کے ظلم و تعدی کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا، فطرت انسانی قدرتاً ان حالات سے جس حد تک بے چین اور مضطرب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہر

وہ شخص کر سکتا ہے جو انسانی احساسات لے کر پیدا ہوا ہے۔ یورپ کے یہ باشندے جنھوں نے صلیبی دین قبول کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، دیکھتے رہتے تھے، تڑپتے تھے، تڑپنا چاہتے تھے، لیکن تڑپنے کی بھی گنجائش ان کے لیے باقی نہ چھوڑی گئی تھی، ایک طرف سلاطین و ملوک کی فوجی قوتوں کا دباؤ ان کو ہلنے نہیں دیتا تھا جس کی وجہ ظاہر تھی کہ فوج کی قوت ہو، یا پولیس کی قوت، حکمراں اقتدار کے منشار کی تعمیل کرتی ہے، اور حکمرانی کے اقتدار رکھنے والی طاقتیں چونکہ پوپ یا کلیسا کے غیر مسئول اقتدار کی چٹان کے نیچے ہر جگہ دبی ہوئی تھیں، اس کا لازمی منطقی نتیجہ تھا کہ کلیسا یا پوپ یا پوپی نظام کے تحت کام کرنے والوں کے متعلق لب ہلانے کی جرأت خود اپنے خون اور اپنی جان کے ساتھ بازی گری بنجانی تھی۔

ایک طرف کلیسا کے ہاتھ میں اس طریقہ سے ملک کی سیاسی باگ آگئی تھی، اور دوسری طرف "اعتراف جرم" کے قصے کی بدولت ہر پادری انفرادی شخصیتوں کی کمزوریوں، جرائم اور لغزشوں کا محرم اسرار بنا ہوا تھا، کلیسا کے خلاف کچھ بولنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اپنے پوشیدہ جرائم کا راز فاش ہو جائے۔ افراد و اشخاص کی گرفت کا یہ ایک ایسا جال تھا جس میں لوگ اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔ کچھ رسم و رواج و عادت اس قسم کے عام قوانین کا اقتضا یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو، عمومیت[1] میں اسی نوعیت کے اثرات بتدریج پیدا ہو جاتے رہیں، یوں ہی کلیسا کو اپنی من مانی کارروائیوں کے جاری رکھنے کا موقع قرنہا قرن تک ملتا رہا۔

ردعمل کا نشو و نما

لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد بلکہ یوں سمجھیے کہ عمر ہوتی ہے، قدرت جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نشیب و فراز سے گذارتے ہوئے نسل انسانی کو آگے کی طرف بڑھاتی چلی آ رہی ہے، وہی قدرت ہر عمل کے ردعمل کے اسباب و وجوہ کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

کلیسا کے بڑھتے ہوئے مذکورہ بالا غیر معمولی اقتدار کے مقابلہ میں ردعمل کا اسباب و علل کے کن کن قالبوں میں قدرت کی طرف سے نشو و نما ہونے لگا، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مظالم اور چیرہ دستیوں کا جو سلسلہ ڈاکوؤں اور چوروں، رہزنوں اور غارتگروں کی طرف سے نہیں، بلکہ دین اور مذہب کے مدعیوں کی طرف سے شروع ہوا تھا، خود اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی، آدمی چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی نفرت کرتا ہے، اور ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، لیکن شیطان شیطان کے لباس میں نہیں بلکہ فرشتوں کے جبّوں میں جب سامنے آئے، اور معلوم ہو جائے کہ ان ملکوتی جبّوں کے نیچے ابلیسی روحیں پوشیدہ ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ جرم و طغیان کے خلاف انسانی فطرت کی برہمی کا پارہ غیر معمولی طور پر زیادہ بہت زیادہ چڑھ جاتا ہے۔ جیسے جیسے کلیسا کے بھیس میں شیطان اپنے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا، اندر ہی اندر عمومیت کی فطرت میں آتشیں لاوے تیار ہوتے چلے جاتے تھے، اگرچہ جیسا کہ میں نے عرض کیا اندر میں تیار ہونے والے ان لاووں کو باہر نکلنے کے لیے کوئی دہانہ نہیں ملتا تھا، سوراخ پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو فوراً جبر و استبداد کی قوتوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔

---

[1] عام لوگوں میں ۔ ع

صلیبی لڑائیوں کا اثر اسی عرصہ میں کروسیڈ وار یعنے مولد مسیح علیہ السلام کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے صلیبی لڑائیوں کا جو سلسلہ کلیسا کی طرف سے چھیڑا گیا، اور اس راہ میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں ہی سے پرستاران صلیب کو عموماً دوچار ہونا پڑا، اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے بعض ایسی مذبوحی حرکتیں بھی سرزد ہوئیں، جس نے عوام کے پیمانۂ صبر کو لبریز کر دیا[1]۔ کہتے ہیں کہ ان ہی صلیبی لڑائیوں میں ایک نئے دین اسلام کے نظام کا تجربہ کرنے کا بالواسطہ یا بلا واسطہ موقع یورپ کے کلیسائی باشندوں کو ملا، اسی کے ساتھ یورپ کے بعض قوی پنجہ ذی العزم والارادہ سلاطین (بین اوم) کلیسا اور پوپ میں مزاحمت بھی شروع ہوئی، اور یہ مزاحمت آگے بڑھتے ہوئے اپنی آخری شکل تک پہونچ گئی، جس نے کلیسائی نظام کے استحکام کو گونہ متاثر کیا[2]۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے گوناگوں پیچیدہ اسباب پے در پے یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہوتے چلے گئے کہ اندر اندر کلیسا کے خلاف جو آگ عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی، اور جو آتشیں لاوے پیدا ہو رہے تھے، ان کو منھ بنانے کا موقع مل گیا۔

---

[1] مطلب یہ ہو کہ پوپ اور اس کے جانشین مسیح کے نام پر یوں تو دغلا دغلا کر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں عیسائیوں کو کٹوا ہی رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں اسٹیفن نامی گڈریے کے ایک لڑکے نے بعض پادریوں کے مخفی اشاروں سے دعویٰ کیا کہ خدا کا دیدار اس کو نصیب ہوا، اور روٹی ملی، اور حکم دیا گیا ہو کہ کمسن لڑکوں کی فوج تیار کر کے مولد مسیح کی تطہیر کی کوشش کرے۔ یہ ۱۲۱۲ء کا واقعہ ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے ہر ہر علاقہ کے خاندانوں سے لڑکے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی چنی گئیں، جن کو مردانہ لباس پہنایا گیا، اور جہاد کا اعلان کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ فوج یورپ سے روانہ ہوئی۔ باور کرایا گیا تھا کہ راستہ میں جو سمندر بھی ملے گا، خود بخود خشک ہو جائے گا۔ بہرحال مارسیلز میں عیسائی سوداگروں نے لڑکوں کی اس فوج کو جہازوں پر لا دیا، اور بے درد تاجروں نے ان غریب بچوں کو مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ دو جہاز نذر طوفان ہوئے۔ لکھا ہے کہ لڑکوں کے ماں باپ روتے تھے، مگر ان کی کوئی کچھ نہیں سنتا تھا۔ اور لڑکوں کی یہ فوج ایک سے زیادہ مرتبہ تیار کی گئی جو راستہ ہی میں تباہ ہوتی رہی ــ ۱۲

[2] مثلاً جرمنی کے شاہنشاہ فریڈرک، یا انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم، اور اسی قسم کے مختلف سلاطین و ملوک کے جن واقعات کا تذکرہ تاریخوں میں کیا گیا ہے۔ ہنری چہارم کے متعلق لکھا ہو کہ جب ہلڈی براند نامی پوپ نے ہنری کو ملعون ٹھہرا کر کلیسا بدر ہونے کا حکم دیا، تو ہنری نے بھی پوپ صاحب کو لکھا کہ "تو بظاہر پوپ ہو لیکن درحقیقت ایک بدکردار راہب۔ الخ" (دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ صفحہ ۲۸)

اسی طرح فرانس کے بادشاہ فلپ خوب رو نے بانفیس ہشتم نامی پوپ کے اس فرمان کو جلا ڈالا کہ "پوپ جسے چاہے اکھاڑے، اور جس بادشاہ کو چاہے باقی رہنے دے" (ارتقائے نظم حکومت یورپ صفحہ ۲۲۱)

پروٹسٹنٹ فرقہ | پروٹسٹ یعنی احتجاج کی طرف منسوب کرکے صلیبی دین کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا جو ذکر آتا ہے، دراصل یہی اندرونی آگ اور لاوے کے ان دہانوں کی تعبیر ہے جن کی راہ سے کلیسا کی مخالفانہ آگ باہر نکلنے لگی۔ ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں آگے پیچھے مختلف شخصیتیں جرأت سے کام لے کر کلیسا اور پوپ کے خلاف علانیہ اٹھ کھڑی ہوئیں جن میں جرمنی کے مارٹن لوتھر سوئٹزرلینڈ کے زونگ لی، فرانس کے کالون نامی وغیرہ افراد نے غیر معمولی شہرت حاصل کی جن کے تفصیلی حالات کا مطالعہ یورپ اور کلیسا کی تاریخوں میں کرنا چاہیئے۔

پروٹسٹ کی ابتدائی نوعیت | حاصل ہر ایک کے احتجاج اور پروٹسٹ کا یہی تھا کہ صلیبی دین کی ٹھیکہ داری، یا بائبل (توراۃ وانجیل وغیرہ) کی تشریح کا استحقاق کلیسا نے اپنے ساتھ جو مختص کر رکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اور نہ نجات کے لیے کلیسائے روم اس کے پوپ، پوپ کے نمائندوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت ہے، یہ ہزار ہا ہزار صفحات کی داستان کا خلاصہ ہے۔

کلیسا کا ردعمل | واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً احتجاج اور پروٹسٹ کے اس قصے کا تعلق صرف کلیسا، پوپ، پوپ کے نمائندوں اور ان لوگوں پیش کردہ صلیبی دین کی شکل سے تھا۔ شروع میں یہی غنیمت تھا، مگر کلیسا کے لیے یہ مختصر احتجاج بھی ظاہر ہے کہ کسی حیثیت سے بھی قابل برداشت کیسے ہو سکتا تھا۔ چاہا گیا کہ "گربہ" کے ساتھ "کشتنی" کے فعل کو پہلے ہی شروع کر دیا جائے، ورنہ "پیل" (ہاتھی)، سے بھی اس سیلاب کا روکنا ممکن نہ ہوگا جس کی روانی ابھی صرف میل یعنے سلائی سے روکی جا سکتی ہے۔

کشمکش کی ابتداء | کلیسا اور عوام میں کشمکش کی ابتدا ہو گئی، یورپ کی تاریخوں میں عدالت ہائے تحقیق مذہبی (INQUISITION) اور "لاشامبرار دانت" یا "ایوان آتشیں" وغیرہ کی اصطلاحیں جو ملتی ہیں، درحقیقت ان ہی الفاظ میں اس منحوس کشمکش کی خونیں اور آتشیں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔

کلیسا کے خلاف صراحۃً ہی نہیں بلکہ اشارۃً و کنایۃً تحریراً و تقریراً کسی قسم کا کوئی لفظ زبان سے نکالنا جرم ٹھہرایا گیا، کلیسا نے فتویٰ صادر کیا، اور سارے سلاطین و امراء جن کی سلطنت و امارت کی بنیاد صرف کلیسا کے رحم و کرم پر منحصر تھی، انھوں نے اس فتویٰ کی تعمیل کے لئے نیاموں سے تلواریں باہر نکال لیں، ملک کے ایک سرے دوسرے سرے تک مجرموں کو زندہ در آتش کرنے کے لیے "مقدس الاؤ" جوڑ دیے گئے۔

مخالفان کلیسا کے خون کی ہولی | پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ سال دو سال کا قصہ ہو تو بیان کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ کشمکش کی یہ کیفیت، رومن کیتھولک یعنی حامیان کلیسا اور پروٹسٹنٹ مخالفان کلیسا ان دونوں فرقوں کے درمیان پانچ چھ صدیوں تک انتہائی قساوت قلبی، سنگدلی کے ساتھ جاری رہی۔ قدرتاً پروٹسٹنٹ خیال کے

حامیوں کی تعداد شروع میں کم تھی، ہر علاقہ اور خطہ میں کیتھولک اکثریت غریب پروٹسٹنٹوں کی اقلیت کے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ عدالتہائے مذہبی' یا مجلس تحقیقات ارتداد میں مقدمہ پیش ہوتا، ہلکی سی رسمی کارروائی کے بعد قتل یا زندہ جلا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا، اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی بڑی دلچسپیوں کے ساتھ خون اور آگ کی ان ہولیوں کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔

طرزِ ستم | لکھا ہے کہ الحاد یا ارتداد کے فتوے کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ مجرم کو پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے، غریب چت لٹا دیا جاتا، چھت میں باڑھ دار ہتھیار لٹکا دیا جاتا، جو آہستہ آہستہ کئی دن (تک) لیٹے ہوئے مجرم کے سینے پر ضرب لگاتا، اور یوں اس غریب کی جان نکالی جاتی یا گھٹ گھٹ کر نکل جاتی۔

اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے، اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں، انکی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

ہنگامۂ بارتھلمی | فرانس کا مشہور ہنگامہ، بارتھلمی کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ (۹) دن تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم نافذ رہا۔ لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کے کلیسا کی کیتھولک بھیڑیں زندہ بچوں کو نکالتیں اور کتوں کے آگے ڈال کر ان کے پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشہ دیکھتیں۔ پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔[۵]

دس لاکھ کا خونِ ناحق | خلاصہ یہ ہے کہ کشمکش کے اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے، زندہ جلائے گئے، دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا، تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہونچتی ہے۔

اور یہ سب کس لیے ہوا؟ صرف اس لیے کہ خدا کے بیٹے مسیح' اور ان کے حواری پطرس، پطرس کے جانشین پوپ کے ہاتھ میں ان ہی مذہبی ناموں کے وسیلہ سے سیاسی باگ جو آگئی تھی' یہ باگ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

مظلوم فرقہ پر اس جبر و تعدی کا اثر | پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی طرف سے جب پوپ اور پوپ کے نمائندوں پر اعتراض کیا جاتا، تو کہنے والے پطرس کا نام لیتے، کہ تم حواری مسیح کے جانشین پر زبان کھولتے ہو۔ جواب میں کہنے والے پطرس ہی پر اعتراض کرتے، بالآخر اسی اعتراض نے تحقیق کی وہ شکل اختیار کی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی ثابت کیا گیا کہ "پطرس حواری کی قبر یا لاش رومہ میں ہے"، سرے سے یہ دعویٰ ہی غلط اور بے بنیاد جعلی ہے۔

نوبت بایں جا رسید | بہرحال پطرس کے تقدس میں زور پھونکنے والے جب مسیح اور خدا کے بیٹے کے نام سے

---

(۵) انگریزی زبان جو نہیں جانتے ہیں وہ علامہ فرید وجدی کی عربی کتاب "کنز العلوم و اللغۃ" میں ان واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔۱۲

زور پہونچاتے، تو جو ذرا زیادہ آزاد مزاج تھے انھوں نے خود مسیح کی عظمت وجلالت میں اشتباہ ڈالنا شروع کیا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسیح کے وجود تک کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ مسیح کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے "خدا" کا نام لیا جاتا، لیکن جن پوپ، جس کلیسا، جس پطرس، اور جس مسیح کے نام لینے والوں کے خونیں کارناموں سے یورپ کا چپہ چپہ رنگین ہو رہا تھا، اسی مسیح کے خدا پر بھی زبانیں اگر کھلنے لگی ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے؟ اور یہی مطلب ہو ہنری ہجوک کے اس فقرے کا، کہ:-

"جس وقت نشاۃ جدیدہ کا (یورپ) میں زور شور تھا، جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا۔"

(ارتقائے نظم حکومت یورپ ص ۲۶۶)

یہاں تک بات کیوں پہنچی؟

اب سوال یہی ہے کہ "مذہبی عقائد کی اس کمزوری" کی بنیاد کیا تھی؟

یورپین مورخین کا شاطرانہ انداز اور صاف بیانی سے گریز

افسوس ہے کہ یورپ کی تاریخ لکھنے والوں نے نہ اس سوال ہی کو زیادہ اہمیت دی "اور نہ سوال کے جواب ہی میں وہ صاف بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کچھ ملی جلی باتیں کرتے ہیں، جن میں کچھ تو وقت، وقت کے سیاسی حکمرانوں کے کارناموں اور حکومت کے متعلق دستوری خیالات کے پیش کرنے والے مصنفین کے نظریات وافکار کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی کچھ سائنس، کچھ فلسفہ، اور ان فنون کی ترقیوں کا اظہار ایسے پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے، کہ "مذہبی عقائد کی کمزوری" کے صحیح اسباب سامنے آنے نہیں پاتے اور ان کتابوں کے سطحی مطالعہ کرنے والے اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید فلسفہ اور سائنس کے چرچوں نے مذہب کی بنیادوں کو یورپ میں سست کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی ان ہی تاریخوں میں وہ کلیسا اور پوپ، ان کے طرز عمل اور اس طرز عمل سے عوام کی ذہنیت بہ تدریج جو متاثر ہوتی چلی جاتی تھی بیچ بیچ میں اسکے ذکر سے بھی کلی گریز کی راہ تو اختیار نہیں کرتے، اور ایسا وہ کر بھی نہیں سکتے تھے، ورنہ ماضی وحال کے تعلقات کے زنجیرے کی کڑیاں پڑھنے والوں کے سامنے سے اچانک غائب ہو جاتیں۔ لیکن "تاریخ نویسی" میں جس صفائی اور بے لاگ بیان کی ضرورت ہے، اس سے ان کی کتابیں خالی ہیں، عموماً وہ باتیں بناتے ہیں۔ جس مذہب کی طرف ان کا ملک یا ان کی قوم منسوب ہے، چاہتے ہیں کہ کھلے بندوں اس کے پیدا کیے ہوئے نتائج لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔

شائد اسی لیے ممکن ہے کہ جس نظریہ کو اس وقت میں پیش کر رہا ہوں، ان لوگوں کو بھی کچھ اجنبی معلوم ہو، جنھوں نے یورپ کی تاریخ کا کافی اور گہرا مطالعہ کیا ہے، کیونکہ عموماً اس راہ میں وہ ان ہی راہوں پر پڑ چکے

ہیں جن پر یورپ کے شاطر مورخین ان کو چلانا چاہتے ہیں، تاہم شکر ہے کہ سلسلہ وار نہ سہی، پراگندہ، منتشر حالات میں یہ سارے معلومات یورپ ہی کی عام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش قرآنی لفظ "آثارہم" کی تشریح و تفسیر میں کی گئی ہے۔

یورپ کی اس بے دینی کا بنیادی سبب عقیدۂ ولدیت ہے

واقعہ یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی عقائد کی یہ ساری کمزوریاں جو یورپ میں پیدا ہوئیں براہِ راست نہ سائنس کے جدید انکشافات کی رہینِ منت ہیں، اور نہ سیاسی و دستوری تبدیلیوں سے ان کا براہِ راست تعلق ہے، جن سے گذرتے ہوئے یورپ کی تاریخ موجودہ دور تک پہونچی ہے۔ بلکہ مذہب کی ساری کمزوریاں خود اُس مذہب اور مذہب کی تاریخ سے پیدا ہوتی ہیں جس کی طرف اپنے آپ کو اور اپنی دینی زندگی کو یورپ کے یہ باشندے منسوب کرتے رہے ہیں یا اس وقت تک کر رہے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہی "عقیدۂ ولدیت" جس کی بدولت سمجھایا جاتا تھا کہ مخلوق کے پیکر میں خالق ہمارے سامنے آگیا، اسی کے ساتھ غیر معمولی شغف اور انہماک و استغراق نے یورپ کو کلیسائے روم اور کلیسائے روم کے پاپاؤں کا غلام بنایا، پھر کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی حد سے گذری ہوئی چیرہ دستیوں نے عوام کے قلب میں ردِ عمل کی کیفیت پیدا کی، جو ترقی کرتے ہوئے شروع شروع میں توپروٹسٹنٹ فرقہ کے قالب میں نمایاں ہوئی، اور جب ردِ عمل کی اس نہ رکنے والی تحریک کا مقابلہ آگ اور تلوار کی دھار سے کلیسا اور کلیسا کے رحم و کرم پر جینے والے حکمرانوں نے کرنا چاہا، تو یہی پروٹسٹنٹی تحریک جس کے بانی لوتھر کی کرخت ترین تنقید یہ تھی جیسا کہ جانسن نے اس کے رسالہ "اسیریٔ بابل" نامی کے حوالہ سے نقل کیا ہو کہ:-

> "اس نے (مارٹن لوتھر نے) نہ صرف پوپ کے اقتدار سے انکار کر دیا، بلکہ مقدس ادارہ کہانت و شدر روایات پر اور رازمنہ وسطی کے اصول استحالہ و تبدیل لحم[1] پر حملہ کرنے لگا"
>
> (یورپ سولھویں صدی میں ص۱۹۹)

[اور] جیسا کہ جانسن ہی نے لکھا ہے، کہ:-

> "اس نے (لوتھر نے) گو نہایت بے پروائی کے ساتھ کلیسا کے

---

[1] یہ عشاء ربانی کی تقریب کی ایک اصطلاح ہے، جو شراب اور گوشت اس تقریب میں عیسائی استعمال کرتے تھے اس کے متعلق یقین تھا کہ مسیح کا وہ خون اور گوشت ہے۔ ۱۲

روایات کو ترک کر دیا۔"

مگر اسی کے ساتھ

"اس کو کامل اور پختہ یقین تھا کہ حصولِ نجات اور تنظیم کلیسا کے
لیے جو کچھ درکار ہے وہ انجیل ہی میں مل سکتا ہے۔"

(یورپ سولھویں صدی میں ص۲)

بہرحال آخر وقت تک لوتھر خود بھی عیسائی ہی رہا، اور اس کے ماننے والے عیسائی بھی انجیل ہی کو ذریعۂ نجات یقین کرنے والے تھے۔

لیکن ان پروٹسٹنٹ، اور احتجاج کرنے والوں کا پیچھا کلیسا کے حامی عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک فرقہ کی طرف سے حد سے گذرے ہوئے بہیمانہ تشدد کے ساتھ کیا گیا جس کا ایک ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا۔ خود سوچئے کہ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا تھا جو ہوا۔

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں خود اپنے متعلق سوچتا ہوں کہ مذہب کے نام سے میرے سامنے بھی وحشت و بربریت کے وہی مہیب و دردناک مناظر اگر پیش ہوتے، جو کلیسا اور عیسائیت کے نام سے یورپ میں صدہا سال تک پیش آتے رہے، تو ایسے مذہب کے مقابلہ میں لامذہبیت اور دین کے مقابلہ میں لادینیت کے قبول کر لینے پر اپنے آپ کو مجبور اور شاید بے بس پاتا۔

پس سچی بات یہی ہے کہ یورپ کی موجودہ لامذہبیت یا بے دینی خود اس مذہب اور دین کی پیداوار ہے[1] جسے یورپ نے قبول کیا تھا، اور یہ مذہب یا دین کیا تھا، وہی

---

[1] غریب سائنس یا سائنس کی راہ سے پیدا ہونے والے جدید انکشافات مثلاً ہیاترے، پیارے، فون، انجن یا اسٹیم، برق، پٹرول وغیرہ کی قوتوں کو بدنام کرنا اور یہ سمجھنا کہ ان جدید انکشافات نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اس قسم کا دعویٰ وہی کر سکتا ہو جو نہ مذہب کی اساسی بنیادوں سے صحیح واقفیت رکھتا ہو اور نہ یہ جانتا ہے کہ سائنس ہے کس علم کا نام، اور اس کے مباحث کا تعلق کن امور سے ہو۔ قطع نظر اس بھونڈی مثال کے ایک عامی کو یوں بھی تو سوچنا چاہیئے کہ "گراموفون جب بجنے لگا تو اب جہنم کا وجود ماننا ممکن ہے، یا ہوائی جہاز یا ریل جب سفر کرنے لگا تو برزخی عذاب قبر میں مبتلا ہونے کا امکان جاتا رہا، یا ریل جب جاری ہو گئی تو فرشتوں کا وجود اب آدمی کیسے مان سکتا ہے۔" ذرا سوچئے تو دعویٰ و دلیل کی ان شکلوں میں کسی قسم کا کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔ پھر جدید ایجادات و انکشافات اسی قسم کی چیزیں تو ہیں۔ ان سے مذہب کے اصول تو اصل میرے نزدیک تو مذہب کے فروع بھی کسی حیثیت سے متاثر نہیں ہوتے۔۔۔ والقصۃ بطولھا۔

"نظریۂ ولدیت"

تھا جس کی تعبیر قرآن میں

قالوا اتخذ اللہ ولدا　　.. انھوں نے کہا کہ خدا نے (مسیح) کو بیٹا بنایا۔

سے کی گئی ہے۔

آمدم برسر مطلب اور اب آئیے قرآن میں "آثارہم" کا لفظ جو فرمایا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے، اس پر غور کیجئے۔ جیسا کہ ظاہر ہے "آثار" اثر کی جمع ہے۔ منتہی الارب میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس لفظ اثر کی تشریح فارسی کے ان لفظوں سے کی ہے، یعنے:۔

"بقیہ چیزے، دنشان .... ونشان قدم منہ قطع اللہ

اثرہ، یعنی بہ برد خدائے نشان قدم اورا"

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے پیچھے کوئی چیز جن نشانوں کو چھوڑ جائے ان ہی کو اس چیز کا اثر یا آثار عربی میں کہتے ہیں۔

یہ تو "آثار" کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی، آگے "ھم" کی ضمیر سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو "عقیدۂ ولدیت" کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب ان اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لائیے جن سے گذرتے ہوئے "عقیدۂ ولدیت" موجودہ دور تک پہونچا ہے۔

"آثارھم" کی تفصیلات اجمال کے پیرایہ میں جن لوگوں نے شروع شروع میں خالق عالم کے متعلق ولدیت کے اس عقیدہ کو تراشا وہ تو دنیا سے چلے گیے، ان کے بعد کلیسا، اور کلیسا سے پوپ، پوپ سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گذرنا پڑا، جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی، اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہو گئی، بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا، فریق مقابل کی سختیاں اور منھ زوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں، تا اینکہ مسیح کے حواری پطرس کے وجود کا بھی انکار کیا گیا، آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا، اور بالآخر اس کی انتہا العیاذ باللہ اس شک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لیے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لیے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی، یعنی خود مسیح کے باپ کا یا دوسرے لفظوں میں کہئے کہ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ میں درست ہونے لگیں،

اور گو عمومیت کی زبان پر خدا ابھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی، مسیح کی انجیل بھی، لیکن اس طویل و عریض آبادی کے اکابر کے دل میں سچ پوچھئے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

کمیونسٹ تحریک بھی انھیں آثار میں داخل ہے

دل کی بات دل ہی تک محدود کب تک رہتی، آخر مشرقی یورپ میں شیوعی یا بالشوی نظام نے سر اٹھایا جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔

کمیونزم کے نتیجہ میں انسانیت کی پستی

اور اس کے بعد قدرۃً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا باقی رہنا یا رکھنا ناممکن ہو گیا، جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے، جان لے کر پیدا ہوتی ہے احساس لے کر پیدا ہوتی ہے اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہو جاتی ہے۔ آدمی کی قدر و قیمت، کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔ مکھیوں کی جتنی تعداد بھی مر جائے، مار ڈالی جائے، جیسے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، آج بھی تصوّر ان لوگوں کے متعلق یہی ہے جو آدمی بن کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں ——— قرآن کا مسجود ملائکہ "عقیدۂ ولدیت" کی چوٹ کھائے ہوئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذلّت و خواری کے کتنے تاریک و مہیب خندق میں گر پڑا!۔

اور یہ ہے میرے نزدیک قرآنی لفظ "آثارھم" کا مطلب، جس کے لیے چاہیئے تو تھا کہ کئی جلدیں لکھی جائیں، لیکن اس کام کو دوسروں کے لیے چھوڑ کر[1] اپنے ٹوٹے پھوٹے پیش کردہ اشارات پر قناعت کرتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کی پیغمبرانہ بصیرت کے سامنے "عقیدۂ ولدیت" کے ان جاں گداز رُوح فرسا، آثار کا ہر پہلو نمایاں ہو، جس کا کچھ حصّہ تو سامنے آچکا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیڑے[2] دل اور مکوڑوں، مکھیوں اور پتنگوں، کی صفوں میں شریک ہونے والے اس انسان پر آئندہ ولدیت کا یہی عقیدہ اور کن آثار کو لانے والا ہے۔ الغرض جو کچھ گذر چکا، یا گذر رہا ہے اور آئندہ گذرنے والا ہے ان سے آگاہی کے بعد اگر

"انسانیت"

کے سب سے بڑے غم خوار، بہی خواہ پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان "آثار" سے بچانے کے لیے وہ

---

[1] خاکسار کی تعلیم جیسا کہ معلوم ہے قدیم طرز کے مدارس میں ہوئی، نیز تاریخ میرا خاص مضمونِ مطالعہ ..... بھی نہیں رہا، اسی لیے چاہتا ہوں کہ یورپ کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، کاش! میرے اجمالی اشاروں کو تفصیل کا قالب عطا کرتے ——— وعلی اللہ اجرہ

اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے تو کسی حیثیت سے یہ بات محل تعجب ہو سکتی ہے؟[1]

---

[1] یہ آخری بات بعض لوگوں کو کچھ تشنہ سی محسوس ہوگی۔ مولانا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حقیدہ ولدیت کے آثار کی یہی وہ جاں گسل نوعیت تھی جس کے غم سے، زیربحث آیت ("فلعلك باخع نفسك على آثارهم" الخ) کے بیان کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان گھلائے لے رہے تھے۔ مرتب

عقیدۂ ولدیت کے آثار اور دنیا کیلئے ایک مہیب انجام کا خطرہ

۱۔ ہم نے بنایا، (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، زمین کے لئے زیب و زینت، تاکہ ہم جانچیں کہ ان میں (انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے۔

۲۔ اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ۔

الحمد للہ کہ سورۂ کہف کا پہلا عشرہ کہئے یا رکوع کی آخری دو آیتوں پر ہم پہونچ گیے ہیں؛ [پیشانی کی عبارت میں] ان ہی دو آیتوں کا حاصل اور ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ قرآن مجید کے یہ ہیں:۔

(۱) انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لہا، لنبلوھم ایھم احسن عملاً۔

(۲) وانا لجاعلون ما علیہا صعیدا جرزا۔

پہلی آیت کا مفہوم ان میں پہلی آیت میں اگرچہ بظاہر تخلیق کائنات کی اسی عام توجیہ کا ذکر ہے جس کا قرآن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے، اپنے الفاظ میں جس کا خلاصہ خاکسار نے یہ کرلیا ہے، یعنی:۔

• "یہاں جو کچھ ہے سب انسان کے لیے، اور انسان اس کے لیے ہو جس کا سب کچھ ہے"

لیکن تخلیق کائنات کی اس عام توجیہ کی تعبیر جن خاص الفاظ میں یہاں کی گئی ہے اور جس موقع و محل پر ہم اسکو پاتے ہیں، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے۔

"ماعلی الارض" میں انسانی وجود بھی داخل ہو ظاہر ہے کہ ماعلی الارض یعنی وہ ساری چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں، جن سے مٹی اور کیچڑ کے اس ڈھیر کو جس کا نام زمین ہے، زینت بخشی گئی ہے۔ ان میں جہاں اونچے اونچے پہاڑ، سرسبز وادیوں کے آغوش میں بہنے والی ندیاں، غرانے بھرنے والے سمندر، لہلہاتے ہوئے پھول، پھلوں سے لدے درخت، ہرے بھرے باغ، گھنے جنگل، کھلے پُر فضا میدان، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں، ان ہی میں یقیناً گرد و غبار کے اس تودہ کی آرائش و زیبائش کی ضمانت خود انسانی وجود میں بھی مستور ہے۔

وہ خود بھی زمین کی زینت ہو، اور اس کے اندر قدرتی سلیقہ اس بات کا جو رکھا گیا ہو کہ معمولی معمولی چیزوں کو اپنی ذہانت اور صنعتی چابکدستیوں کی مدد سے حسن وجمال کے بہترین دل آویز سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے۔ بلاشبہ زمین کی سجاوٹ وبناوٹ وحسن ورعنائی کو انسان کے اسی فطری سلیقہ سے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے، اور ہوتا چلا جا رہا ہے، ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ "ما علی الارض" یا پشت زمین کی دوسری چیزوں کے ساتھ خود انسانی وجود کے اس پہلو نے جس سے لگائے ہوئے یا جنکا وارث انسان کے رہنے بسنے کے قابل زمین کے اس کرے کو بنا دیا، گویا یوں سمجھئے کہ گونہ اشک شوئی کی ایک صورت عارضی مستقر کی اس شکل میں اس آدمی کے لئے نکل آئی جو بہشت بریں کا باشندہ اور متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو ما علی الارض یعنے زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہو اگر اپنے اس سلیقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس چیز کے حسن وجمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین ہو جس کے حسن وجمال میں وہ اضافہ کر رہا ہو یہی حاصل ہے اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا کے الفاظ کا۔

اسی لئے آگے فرمایا گیا ہے کہ محاسن وکمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں، ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر یہ ہے کہ انسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے اور اپنے اعمال کے حسن وقبح، بھلائی برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرا لے۔ اور یہی مطلب ہے لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کا، یعنی (تاکہ جانچیں (نمایاں کریں)، ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں) میں عملاً سب سے اچھا کون ہے)۔

ایک خاص اشارہ بلکہ اگر غور کیا جائے تو مجموعی طور پر آیت کے ان دونوں ٹکڑوں سے ادھر بھی گویا اشارہ مل سکتا ہے کہ انسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لئے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن وجمال سے مالا مال کر دیا اور اس کی بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود وظہور پر جلوہ گر ہو رہی ہیں، تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ وابستگی، اور ربط، انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو باہر لا سکتا ہے۔

آیت کا قابل غور پہلو خیر، اب آئیے اور اس پر غور کیجئے کہ انسانی وجود کے ان دو پہلوؤں یعنی ایک پہلو تو وہ ہے جس سے زمین کے حسن وجمال کے اضافہ اور فروغ میں مدد مل رہی ہے، اور دوسرا پہلو وہ جس کے ساتھ خود انسانی وجود کے باطنی محاسن اور معنوی کمالات کے ظہور وبروز کا مسئلہ وابستہ ہے، ان دونوں پہلوؤں کا تذکرہ عقیدۂ ولدیت کے چھوڑے ہوئے آثار کے بعد کیوں کیا گیا ہے۔

عقیدہ ولدیت کے آثار نے ایک پہلو کو دبا کر دوسرے پہلو کو ابھار دیا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ دین سے بے دینی کی پیدائش کا جو حادثہ عیسائی ممالک اور کلیسائی علاقوں میں پیش آیا ہو کشمکش اور تصادم کے اس قصے میں بڑھتے ہوئے لوگوں کا جذبۂ ضد وعداوت، بغض ونفرت، صرف خدا انکار ذہنیت ہی تک پہونچ کر نہیں ٹھہرا، بلکہ مذہب اور دین کے

نام سے لامذہبیت اور بے دینی کی فرعونی حرکتوں اور طاغوتی شرارتوں کی جو جہنم عوام پر بھڑکائی گئی اس نے لوگوں کو یہ واقعہ ہے کہ بالآخر "خدابے زاری" کے حدود تک ڈھکیل کر پہونچا دیا۔ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے ہے، انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج و مردہ ہو کر رہ گیا، لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی ہے، وہ اب صرف یہی ہے کہ اسی مٹی اور کیچڑ کے تودے کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کا نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے حسن میں حسن کا، قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر، بیش قیمت ذخیرہ اس کی فطرت میں قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔ انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ اڈیسن ہی بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو، لیکن انسانی محاسن و کمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کر کے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا خواہ زمینی حسن و زیبائش اور سج دھج میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

مٹی چمک رہی ہے انسان بجھ رہا ہے عقیدۂ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا کر رکھا ہے وہ یہی ہے مٹی بڑھ رہی ہے بڑھتی چلی جا رہی ہے، چمک رہی ہے، چمکتی چلی جا رہی ہے، اس کے حسن و جمال میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جا رہا ہے، بجھ رہا ہے بجھتا چلا جا رہا ہے اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم از کم معصوم حیوان، یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس "خدابے زار تمدن" کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں، آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی "جنت نما" زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہونچا دیا۔

اس صورت حال کا مہیب انجام لیکن یہ تو وہ ہے جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، مگر آئندہ یہی صورت حال کس مہیب ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے والی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مذکورۂ بالا دو آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات سے قطعی بے تعلق و بے گانہ ہو کر اپنی خدا بے زار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ، صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھرا گیا تھا خالق تعالیٰ سے ٹوٹ کر کلیۃً زمین ہی کے بناؤ سنگار کی طرف اس کا رخ مڑ گیا ایک طرف اس یکسوئی یکتا پن کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ارضی بناؤ سنگار آرائش و زیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا جیسے اس عہد میں بھری

اور بھرتی چلی جارہی ہے، انسانیت کی تاریخ میں یا کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے، ہر نیا دن نئے انکشافات جدید مصنوعات و ایجادات کو اپنے جلو میں لا رہا ہے، ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا نظارہ دعوتِ نظر دینے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں لیکن زمین کی زیب و زینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے اور اپنے محاسن و جمال کو فراموش قطعاً فراموش کر دینے والا انسان ایجادات و اختراعات کی ان ہی راہوں سے زیب و زینت کے ساز و سامان کے ساتھ ساتھ اسی زمین کی ویرانی و بربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے گھسیٹ گھسیٹ کر دائرہ ظہور و وجود میں جو لا رہا ہے دنیا کی آنکھوں سے کیا وہ اوجھل ہیں، دیکھئے وہ ایٹم بم کے جہنمی ذرات ہیں، اور یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرامات ہیں۔ یہ ان آتش بداماں ایجادات و اختراعات کے سوا ہیں، جن کا دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے، دیکھئے ان کو اور پڑھئے قرآن میں:۔

وَاِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا	اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں) کو جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ

خود سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

الانسان خالق سے ٹوٹ کر صرف زمین کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا، اور اپنا سب سے بڑا کمال یہی سمجھ بیٹھا کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور، اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے (اپنے خیال میں ختم ہو جائے) جو خالق کے لئے تھا، وہ "گردنِ خر" کا طوق بن کر بھی رہ جاتا تو کہا جا سکتا تھا۔ ایک زندہ جانور کی گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست و سرشار ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لئے زیور بن گیا ہوں۔ انفرادی ہستیوں کا حشر اسے نہیں چونکا رہا تھا کہ نسل کے تسلسل کا بھروسہ اس کے سینے کا مرہم جھوٹا مرہم بنا ہوا تھا، لیکن (خالق کا یہ انتباہ کہ)

"ہم بنا دینے والے ہیں (ان چیزوں کو) جو زمین پر ہیں میدان اُجاڑ"

کیا طفل تسلی کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دے گا، بس۔ ع "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما" انشاء اللہ تعالیٰ اسی چیست کا جواب آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے قرآنی روشنی میں رکھا جائے گا اور اصحاب کہف کا قصہ اور اس کے نتائج اسی وقت آپ کے سامنے آئیں گے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

عقیدۂ ولدیت کے آثار کے پیدا کردہ حالات میں
ایمان اور ایمانی زندگی کی حفاظت کی راہ

قصۂ اصحاب کہف اب آپ کے سامنے "اصحاب کہف" کا مشہور قصہ قرآن میں آئے گا، جس کی طرف منسوب ہو کر سورۂ کہف کے نام سے یہ سورہ موسوم ہوئی۔

جہاں تک میرا ناچیز خیال ہو "اصحاب کہف" کا قصہ اسی سوال کا جواب ہو، جو پہلے رکوع کے ختم کرنے کے بعد دلوں میں پیدا ہو سکتا ہو، لیکن اس پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات سن لیجئے۔ اب تک جو کچھ آپ کے سامنے گزرا، یاد ہوگا اسی "من لدنہ جنگ شدید" کی دھمکی کے ساتھ ساتھ ایک بشارت بھی قرآن نے سنائی تھی، فرمایا گیا تھا کہ

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ	اور بشارت دیجئے ان ایمان لانے والوں کو جو اچھے
الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا	کام کر رہے ہیں (اس بات کی) کہ ان کے لئے اچھا معاوضہ
مَاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا	ہو، ٹھہرے رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔

جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی گذار رہے ہیں، اس آیت میں ان کو تسلی دی گئی ہو کہ ان کو ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جیسے ولدیت کا عقیدہ اپنے آثار و نتائج کو پیدا کرتا چلا جائے گا تا ایں کہ "صعید جرز" (اجاڑ میدان) کے ہیب مستقبل کو زمین پر کھینچ کر دہ لے آئے۔ اسی طرح ایمان و عمل صالح کے نتائج "اجر حسن" اور اچھے معاوضہ کی صورت میں بھی مسلسل ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے جنھوں نے عمل صالح پیدا کرنے والی ایمانی زندگی کے بسر کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہو "ماکثین فیہ ابدا" (یعنی ڈٹے رہیں گے اسی اجر حسن اور اچھے معاوضہ کی نشاط آفرینیوں اور نشاط انگیزیوں میں ہمیشہ ہمیش) اس سے یہی سمجھ میں آتا ہو کہ مسرت و نشاط کی اس کیفیت میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا، خواہ ما علی الارض (زمین پر جو کچھ ہو) اس کے ساتھ جو صورت حال بھی پیش آجائے۔

مژدہ سنانے کو قرآن نے یہ مژدہ سنا تو دیا ہو اور ماحول کے حالات سے بے تعلق ہو کر پڑھنے والے جب خالص ایمانی احساسات کے تحت قرآن میں اس کو پڑھتے ہیں تو دل میں اطمینان کی خنکی بھی پاتے ہیں اور جو مومن ہو چاہیئے کہ اس خنکی کو اپنے اندر پائے اور قرآن کے الفاظ چونکہ مطلق ہیں یعنی اجر حسن کے ظہور کو موجودہ دنیاوی زندگی یا آخرت کی زندگی کسی ایک کے ساتھ قرآن نے چونکہ محدود و مقید نہیں کیا ہو، اس لئے بظاہر الاولیٰ والآخرۃ دونوں پر اس قرآنی ضمانت اور بشارت کو چاہیئے کہ وہ حاوی ہو۔

مگر ایمان کے ساتھ عقل ماحولی تقاضوں کے زیر اثر ہو کر جب سوچتی ہے، تو اجر و معاد خیر تو بڑی بات ہو، خود ایمان ہی کے قیام و بقا کی طرف سے مایوسی کی کیفیت دل پر چھا جاتی ہو، عقیدۂ ولدیت کے آثار نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ ایمان کو دل میں رکھنا گویا انگاروں کو مٹھی میں بند کئے رہنا ہے۔

(پس) جہاں تک خاکسار کا ذاتی تاثر ہو، اصحاب کہف کے قصے کی ابتدا کرتے ہوئے قرآن میں جو یہ سوالی فقرہ ہو، یعنی۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ؕ	کیا تم سوچتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں کوئی عجیب (نشانی) تھے۔

(جس) میں مخاطب کو تعجب اور حیرانی کا مرتکب قرار دینے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ تعجب کا اظہار کیا کس نے تھا؟ اس کے جواب میں بیرونی روایتوں سے استفادہ کی ضرورت بظاہر نہیں (ہے) بلکہ پہلے رکوع کی یہی تبشیری ضمانت آدمی کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عقیدۂ ولدیت کے آثار جن حالات کو دنیا میں کھینچ کر لانے والے تھے (جن میں ہم اس وقت مبتلا ہیں) (ان کے پیش نظر) سوال پیدا ہوتا ہو کہ اس زمانے میں آدمی اپنے ایمان کی اور ایمانی قوت سے عمل صالح کے حدود کی حفاظت میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کے جواب میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم عقیدۂ ولدیت کے آثار ہی کو دیکھ دیکھ کر خفقان میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہو۔

لہ تفسیری روایات جو بقول امام احمد بن حنبل غیر معتبر گز دہ روایتوں کا ایک بڑا انبار ہو، ان ہی میں آیا ہو کہ قریش نے مدینہ کے احبار یہود کے پاس نضر بن حارث کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی جانچ کے لئے کچھ باتیں بتائیں۔ کہتے ہیں کہ ان علماء یہود نے منجملہ دوسرے سوالوں کے ایک سوال یہ بھی دیا تھا کہ کہف والوں کا قصہ محمدؐ سے پوچھنا، وفد نے واپس آکر باتیں پوچھیں جواب میں قرآن نازل ہوا اسی لئے ابتدا جواب کی اس فقرہ سے کی گئی کہ کہف والوں کے قصے کو تم بہت عجیب بات سمجھتے ہو، وہ تو یہ ہو، میں کیا عرض کروں کہ عجبا کے لفظ کے لئے یہ روایت کس حد تک مفید ہو سکتی ہو جب کہ دوسرے سوالوں کے جوابات جن کی نوعیت یہی تھی، ان میں تعجب کا ذکر نہیں کیا گیا، میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ ایک عام مشہور قصہ کو نبوت کے جانچنے کا معیار علماء یہود نے کس بنا پر ٹھہرایا تھا اور فرض کیجئے کہ قصہ کا علم نادر ہی ہیں جو پوچھی گئی تھیں تو اندازہ علم نبوت کی اہل کیسے بن سکتی ہو۔

باہم ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہو کہ آج ایمان کو کیسے بچالیا جائے؟ .... (حالانکہ) ایمان اس قسم کی آزمائشوں سے گزرتا ہی رہا ہے، کہف والے بیچارے جن حالات سے دوچار ہو گئے تھے اور ان ہی حالات میں ایمان وعمل اور اس کے نتائج کے بچالینے میں وہ کامیاب ہوئے، کیا تم اس کو کوئی ایسا عجیب و غریب اور شاذ واقعہ خیال کرتے ہو جو کسی اصول و قانون کے تحت نہیں بلکہ محض اتفاق سے پیش آگیا تھا۔ اور یہ بھی ہو میرے نزدیک اصحاب کہف کے قصہ کا اپنے ماقبل کی آیتوں کے مضمون سے تعلق اب اس کے بعد میں اصحاب کہف کا قصہ اور جن الفاظ میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا نیز جو نتیجے ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں، پھر یہ کہ ان نتیجوں سے اس تعجب کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے جس میں ہم اور آپ (جو ایسے ناسازگار ماحول میں ایمان وعمل صالح کی زندگی کو بچالینے کو عجیب بات سمجھے ہوئے ہیں) مبتلا ہیں، بہر حال اب میں ان ہی باتوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شارح الصدور سے دعا ہو کہ دلوں کو کھولے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں دوسروں کی سمجھ میں بھی وہ آجائے۔ وما توفیقی الا باللہ

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

(۱)

قرآن اٹھائیے، عربی سمجھ میں نہ آتی ہو تو کسی ترجمہ کو پڑھ لیجئے، اصحاب کہف کے قصہ میں سب سے پہلی بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ بجائے ایک کے مجمل ومفصل دو مستقل تعبیروں میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔

جب پناہ لی جوانوں نے کہف (کھوہ) میں تو کہا انہوں نے اے ہمارے پروردگار! عطا کر اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور مہیا فرما ہمارے کام کے متعلق ہمیں سوجھ بوجھ، تب تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کھوہ میں گنتی کے چند سال، پھر اٹھایا ہم نے ان کو تاکہ ہم یہ جانیں کہ دونوں جتھوں میں سے کس نے احصا کیا اس مدت کا جس میں وہ ٹھہرے (اس غار میں)

یہ قریب قریب ترجمہ ہوا ان قرآنی الفاظ کا یعنی "اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا" قصہ کی یہ پہلی تعبیر ہے جس کا نام میں نے اجمالی تعبیر رکھا ہے گویا کل چار فقروں یا آیتوں پر یہ تعبیر مشتمل ہے، اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ "میں ان کا قصہ حق کے ساتھ تمہیں سناتا ہوں" قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن میں پائی جاتی ہے جو کافی طویل ہے، عام طور پر چھوٹی تقطیع والے قرآن کے ڈیڑھ صفحہ سے زیادہ جگہ اس نے لی ہے۔

تفصیلی اور اجمالی دو تعبیروں کی مصلحت

جاننے والے جانتے ہیں کہ اختصار پسندی قرآن کی ایک بڑی خصوصیت ہے لیکن اس خاص قصہ کے متعلق یہ طریقہ کہ پہلے اجمالی تعبیر میں قصہ کو ادا کیا گیا اور پھر اجمال کے بعد اسی قصہ

کو تفصیلی رنگ عطا کیا گیا، بجائے خود ایک نئی بات ہے۔ اجمالی اور تفصیلی تعبیروں کے مشتملات پر غور کرنے سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ ایک ہی قصہ کو اجمالی اور تفصیلی دو تعبیروں میں ادا کرنے کی آخر کیا مصلحت ہے؟ اس مصلحت کا صحیح علم تو خود قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہوگا۔ خاکسار کی جو کچھ یافت اس سلسلہ میں ہے اسے پیش کر دیتا ہے۔

تفصیلی تعبیر کی اس آیت سے یعنی۔

إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ	اگر تمہارے دشمن) تم سے واقف ہو جائیں گے تو تم کو سنگسار کر دیں گے یا اپنے دین سے تم کو مرتد بنا لیں گے۔

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایمانی آزمائش اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ یا جان سے ہاتھ دھولیں، یا اپنے دین سے تعلق قطع کر کے مرتد بن جائیں۔ غالباً ایمانی آزمائش کی شدت کا یہ آخری نقطہ ہوسکتا ہے لیکن اس جز کا اضافہ تفصیلی تعبیر میں کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اجمالی تعبیر میں صرف اس کا ذکر ہے کہ پناہ لینے کے لئے کہف والے غار میں چلے گئے تھے، لیکن کس چیز سے پناہ لینے کے لئے انھوں نے ایسا کیا تھا۔ اس کا ذکر اجمالی تعبیر میں نہیں ہے صرف ماسبق کے نحوی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانی آزمائش ہی کا یہ قصہ تھا۔

میرا خیال یہی ہے کہ دنیا میں جیسے عموماً چیزوں کی دو حدیں ہوتی ہیں ایک ابتدائی اور ایک انتہائی اسی طرح ایمانی آزمائش میں دیکھا جاتا ہے کہ انتہائی حد تو اس کی وہی ہے کہ جان دیجئے یا ارتداد اختیار کیجئے اور ابتدائی حال اس کا اس ماحول سے شروع ہوتا ہے جس میں گمراہی، ضلالت کا تسلط اکثریت پر ہو جاتا ہے۔ جان یا مال کا خطرہ تو پیش نہیں آتا، مرتد ہونے پر خواہ مخواہ مجبور تو کسی کو کوئی نہیں کرتا لیکن ملک کی عام سوسائٹی اور مجلسی ماحول سے کنارہ کشی اختیار کئے بغیر دین وایمان اور ان کے اقتضاؤں کی تکمیل بظاہر ناممکن یا کم از کم سخت ترین قسم کی دشواریوں کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہو، سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید تفصیلی تعبیر میں ایمانی آزمائش کی آخری حد کے مشکلات پیش نظر ہیں، اور اسی کے مقابلہ میں ایمانی آزمائش کی ابتدائی کیفیت کی دشواریوں سے نجات یابی کی طرف اجمالی تعبیر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب آیئے اس نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے قصہ کی اجمالی تعبیر کے مشتملات اور جو نتائج ان سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر غور کریں۔

اجمالی تعبیر کے مشتملات ونتائج ظاہر ہے کہ پہلی بات اس تعبیر میں یہی بیان کیا گئی ہے کہ ایمانی آزمائش میں مبتلا ہونے والوں نے اپنے علاقے کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا، اور اسی فیصلہ کے مطابق وہ "الکہف" (کھوہ) میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے، یعنی ایسے مقام کا انتخاب بود وباش کے لئے کیا جہاں اس عہد کی عام بے ایمان، ادھرم سوسائٹی کی گندہ لہروں سے محفوظ رہنے کی ان کو توقع ہوسکتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ ایمانی آزمائش کے ان حالات میں علیحدگی اور کنارہ کشی کی یہ تدبیر بذاتِ خود کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ پہلی بات ان حالات میں دل میں اگر آتی ہے تو یہی آتی ہے کہ۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو،
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو،

مگر اس شاعرانہ خیال کی خوش گواری اسی وقت تک باقی رہتی ہو جب تک کہ خیال صرف خیال ہو لیکن خیالی حدود سے نکل کر عمل کی سرحد میں قدم جس وقت رکھا جاتا ہو اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال اتنا آسان نہیں ہو جتنا کہ شاعروں نے اس کو مشہور کر رکھا ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان فطرۃً اُنس پسند پیدا ہوا ہو۔ تنہا کسی ایسی جگہ زیادہ دن تک وہ ٹھہر نہیں سکتا جہاں انس حاصل کرنے کے لئے اسی کے ہم جنس اور ہم مذاق افراد کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ "آدمی فطرۃً مدنی الطبع ہو" اس کا بھی یہی مطلب ہو اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہو کہ عام سوسائٹی سے کنارہ کشی کے بعد معاشی سہولتوں کے بھی دروازے عموماً بند ہو جاتے ہیں حالانکہ سد رمق ہی کی حد تک سہی جس سے جان کا رشتہ بدن کے ساتھ باقی رہے، کم از کم اس کی ضرورت تو ہر اس شخص کو ہوتی ہو جو فرشتہ نہیں بلکہ آدمی بنا کر دنیا میں پیدا کیا گیا ہو، اور تیسری بات تجربہ کی اس سلسلہ میں وہی ہو جس کا مشاہدہ بداوت کی زندگی رکھنے والوں میں ہمیشہ کیا گیا ہو، قرآن میں بھی بداوت کی اسی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہو کہ ذہنی پستی اس حد تک زوال پذیر ہوتے ہوئے پہونچ جاتی ہے کہ

اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ	زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں (بدوی زندگی رکھنے والے) اس امر کے کہ اللہ کی اتاری ہوئی باتوں کے حدود کو نہ پہچانیں

ؔ "دہ مردہ مرد را احمق کند" مشہور بات ہو۔

تہذیب و تمدن کے ماحول سے عزلت گزینی اسی لئے ایک طرف اگر اس ماحول کے مخفی اثرات، اور زہریلے نتائج سے محفوظ رہنے کی ایک کارگر تدبیر ہو تو دوسری طرف اس قسم کی زندگی قدرتاً دماغ کو کند، عقل کو تاریک بنانے بھی چلی جاتی ہو۔

آپ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اب غور کیجئے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر کی آیتوں میں سب سے پہلی بات تو آپ کو یہی نظر آئے گی کہ کہفی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے والوں کو قرآن بجائے فرد واحد کے "فتیہ" (یعنی نوجوانوں کی ایک ٹولی) قرار دیتا ہو۔ آپ چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں کہ ایمانی آزمائش کے زمانے میں

ملہ یہ خیال کرکے کہ سن رسیدہ ہونے کے بعد آدمی جس ماحول کا عادی ہو جائے اس سے الگ ہونا اس کے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہو بعض حضرات نے فتیہ "نوجوانوں" کے لفظ سے نکتہ پیدا کیا ہو کہ معمر کہن سال لوگوں کو کہفی زندگی کی رفاقت کے لئے نہ لینا چاہیئے مگر میرا خیال یہ ہو کہ رفاقت پر اگر کہنہ سالی لوگ آمادہ نہ ہوں تو یہ الگ بات ہو۔ لیکن اگر وہ ساتھ دینے پر تیار ہوں تو محض کہنہ سالی کی وجہ سے ان کو چھوڑنا نہ چاہیئے قرآن میں فتیہ کا لفظ ضرور آیا ہو لیکن کہف کے رفقاء جب نوجوان ہی تھے تو قرآن ان کی تعبیر اگر فتیہ کے لفظ سے نہ کرتا تو اور کس سے کرتا بہرحال میرے نزدیک یہ واقعہ کا اظہار ہو خواہ مخواہ اس سے نکتہ آفرینی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۲

جب یہ محسوس ہو رہا ہو کہ تہذیب و تمدن کے عام ماحول میں رہ کر ایمان و عمل صالح کی زندگی کے اقتضاؤں کی تکمیل میں کامیابی نہیں ہو سکتی اور نجات کی راہ یہی نظر آتی ہو کہ اس ماحول سے رشتہ منقطع کر کے بود و باش کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو اس قسم کے خبیث شیطانی ماحول سے دور ہو، تو قرآن سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ اپنے ہم مذاق ہم مشرب افراد کو آمادہ کیا جائے کہ اس کہفی زندگی میں ساتھ دیکر ایک دوسرے کے لئے باعث انس بھی ثابت ہوں اور ضرورت کے وقت باہم ایک دوسرے کی دست گیری و غمگساری بھی کر سکتے ہوں۔ دوسری بات قصہ کی اسی اجمالی تعبیر سے جو سمجھ میں آتی ہو وہ کہفی زندگی کا فیصلہ کرنے والوں کا یہ نقطۂ نظر ہو کہ انہوں نے اس زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنی پرورش کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ لو لگائی تھی فرمایا گیا ہو کہ فقالوا ربنا (انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار!) جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہو کہ ربوبیت اور پرورش کے جو جھوٹے یا مجازی مظاہر ہیں ان سے یک لخت بے تعلق ہو کر اس نئی زندگی کی راہ میں اپنے "رب صادق" اور "سچے پروردگار" کے دامن کو انہوں نے تھام لیا تھا، وہ عام اسباب کی دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے، لیکن جو اسباب کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہو وہ ان سے الگ ہو کر کیسے جی سکتا ہو اسی لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انھوں نے مجازی اسباب سے تو علیحدگی اختیار کی تھی لیکن جو مسبب الاسباب اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہو اس کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلقات کو وابستہ کر کے دعا کر رہے تھے۔ (کہ)

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً — اے ہمارے پروردگار عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں "رحمت"

وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا — اور فراہم فرما ہمارے معاملہ میں "رشد"

الفاظ دعا کی معنویت | "رشد" عربی زبان کا لفظ ہو جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہو۔ خصوصاً "غَیّ" کے مقابلہ میں "رشد" کے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن یہی بتا رہا ہو کہ انسان کی فکری و نظری قوت سے اس کا تعلق ہو۔ یہی فکری و نظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہونچتی ہو تو اس کا نام "غَیّ" ہو اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر و نظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام "رشد" ہو بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کا تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہو تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ سوسائٹی کے گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر امرنا کے لفظ سے دعا میں کی گئی ہو، اپنے اسی ایمانی مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ غَیّ اور گمراہی سے بچاتے ہوئے ان کی فکر و نظر کی قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے سچا قدم اٹھے، رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے لئے چلی جائے۔

اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعا کے پہلے فقرے میں "رحمت" کا لفظ جو پایا جاتا ہو اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہو، مطلب یہ ہو کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السماوات والارض کی رحمت قرآن ہر چیز میں سمائی ہوئی ہو

"وَسِعَتْ رَحْمَتِی کُلَّ شَیْئٍ" (ہر شے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہو) قرآن ہی کی آیت ہو، مگر یہاں "رحمت" کے اس لفظ کا استعمال جب "رشد" کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہو تو اس قرینہ سے یہی سمجھنا چاہیے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعا وہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری اور معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں، حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری و نظری قوتوں کے انحطاط و زوال کا خطرہ۔ الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالیٰ کی غیبی پشت پناہیوں کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم از کم اس خاکسار کو مشتمل نظر آرہی ہو۔

قدرت کی طرف سے انتظامات | اس کے بعد میرا خیال ہو کہ "رشد" کی درخواست دعا، کے دوسرے فقرے میں جوان کی طرف سے پیش ہوئی ہو اگرچہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اس آرزو کی تکمیل کے لئے قدرت کی طرف سے کہفی زندگی میں کیا کیا انتظامات کئے گئے تھے۔ مگر بظاہر جہاں تک سمجھ میں آتا ہو کہ ایمانیوں کی یہ ٹولی ایک دوسرے کے ساتھ حق[1] اور صبر کی تواصی کے فرض کو ادا کر کے جیسا چاہیئے ان کے "رشد" کی حفاظت کرتی ہوگی وہیں اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ ایمانی راہ کے دوسرے چلنے والے جوان سے پہلے گذر چکے تھے ان کے تعلیمات اور مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ان کی رقمی یادگاروں سے ان کو عزلت اور کنارہ کشی کی زندگی میں مل گیا ہو، بالفاظ دگر ان کے پاس دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے کچھ صحائف و مخطوطات اور ان ہی پیغمبروں کے ماننے والوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں ہوں جن سے ان کی رشدی بصیرت روشنی حاصل کرتی ہو تو اس کے انکار کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ جو "الکہف" کے ساتھ "الرقیم" کے لفظ کی طرف بھی ان کی اضافت کی گئی ہو، تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف جن کے متعلق اگرچہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہو کہ۔

لا ادری ما الرقیم	میں نہیں جانتا کہ "الرقیم" کیا چیز ہو

تو ان ہی تفسیر طبری میں ان ہی کا یہ قول بھی ملتا ہو، درمنثور میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کیا ہو کہ۔

من طریق علی عن ابن عباس قال الرقیم الکتاب (ص ۲۱۱ ج ۴)	علی کی روایت ابن عباس سے یہ ہو کہ "الرقیم" کتاب ہو۔

علی جن کا پورا نام علی بن ابی طلحہ الہاشمی ہو، سمجھا جاتا ہو کہ ابن عباس کے تفسیری اقوال کی روایت میں ان کا کیا مرتبہ[2] ہو، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ الکتاب کے ساتھ الرقیم کی تفسیر میں کتنی قوت ہو۔

بہر حال میری غرض یہی ہو کہ "الرقیم" سے کیا مراد ہو؟ اگر اس کا تعین کرنا ضروری ہو، تو لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا

---

[1] حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و تلقین، اہل ایمان کی قرآنی خصوصیت ہو، سورۂ والعصر میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو ۱۲

[2] حاشیہ کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ہو کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو "الرقیم" کہتے تھے، اور صحابہ کے اقوال میں بھی مستند ترین قول یہی ہو کہ الرقیم سے مراد الکتاب ہو۔ ایسی صورت میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی دعاء کے دوسرے فقرے یعنی اپنے امر کے متعلق "رشد" کی جس روشنی کے مہیا کرنے کی درخواست انہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھی اسی درخواست کی منظوری "الرقیم" کو مہیا کرکے قدرت کی طرف سے ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ ہو کہ کہفی زندگی کی یہ دونوں اہم ضرورتیں یعنی معاشی سہولتیں ان کے لئے من لدنی طور پر فراہم کی جائیں اور باطنی روشنی کی بقا وارتقاء ان دونوں ضرورتوں کا انتظام اپنے "رب" کے سپرد کرکے کہفی زندگی میں وہ داخل ہو گئے اس کے بعد قصہ کی اجمالی تعبیر میں دو فقرے اور پائے جاتے ہیں۔ پہلا فقرہ تو یہ ہو کہ۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا　　پس تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کہف میں چند سال گنتی کے۔

بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہو کہ "رشد" کی معنوی بصیرت ہی کی حفاظت کا یہ سامان بھی قدرت کی طرف سے ان کے لئے کیا گیا تھا مطلب یہ ہو کہ فاسد اور بگڑی ہوئی سوسائٹی سے جسمانی طور پر علاحدگی عموماً اس وقت تک چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ سوسائٹی کے فساد اور بگاڑ کے اس عہد کے ذکر واذکار گپ شپ جھوٹ خرافات سے بھی اپنے آپ کو بے تعلق نہ کر دیا جائے۔ .... اوروں کا خیال کچھ ہی ہو لیکن اپنا تجربہ تو یہی ہو کہ "رشد" "ہدایت" کی لاہوتی روشنی سے صحیح طور پر استفادہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہو جنھوں نے "اسی روشنی" کے ساتھ ان ظلمات اور تاریکیوں کی موجوں کو بھی اپنے اندر گذرنے کے لئے آزادی دے رکھی ہو جو فاسد سوسائٹی کے دل و دماغ سے نکل نکل کر ماحول کو متاثر کر رہی ہوں۔

کچھ بھی ہو اپنا ذہن تو مذکورۂ بالا آیت جس میں فرمایا گیا ہو کہ چند سال کے لئے ان کے کانوں کو ہم نے تھپک دیا تھا، یعنی فضربنا علیٰ اذانهم فی الکھف سنین عددا۔ اس سے ادھر منتقل ہوتا ہو کہ رشد کی جس روشنی کی فراہمی کی استدعا بارگاہ ربانی میں ان لوگوں نے پیش کی تھی اسی کے سلسلہ میں اور جو قدرتی تائید یں ان کو میسر آئی ہوں گی ان ہی کے ساتھ شاید یہ بھی کیا گیا کہ اپنے ملک کی سوسائٹی کے جس متعفن اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کہفی زندگی کے نیچے انہوں نے پناہ لی تھی اس سوسائٹی میں گزرنے والے حوادث و واقعات اور اس میں پیدا ہونے والے گندے افکار وخیالات سے بھی ان کے کانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا تھا، اور بجائے اس کے اس کہفی زندگی میں ان کے "رشد" کی بقاء اور ارتقاء کا جو سامان کیا گیا تھا اسی میں وہ مگن تھے۔

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۵۸ سے اسی سے اندازہ کیجئے کہ امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ مصر میں علی ابن ابی طلحہ کی روایت سے ابن عباس کی تفسیر کا جو نسخہ پایا جاتا ہو اگر بغداد سے صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کے لئے مصر کا سفر کوئی کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی (اتقان) بخاری نے بھی ابن عباس کے تفسیری اقوال کے نقل کرنے میں اسی طریقہ کو ترجیح دی ہو ۱۲۔

ایمان اور عمل صالح کے نتائج و ثمرات

اجمالی تعبیر کا مفاد اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر سے قرآن کی جن آیتوں کا تعلق ہے ان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ناموافق حالات پر غالب آنے یا ان سے مقابلہ کرنے کا امکان جب محسوس ہو کہ باقی نہیں رہا ہے تو اس وقت ایمان و عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کی تدبیر یہ ہے کہ کہفی زندگی اختیار کر لی جائے، اور یہ کہ کہفی زندگی میں معاشی دشواریوں کے ساتھ فکری جمود اور ذہنی خمود کا خطرہ قدرتاً جو پیدا ہوتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ سے ان دونوں خطروں سے محفوظ رہنے کی دعا کی جائے۔ اور یہ وہی مشورہ ہے جس کی طرف ان صحیح حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں آیا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جس میں القاعد (بیٹھنے والا) القائم (کھڑا رہنے والے) سے، اور الماشی (معمولی چال چلنے والا) الساعی (دوڑنے والے) سے بہتر ہوگا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا ہے کہ اس زمانہ میں بجائے میدان میں آنے کے، چاہیئے کہ مومن اپنے گھر کا ٹاٹ بن کر پڑ جائے۔ بخاری کی مشہور روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینہ من الفتن۔

قریب ہو کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی، جن کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں، اور پانی کے چشموں کی طرف اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے بھاگا کا پھرے گا۔

[اس] کا مفاد بھی یہی ہے، پیشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں بھی مسلمانوں کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا جیسے کی زندگی کے دور سے نبوت کبری عامہ جب گذر رہی تھی تو قرآن ہی میں اسی عہد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

ان الذین اجرموا کانوا من الذین　　جو مجرم ہیں وہ ایمان لانے والوں سے ہنستے ہیں

امنوا یضحکون، واذا مروا بھم یتغامزون، واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین، واذا راوھم قالوا ان ھؤلاء لضالون ۔ (المطففین)

اور جب ان پر گذرتے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے چشمک زنی کرتے ہیں، اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں، اور جب ایمان والوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گم کردہ راہ ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کے سامنے اس قسم کے واقعات گذر رہے تھے کہ سنگ و خشت سے بنی ہوئی مسلمانوں کی کوئی عبادگاہ نہیں بلکہ اسلام کے سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذات گرامی کے احترام و تقدس کے ساتھ وابستہ ہے، یعنی خود سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدے میں ہیں، پشت مبارک پر اونٹنی کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے، اور صحابۂ کرامؓ جیسے تر و تازہ ایمان و اسلام رکھنے والے حضرات پیغمبرؐ کو اس حال میں دیکھتے ہیں۔ ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاری ہی نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس حال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

وانا انظر ولا اغنی عنہ لوکانت لی منعۃ۔

میں رسول اللہؐ کو اس حال میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آسکتا، کاش! میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی۔

تفصیلی تعبیر کے اشارات

بہرحال قصہ کی اجمالی تعبیر سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی کہ اپنی دینی زندگی کو چاہا جائے تو ہر حال میں بچالیا جاسکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصحاب کہف کی [تفصیلی] سرگذشت کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے اس بشارت سے ہے جس میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی کے اجر حسن یا نتائج و ثمرات سے اہل ایمان ہر حال میں مستفید و متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

اصحاب کہف کے قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن کے جس بیان کو میں قرار دے رہا ہوں اگر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اسی دعوے کے ثبوت کی گویا یہ ایک تاریخی مثال ہے، بتایا گیا ہے کہ.........

انھم فتیۃ امنوا بربھم

(یہ کہف والے) چند نوجوان تھے، ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر۔

"اپنے رب پر ایمان لانا" یہی ان نوجوانوں کا اختیاری فعل تھا، چاہتے تو جیسے ان کی قوم کی اکثریت اپنی اس پرورش کرنے والی قوت سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے زندگی گذار رہی تھی، وہ بھی اسی طریقہ کو اختیار کرلیتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنے رب کی یافت کا جو قدرتی طریقہ ایمان کا ہے اس کا رشتہ "رب" سے قائم کرکے مومن بن گیے، یہاں تک تو ان کا کام تھا جسے ان نوجوانوں نے انجام دیا، اب سنئے اسی ایمان کا اجر حسن ان کے سامنے کن کن شکلوں میں مسلسل آتا چلا گیا، اس کے بعد اطلاع دی گئی ہو:-

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى — اور ہم نے ہُدیٰ یعنی (راست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا۔

باطنی نعمت سمجھا آپ نے یہ کیا کہا گیا؟ نوجوانوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے فرض کو پورا کیا تھا، تب اس کا معاوضہ اور اجر حسن ان کو ان کے رب کی طرف سے ایک معنوی دولت، اور باطنی نعمت کی شکل میں عطا کیا گیا، یعنی باہر میں تو بظاہر کسی قسم کی کوئی ایسی چیز ان نوجوانوں کے سامنے نہیں آئی، جسے دیکھنے والے ان کے ایمان کا اجر و معاوضہ قرار دیتے، لیکن اندر ہی اندر ان کی بصیرت کی روشنی میں قدرت کی طرف سے اضافہ شروع ہوا! ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لیے دشوار بلکہ شاید ناممکن تھا اب ان ہی کو وہ پا رہے تھے اور قدرت کی پیدا کی ہوئی اس معنوی روشنی میں ان ہی چیزوں کو وہ دیکھ رہے تھے، تا اینکہ باطنی سلوک کی اسی راہ میں چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام تک پہونچ گئے، جس کی خبر قرآن نے اسی کے بعد ان الفاظ میں دی ہے:۔

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ — اور باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب یعنی دلوں پر۔

"قلوب" قلب کی جمع ہے، یہ وجود انسانی کے اس عنصر کی تعبیر ہے، جس کا کام ہی انقلاب یا یہ کہ الٹنا پلٹنا رہے یہی ہے، لامحدود اسباب کا یہ گھنا جنگل جس کا نام عالم یا دنیا ہے، اس عالم کے رب سے جب تک انسانی وجود کا یہ چنچل حصہ بیگانہ اور نامانوس رہتا ہے، اس وقت تک [برابر] ایک سبب سے منتقل ہو کر دوسرے سبب اور دوسرے سے تیسرے سبب کی وادی میں سراسیمہ ہو کر بھٹکتا [رہتا] ہے، ....

لیکن ایمان کی راہ سے، اپنی پرورش کرنے والی قوت کو جو پالیتے ہیں اور اس ایمان کے معاوضہ میں معنوی بصیرت کی جو روشنی ان کو رب کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اس باطنی روشنی کی شدت جس حد تک بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور "ربوبیت" کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگتا ہے تا اینکہ وہی "قلب مضطرب" یا انسانی وجود کا "بے چین عنصر" سکون و قرار کے ایک ایسے خنک برف خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے جس کی صحیح تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ ہر طرف سے توڑ کر اسی قلب کو "ربوبیت" کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ گویا باندھ دیا گیا ہے۔

طمانیت و سکون کی اسی کیفیت کو لوگ روپے کے ڈھیروں، بینک کے پاس بکوں، اور سرمایہ کی دوسری منقولہ و غیر منقولہ جائدادوں کے اندر ڈھونڈھتے ہیں، مگر ان چیزوں کے پالینے کے بعد بھی وہ ڈھونڈھتے ہی رہتے ہیں، لیکن قلب کے مربوط ہو جانے کی مذکورۂ بالا باطنی نعمت سے جو سرفراز کیا جاتا ہے اس کے پاس باہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے باطن کو ہر چیز سے کسا کسایا پاتا ہے، دماغ نام رکھیے یا دل، عقل کہیے یا دانش، ڈانوا ڈول رہنے کی لعنت سے اسکو نجات مل جاتی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی جرأت اس میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو

غیر مربوط قلب والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے۔ خود ان ہی "فتیہ" یعنی نوجوانوں کے متعلق [یہ خبر دیکر] کہ

إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَٰهًا لَّقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا

(اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے، پھر بولے، ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے، ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الٰہ کو پکاریں گے اگر ایسی بات ہم نے کہی تو (حقیقت سے) یہ ہٹی ہوئی بات ہوگی۔

هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ

اس ہماری قوم نے (خالق عالم) کے سوا دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرا لیا ہو کیوں نہیں لاتی (اپنے اس دعوی) پر کوئی ایسی کھلی ہوئی دلیل جو عقل پر چھا جائے۔

قرآن نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا:-

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا

اور جب تم لوگ (اے نوجوانوں) کنارہ کش ہو گئے ان سے (یعنی اپنی قوم سے) اور ان چیزوں سے جنھیں اللہ (خالق عالم) کے سوا وہ پوجتے ہیں تو آؤ پناہ لو الکہف (کھوہ) میں، کھول دے گا تمھارے لیے تمھارا پروردگار اپنی رحمت کو اور مہیا کرے گا تمھارے معاملہ میں سہولتیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ اپنی پوری قوم جن میں ان کے اعزہ و رشتہ دار بھی ہوں گے، وہ بھی ہوں گے جن سے معاشی ضرورتوں کے حل میں ان کو امداد ملتی ہو گی، دوست ہوں گے، احباب ہوں گے، مگر ایمان کی بدولت (اسی کا اجر و معاوضہ ان کو اس بلند ہمتی کی شکل میں ملا کہ اپنی تمام ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساز و سامان کو ٹھکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کو بھی چھوڑا، اور جن مفروضہ معبودوں کے ساتھ ان کی قوم بلاوجہ الجھی ہوئی تھی ان سے بھی قطعی بے تعلق ہو کر اب ان میں اس کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے کھوہ میں بھی اپنے پالنے والے رب کی پروردگاری کا تماشا دیکھیں، ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر ایک نے دوسرے کے آگے "الکہف" (کھوہ) کی تجویز پیش کی، اور کتنی قوت کتنی طاقت کے ساتھ پیش کی، بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے

باہم ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ آبادیوں میں پالنے والے رب کی پروردگاری اور اس کی مہربانیوں کا تجربہ ضرور ضرور وہاں بھی ہم لوگوں کو کرایا جائے گا جہاں عالم اسباب کے چکروں میں پھڑپھڑانے والی عقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی گویا وہ کہہ رہے تھے جہاں کچھ نظر نہیں آرہا ہو وہیں سب کچھ تمہیں میسر آئے گا۔ . . .

قصہ کی اجمالی تعبیر میں تو ان کی دعاء کا تذکرہ کیا گیا تھا، لیکن یہاں ان کے ایمان کے بعد اس یقین و اعتماد کی قرآن خبر دے رہا ہو جس سے اپنے رب پر ایمان لانے کے بعد وہ سرفراز ہوئے تھے، سچ پوچھئے تو یہ بھی ایمان ہی کے اجر حسن اور اچھے معاوضہ کا ایک قالب تھا جو دوسرے معاوضوں کے ساتھ ساتھ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ایمان سے محروم بدبخت بے ایمان تک کے روگی غریب کو اس یقین اس اذعان و اطمینان کی ہوا بھی چھو سکتی ہو؟ اور جیسے قصہ کی اجمالی تعبیر میں ان کی دعاء دو اجزاء پر مشتمل تھی، ایک کا تعلق جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا تھا، بظاہر معاشی سہولتوں سے معلوم ہوتا ہو اور دوسرے جز میں استدعا کی گئی تھی کہ رشد یا فکری و ذہنی سوجھ بوجھ کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح قصہ کی تفصیلی تعبیر میں بھی بجائے ایک کے دو چیزوں کی فراہمی کا یقین باہم ایک دوسرے کو دلا رہے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی ان دونوں اجزاء سے وہی دو باتیں مراد نہ ہوں جن کی آرزو اپنی دعا میں انہوں نے کی تھی۔

بہرحال اس وقت تک تو اصحاب کہف کے ایمان کا اجر و صلہ ان کے اندر پیدا ہو ہو کر ان کی تقویت و حفاظت کا ذریعہ بنا رہا اور اسی کی پشت پناہی میں ایک ایسی جگہ کو چھوڑ کر جو ان کا وطن مالوف تھا، اور جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ المدینہ یا ایسا شہر تھا جس کے بازاروں میں "اَزْکٰی طَعَامًا" (صاف ستھرا کھانا) خریداروں کو مل جاتا تھا اور بیان کرنے والوں کا بیان اگر صحیح ہو کہ یہ ایشیاء کوچک کی قدیم حکومت ایونیا کا مشہور پایۂ تخت افیسس[1] تھا، تو اس کے یہ معنی ہے کہ وہاں وہ سب کچھ مل رہا تھا

(۱) عام طور پر اصحاب کہف کے وطن کا نام اسلامی ذخیرہ اسلامی کتابوں میں افیسس یا افسوس بتایا گیا ہو، بیکی صاحب نے اپنی کتاب ڈکشنری آف بائبل ہسٹری میں لکھا ہو کہ یہ شہر ایونیا کا دارالخلافہ تھا اور ارتمس دیوی کے مندر نیز اپنے فلسفہ اور بدکاری کی وجہ سے مشہور تھا، ان ہی کا بیان ہو کہ اس شہر کی آبادی کچھ تو ارگت کے یورپین باشندوں پر اور کچھ مشرقی قوموں کے افراد پر مشتمل تھی، اسی لیے یہاں کی بت پرستی میں مغربی و مشرقی دونوں علاقوں کے مشرکانہ رسوم کا اثر تھا۔ ارتمس دیوی یورپ کی مشرک قوموں کی دیوی تھی، اس کا مندر شہر افیسس میں تھا، کہتے ہیں کہ دو سو بیس سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی، ۱۲۰ سنگی ستونوں پر اس مندر کی چھت قائم تھی، ایک ایک ستون اس مندر کا مختلف بادشاہوں کی طرف سے بطور نذرانہ کے مندر پر چڑھایا گیا تھا، ہر ستون ساٹھ فٹ اونچا تھا۔ خود ارتمس دیوی کی مورتی تو لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور عقیدہ تھا کہ آسمان سے نازل ہوئی ہو لیکن بازاروں میں اس مورتی کی نقلیں بھی بکثرت فروخت ہوتی تھیں، تیرتھ میں آنے والے خرید خرید کر اپنے اپنے ملک میں بطور تحفے لے جاتے تھے۔ فلسفہ کا زور بھی اس شہر میں اس حد تک ترقی کر کے پہنچ گیا تھا کہ آج تک گریک کا فلسفہ ایونیا کی طرف منسوب ہو کر یونانی فلسفہ کے نام سے موسوم ہو۔ سحر اور جادو میں بھی اس شہر کے باشندے مشہور تھے، اسی کے ساتھ عیاشی اور شہوت نفسی میں بھی یہ اپنی آپ ہی نظیر تھے اب کھنڈر کی صورت میں وہاں نے کچھ پتھر کے دانے
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جس کا آدمی اپنی ہستی کو وہ دینی زندگی میں محتاج ہو۔

لیکن اب کچھ چھوڑ کر جہاں کچھ نہ تھا، وہیں جانے کے لئے اس یقین کے ساتھ آمادہ ہو گئے کہ سب کچھ وہیں مل جائے گا۔ وہ بھی جس کے بغیر جسدی نظام قائم نہیں رہ سکتا اور وہ بھی جس کے بغیر آدمی کی روحانی زندگی موت بن جاتی ہے۔

خارجی مقامات | ان کے ایمان نے اس یقین کو تو ان کے اندر پیدا کیا تھا، اور اب ان سے باہر دیکھئے قرآن دکھا رہا ہے:

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ (الکہف)	اور دیکھتا ہے تو آفتاب کو جب طلوع ہوتا ہے تو کترا کر گزرتا ہے ان کے کہف سے داہنی طرف، اور جب غروب ہوتا ہے تو کاٹتا ہے بائیں طرف، اور وہ لوگ (مقیم ہیں) اسی کہف کے فجوہ میں۔

سائنٹفک آرام گاہ | دیکھ رہے ہیں آپ ایمان کے اجر حسن کو، جس کوہستانی ملاوی میں سر چھپانے کا سوال بھی بڑا اہم سوال تھا، دیکھئے کہ بعد قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہترین صحت بخش سائنٹفک آرام گاہ ان نوجوانوں کو مل گئی۔

سرسری طور پر اگرچہ قرآن کے مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک غار میں وہ چلے گئے تھے، جس میں دھوپ کی گزر نہ تھی [لیکن اس بارے میں زیادہ نہیں] اتنا تو ہر حال لوگوں کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ کہف بھی عربی ہی زبان کا لفظ ہے اور غار بھی، قرآن نے بجائے غار کے کہف کا لفظ یہاں استعمال کیوں کیا؟

واقعہ یہ ہے کہ کہف کا تعلق بھی اس میں شک نہیں کہ عموماً پہاڑوں ہی سے ہوتا ہے جیسے غار کا لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ حرا، یا ثور کے تاریخی غار بلاشبہ غار تھے جن میں بمشکل چند آدمیوں کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے اسی لئے ثور کے غار کو قرآن نے بھی غار ہی کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن ان ہی پہاڑوں کے شکم میں خاص قسم کا خلاء قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہو جاتا ہے جس کی وسعت کبھی میلوں کی ہوتی ہے جنوبی ہند میں "بیجانگر" کی راجدھانی جن پہاڑوں کے درمیان تھی ان میں بیان کیا گیا ہے[1] کہ ایسے قدرتی طویل تہ خانے پائے جاتے تھے جن میں ہزارہا ہزار آدمی غائب ہو جاتے تھے اور مہینوں ان

---

[1] بیجاپور کی تاریخ میں زبیری نے لکھا ہے: "در اصل شہر بیجانگر" وحوالی آں کوہہا ہستند مشتمل بر رخنہ و غارہائے عمیق کہ شش فرسخ (۹ میل) چہار فرسخ (۱۲ میل) اندرون رخنہا راہ تواں رفت" یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اندرونی حصے ان کے بہت وسیع اور روشن ہیں اور کہیں بہت تنگ۔ بیجانگر کا جب سقوط ہوا تو شہر کی آبادی کی بڑی تعداد ان ہی کوہستانی تہ خانوں میں پناہ گزین ہو گئی تھی، مسلمانوں کو مہینوں کے بعد اس کی خبر ہوئی (صسا) امیر شکیب ارسلان نے بھی اپنے وطن لبنان کے ایک کہف کا تذکرہ کیا ہے جس میں ایک پوری فوج چھپ گئی تھی۔ ۱۲

صد ۱۶۴ کا بقیہ حاشیہ پر دور تک پھیلا پڑا ہے، ترک مسلمانوں کا ایک گاؤں جو آباد سلک ان ہی کھنڈروں کے درمیان اس وقت تک آباد ہے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں افیسوس کو لوگ طرطوس کہتے ہیں۔ ۱۲

ہی میں رہتے کھاتے پکاتے تھے اس قسم کے کھوہ دنیا کے دوسرے پہاڑوں میں بھی پائے جاتے ہیں، عربی زبان میں کہف دراصل ان ہی زیر زمین طویل و عریض تہ خانوں کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی کہف میں فجوہ تھا جسے اُن نوجوانوں نے اپنا مسکن بنایا تھا، فجوہ کے لغوی معانی کو پیش نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ باضابطہ وسیع ہال، یا دالان ہی اُن کو اپنے قیام کے لئے اس جبلی تہ خانے میں مل گیا تھا۔

اس قسم کے زیر زمین تہ خانوں میں سب سے بڑی مصیبت تاریکی، رطوبت، ٹھنڈک اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی کثافت اور جراثیم کی ہوتی ہو، یہ ان کے ایمان ہی کے اجر حسن کا نتیجہ تھا کہ ان سارے مضرت بخش خطرات کے ازالہ کی ضمانت جسم جس میں پوشیدہ ہو یعنی آفتاب کا آتشیں کرہ، اس کے متعلق قرآن کا بیان ہو کہ ایک خاص قسم کا تعلق قدرتی طور پر اس کو اس کہف سے پیدا ہو گیا تھا۔ طلوع و غروب کے وقت آفتاب اور اس کی شعاعوں کی دو مختلف نسبتیں جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہو روزانہ قائم ہوتی تھیں۔ طلوع کے وقت بیان کیا گیا ہو کہ خود کہف کے ساتھ تزاور کی نسبت پیدا ہوتی تھی یعنی اس کہف سے آفتاب کترا جاتا تھا، لیکن چونکہ عن کے ساتھ تزاور کی اس نسبت کو قرآن نے ظاہر کیا ہو اس سے عربی محاورے کے رو سے یہی سمجھ میں آتا ہو کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد آفتاب اور اس کی دھوپ اس کہف سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال یہی ہو کہ جس وقت آفتاب طلوع ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہو کہ کہف کے دہانے پر اس کی شعاعیں پڑ کر گزر جاتی تھیں، حاصل یہی ہو کہ دیر تک دھوپ ان کے کہف میں نہیں ٹھہرتی تھی، بلکہ رات کی تاریکی کی وجہ سے رطوبت و برودت اور ان سے پیدا ہونے والے مضار کو صاف کر کے گزر جاتی تھی، چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طلوع کے وقت کہف کے لئے اور کہف والوں کے لئے آفتاب کی بالائی بنفشی شعاعوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا گیا تھا، برعکس اس کے جس وقت آفتاب غروب ہونے لگتا تھا تو قرآن نے کہف کے ساتھ نہیں بلکہ اصحاب کہف کے متعلق یہ اطلاع دی ہو کہ آفتاب ان کو کاٹ جاتا تھا یہاں عن کا صلہ نہیں ہو، جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہو کہ کہف والے غروب کے وقت کی دھوپ سے کلیتہً محفوظ رہتے تھے جس کی وجہ بھی ظاہر ہو کہ غروب سے پہلے دن بھر دنیا دھوپ سے گرمائی رہتی ہو اسی لئے شام کی دھوپ نہ مرغوب ہی ہوتی ہو نہ مفید، تاہم ایک نکتہ یہاں بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ غروب کے وقت دھوپ سے بے تعلقی کو قرآن نے کہف کی طرف نہیں بلکہ براہ راست اصحاب کہف کی طرف منسوب کیا ہو، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ خود کہف میں غروب کے وقت بھی کچھ نہ کچھ دھوپ پہونچتی تھی، لیکن جس فجوہ (یا کمرے) میں اصحاب کہف مقیم تھے وہاں تک اس کی رسائی نہ تھی اور اسی سے سمجھ میں آتا ہو کہ یہ کہف دو رخا تھا، ایک رخ اس کا بظاہر سمت جنوب مائل بہ شرق تھا اور دوسرا سمت شمال مائل بہ غرب رخ تھا، اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شمال و جنوب کے ساتھ غروب و طلوع کے وقت آفتاب کے ساتھ نسبت اور تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، بلکہ اسی بنیاد پر میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ کہف

میں کھلا ہوا تھا گویا یوں روزانہ آفتابی شعاعوں اور ہوائی لہروں سے کہف کی صفائی (DISINFECT) کا کام قدرت لے رہی تھی۔

خدا ہی جانتا ہو کہ ان غریب نوجوانوں کے گھر شہر کے کس حصہ میں تھے اور صحت و راحت کے لحاظ سے اس محلہ کی کیا حالت تھی، لیکن دیکھئے قرآن دکھا رہا ہو کہ ان کے ایمان نے اسی بیابان میں جہاں سر چھپانے کا نظم بھی دشوار تھا گویا ایک ہائی سینا (صحت بخش) قیام گاہ کا مفت بغیر کسی کرایہ کے انتظام کر دیا، آگے اسی کے بعد فرمایا گیا ہو۔

ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا ؕ	یہ ہے اللہ کی نشانیوں سے، جس کو دکھائے راہ اللہ وہی راہ پانے والا ہو، اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو ہرگز وہ پائے گا تو اس کا کوئی پشت پناہ راہ بتانے والا۔

واقعہ سے سبق | جس کا مطلب میری سمجھ میں تو (واللہ اعلم بالصواب) یہی آتا ہو کہ آیات اللہ (اللہ کی نشانیوں) کو پا کر جو اللہ کو پا لیتا ہو اور خدا کے ... پتوں کو پڑھ کر خدا پر ایمان لاتا ہو اس کے نزدیک سب کچھ "اللہ" ہی ہوتا ہو، جہاں اللہ ہے وہاں یقین رکھتا ہو کہ اللہ اپنی آیتوں کو بھی ظاہر کرے گا، جیسے کہف والوں نے اللہ پر ایمان لا کر دیکھا کہ جہاں سر چھپانے کے سامان کی بھی صورت نہ تھی وہیں ان کے لئے اللہ نے ان کے رہنے سہنے کا معقول نظم کر دیا، مگر یقین کی یہ کیفیت ایمان کے معاوضہ میں ارزانی ہوتی ہو، مومن کو خدا اس کے ایمان کا یہ اجر دیتا ہو کہ ہدایت کی راہ اس پر کھول دیتا ہو لیکن اللہ سے بیگانہ اور بے تعلق ہو کر جو صرف آیت اللہ کی زنجیروں میں الجھے ہوئے ہیں وہ اپنی بے ایمانی کی یہ سزا بھگتتے رہتے ہیں کہ آیت اللہ سے ان کا ذہن اللہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، وہ آیت اللہ یا اسباب کے جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، ایسوں کو اولاً تو کوئی پشت پناہ (ولی) ہی نہیں ملتا اور بفرض پناہی کسی کی مل بھی جائے تو صحیح راہ کی طرف راہ نمائی کرنے والے (مرشد) سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں، دیکھ لیجئے کہ ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو زندگی گزار رہے ہیں، حالانکہ بڑے بڑے مفکرین، ارباب نظر و فلسفہ کی کتابیں وہ پڑھتے ہیں لیکن بجائے پانے کے صحیح راہ سے وہ دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں اور جب تک "اللہ" سے توڑ کر "آیات اللہ" کا مطالعہ کیا جائے گا یہ لعنت آدمی پر مسلط رہے گی۔

یہاں تک تو ایمان کے اجر حسن کے ایسے مظاہرے اور اللہ کی ایسی آیتیں اور نشانیاں تھیں جن سے بے ایمانی کے مجرموں کو اللہ کے پانے کی توفیق تو نہیں میسر آتی لیکن بذات خود ان نشانیوں اور آیات کو دیکھنے کا مخاطب ان کو بنایا جا سکتا ہو، کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہ بخت و اتفاق سے بھی کرنے والے چاہیں تو اپنی بدبختی سے کر سکتے ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اس قسم کی سہولتیں اتفاقاً مل گئیں۔

ناقابل قیاس انعامات | لیکن ان کے بعد ایمانی معاوضوں کے جن کرشموں کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہو ان کی حالت تو یہ ہو کہ مومن ہوئے بغیر شاید ان کے سننے پر بھی کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتا ہو۔

مقصد یہ ہو کہ کہف والے کہف میں جس وقت داخل ہوئے تو جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہو اپنے ساتھ "ورق" (چاندی) کی کوئی مقدار بھی لائے تھے، غالباً یہ چاندی سکّے کی شکل میں تھی، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ جن چیزوں کو کفنی بدگی میں ساتھ رکھنے کا امکان تھا ان کے رکھنے اور کہف میں ساتھ لے جانے سے خواہ مخواہ احتراز اور پرہیز کا طریقہ انہوں نے اختیار نہیں کیا تھا" (الغرض) عام طور پر اس قصہ کو لوگ جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد پر تو خواہ کچھ کہا جائے لیکن جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہو ان کی روشنی میں یہ دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ سو گئے، بلکہ میرا خیال ہو کہ اپنے ساتھ جو کچھ وہ لائے تھے جس میں کھانے پینے کی خشک اور تر چیزوں کو سب سے پہلے ہونا چاہئے تو جب تک انھیں اس سے مدد ملتی رہی اس وقت تک اس طویل گہری نیند کی ان کو ضرورت ہی نہ تھی جس کا ذکر بعد کو خود قرآن نے کیا ہو۔ ہاں جب لایا ہوا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس نازک پو میں یہ اہم سوال تھا کہ خورد و نوش کی چیزیں کہاں سے مہیا ہوں گی ایک صورت تو اس کی یہ تھی جیسا کہ بیدار ہونے کے بعد انہوں نے اسی پر عمل بھی کیا کہ چھپ چھپا کر شہر ہی سے کھانے پینے کا سامان منگوالیں، لیکن جن حالات میں دشمنوں کے پنجوں سے نکل کر نکل جانے میں وہ کامیاب ہوئے تھے شاید ان حالات میں شہر کی طرف رخ کرنا ان کے لئے مناسب نہ تھا۔

عجیب و غریب نیند بس ان ہی نازک ترین گھڑیوں میں اب ان کا ایمان ان کے آگے اعجاز اور معاوضہ کی ایک ایسی صورت کو پیش کرتا ہو جس کے سننے کی تاب بھی ایمان سے محروم عقل نہیں لا سکتی، قرآنی آیت

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۔ اور تم خیال کروگے کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں

میں اطلاع دی گئی ہو کہ ان پر نیند طاری ہوئی، عجیب و غریب نیند ایک طرف تو اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہو کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں اور دوسری طرف اسی نیند کا ایک پہلو یہ بھی قرآن ہی نے اسی کے بعد بیان کیا ہو کہ

نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۔ اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے، داہیں اور بائیں پہلو پر۔

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہو کہ ایسی گہری نیند ان پر طاری ہوئی تھی کہ نیند میں بھی تھوڑا بہت احساس یا اختیار کروٹ بدلنے کا آدمی میں جو باقی رہتا ہو اس احساس اور اختیار سے بھی وہ قطعی طور پر خالی ہو چکے تھے اور کروٹ بدلنے کا انتظام بھی براہ راست قدرت کی طرف سے کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گہری نیند کی مدت کتنی تھی، قرآن میں قصہ کو ختم کرتے ہوئے خبر دی گئی ہو کہ تین سو سال اور نو سال تک اس کہف میں ان کا قیام رہا، لیکن ظاہر ہو کہ یہ ان کے قیام کی مدت ہو نہ کہ نیند کی، بہرحال اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہو کہ ان پر گہری نیند طاری ہوئی" اور اسی نیند کی بدولت جب تک وہ سوتے رہے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رہے۔

حفاظت کا عجیب انتظام البتہ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سوئے تھے نیند کی حالت میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ تھا، موذی حشرات الارض، یا درندے، یا چور وغیرہ جیسی چیزوں کا اندیشہ تھا، غالباً ان ہی خطرات سے حفاظت کے لئے یہ کیا گیا کہ دیکھنے

والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں، اسی کے ساتھ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے:۔

وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ؕ　　کتا اُن کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا۔

اور یہ بھی کتے کے جاگنے کی ہیئت ہے، دیکھنے والوں کو گویا معلوم ہوتا تھا کہ کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔

من ربکے سوا ان کے ایمان کا اجر حسن ایک یہ بھی تھا جس کی قرآن نے تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ؕ　　اگر ان کی طرف تو جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے، اور بھر جائے تو رعب سے (ان کو دیکھ کر)۔

اسی ایمانی اجر کی رومی تعبیر ہے۔ ؎

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست　　ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید　　ترسد از وے جن و انس ہر کہ دید

واقعہ یہ ہے کہ بے ایمانوں کی عقل ایمانی معاوضوں کے ان تذکروں کو خواہ برداشت کرے یا نہ کرے مگر اس وقت تک کہف والوں کے ایمانی اجر کے جن قوالب و مظاہر کو قرآن نے بیان کیا ہے کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی چاہا جائے تو ایمانوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ روز بروز اب ان کی تعداد گھٹ رہی ہے تاہم اب بھی دنیا ان قدسی نفوس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوئی ہے، ڈھونڈنے والے چاہیں تو اب بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں ان کو پا سکتے ہیں۔

البتہ اس کے بعد قرآن نے:۔

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ　　اور اسی طرح اٹھایا ہم نے ان کو

کے تمہیدی الفاظ کے ساتھ اصحاب کہف کے ایمانی اجر کے جس رخ کو بے نقاب کیا ہے اور اس تمہید کے بعد جو باتیں بیان کی گئی ہیں عامی آدمی کے لئے تو شاید اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو۔

نیند کی غیر معمولی طوالت اور اصحاب کہف کا احساس مطلب یہ ہے کہ کہف میں کہف والوں کے قیام کی مدت جو دو تین صدیوں سے بھی متجاوز ہے اولاً عام حالات کے لحاظ سے بجائے خود یہی ایک غیر معمولی حادثہ ہے .... (لیکن) قصہ اسی پر ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ بیدار ہونے کے بعد اپنے سونے کی مدت ان کو ایک دن، یا دن کے کچھ حصہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صحیح طور پر قرآن سے یہ ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ ان کے سونے کی مدت کتنی تھی، تاہم قرآن میں اسی تمہیدی بیان وکذالک بعثناھم کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ:۔

لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ　　تاکہ باہم ایک دوسرے سے پوچھیں، ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنے دن تم ٹھہرے، بولے کہ ٹھہرے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

. . . .

(الف) معلوم ہوتا ہو کہ نیند کی جو واقعی مدت تھی، جاگنے کے بعد صحیح احساس اس مدت کا ان میں نہیں پایا جاتا تھا، حاصل جس کا یہی ہو کہ ایک دن یا دن کے کچھ حصے سے جس وقت کی وہ تعبیر کر رہے تھے واقع میں وہ وقت اتنا مختصر نہ تھا۔ . . . .

بہر حال زندگی کی غیر معمولی طوالت اور پھر اس طویل مدت کو کہف کے ان نوجوانوں کا حد سے زیادہ مختصر محسوس کرنا یہ دونوں باتیں ان کے ایمان کے اجر و معاوضہ کی ایسی غیر معمولی شکلیں ہیں، جن کی عام حالات میں آدمی توقع نہیں کر سکتا اور جہاں تک میرا خیال ہے یہی بتانا یہاں مقصود بھی ہو کہ ایمان کے اجر و صلہ، یا ثمرات و نتائج کا پیمانہ محدود معلومات و مشاہدات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل کو نہ قرار دینا چاہیئے بلکہ سمجھنا چاہیے کہ عقل جن باتوں کو سوچ سکتی ہو ایمان ان آسانیوں کو بھی مومن کے سامنے لاتا ہے، اور عام حالات میں جن امور کا تصور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے، جس رب پر آدمی کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہو وہی رب جب چاہتا ہے تو ان کو بھی پیدا کر کے مومن کی دستگیری فرما سکتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ . . . . عقل جن باتوں کو سوچ نہیں سکتی، اصحاب کہف کا ایمان ان کو بھی کھینچ کر ان کے سامنے لایا، ان کی زندگی دراز ہو گئی، اور کتنی دراز؟ پھر اس وقت کی درازی سے آدمی کو جو ذہنی تکلیف ہوتی ہو اس تکلیف سے بھی ان کو ان کے ایمان نے بچا لیا، اور باوجود دراز ہونے کے وہی طویل وقت ان کو محسوس ہوا کہ حد سے زیادہ مختصر تھا۔

آب و خور سے بے نیازی | اور اسی کے ساتھ اس کا بھی ان کو تجربہ کرایا گیا کہ اتنے طویل زمانے کو بغیر آب و خور کے انہوں نے گزار دیا۔ خدا ہی جانتا ہو کہ وہ کتنے دنوں تک سوتے رہے مگر جس وقت بیدار ہوئے تو جیسے رات کو سونے والے صبح بیدار ہو کر کچھ کھانے پینے کی ضرورت یا خواہش عام طور پر محسوس کرتے ہیں، انہوں نے بھی محسوس کی، قرآن میں اسی کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ

قالوا ربكم اعلم بما لبثتم فابعثوا احدكم بورقكم هذه الى المدينة فلينظر ايها ازكى طعاما فليأتكم برزق منه ؛ (الکہف)

(وقت کے متعلق باہم) بولے تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہو کہ تم کتنی دیر ٹھہرے، پھر (انہوں نے کہا) کہ بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کو لیکر، چاہیئے کہ وہ دیکھے صاف ستھرے کھانے کو، اور لائے تمہارے لئے روزی۔

ان سے یہی معلوم ہوتا ہو کہ بھوک کا تقاضا بھی چنداں سخت نہ تھا، ورنہ ازکی طعاما (صاف ستھرے لذیذ کھانے) کی تلاش کا حکم وہ نہ دیتے، اور یہ بھی ان کے ایمان کے کرشموں میں سے ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا۔

کذلک کے لفظ سے ان کے ان ایمانی نتائج کو قرآن نے جو الگ کر دیا ہو، غالباً ان کی اہمیت ہی کی طرف اس میں اشارہ

کیا گیا ہو یعنی ایمانی اجر ہونے میں تو سب ساوی ہیں، لیکن غیر معمولی ہونے کی وجہ سے ان کی نوعیت گزشتہ آثار سے جو کچھ مختلف تھی، اس لئے ان کو پہلی فہرست سے قرآن نے جدا کر دیا۔

اسی کے ساتھ ذیلی طور پر ایک سبق تو اس سے یہ ملتا ہو جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی لکھا ہو:۔

وهذه الآية تدل على ان السعي في امساك الزاد امر مشروع وانه لا يبطل التوكل ؂

یہ آیت بتاتی ہو کہ زاد راہ کا ساتھ رکھنا شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہو اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی

نیز ازکی طعاما کی تفسیر اگر یہ کی جائے، امام ہی نے دوسرے اقوالؒ کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی بایں الفاظ کیا ہو:۔

ایما اطیب والذ (ص ۶۹۹ ج)

یعنی غرض ان کی یہ تھی کہ کھانوں میں جو سب سے بہتر اور لذیذ کھانا ہو اس کو حاصل کریں۔

تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ "طیبات من الرزق" یا ایسی غذا جو آدمی کے ذائقہ کے مناسب اور لذت بخش ہو، خواہ مخواہ اس سے نفرت یا چڑ پیدا کرنے کی مشق دینی راہ کے سلوک میں قطعاً غیر ضروری ہو۔

دشمنوں کی محبت و گرویدگی | اسی کے بعد آگے قرآن کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ۝ انهم ان يظهروا عليكم يرجموكم او يعيدوكم في ملتهم ولن تفلحوا اذاً ابداً ؂

اور چاہیے کہ کھانا لانے والا شہر جو جائے وہ نرمی سے کام لے اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے، کیونکہ اگر وہ تم سے واقف ہو جائیں گے تو سنگسار کر دیں گے تمہیں، یا اپنی پلٹا لیں گے اپنے کیش و ملت کی طرف جس کے بعد تم کبھی نہ پاؤ گے

اور یہ وہی بات ہو جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں یعنی اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کہفی زندگی بسر کرنے کے لئے نوجوانوں کی یہ ٹولی شہر سے جس حال میں نکلی تھی، قرآن نے ان ہی کی زبانی اس حال کے متعلق ان کے اعترافی الفاظ کو یہاں نقل کیا ہو، جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اپنی قوم سے ان کی مخالفانہ کشمکش شدت کی اس آخری حد تک پہونچ چکی تھی کہ یا اپنی جان سے ہاتھ دھلیں، یا محض دین کے لئے وہ سب کچھ برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے (العیاذ باللہ) اسی سے دست بردار ہو جائیں اور اس کا خطرہ کہف میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں باقی رہا۔

لیکن دیکھئے خالص ایمان کے تحت جو جی رہے تھے ان کو تجربہ کرایا جا رہا ہو کہ ان ہی کا ایک حال تو یہ تھا کہ ان کی قوم ان کے خون کی پیاسی اور ان کے دین کی دشمن بنی ہوئی تھی کہ اچانک ایک نیا انقلاب شروع ہوتا ہو، وہی شہر جس کے باشندے

کی تفسیر میں یہ کہنا کہ غیر ذبیحہ یا بتوں پر چڑھائی ہوئی چیزوں سے بچنے کا مشورہ دے رہے تھے، یہ شہرہ اصحاب کہف کی جماعت کے کسی لڑکے کو ظاہر دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اتنی باتیں تو ہر معمولی مومن آدمی بھی جانتا ہے۔ ۱۲

کے خوف سے کہف میں ان نوجوانوں نے پناہ لی تھی، اسی شہر کے رہنے والوں میں ایک نیا جذبہ ابھرتا ہے، آگے کی آیتوں میں اس نئی انقلابی تحریک کا قرآن نے ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنوں کی بن آیا دیکھا اور اسی شہر میں دیکھا جا رہا تھا کہ انسانی مظلومیت اور بے کسی کے حال میں ان کے شہر سے نوجوانوں کی یہ ٹولی جو نکلی تھی ان ہی کے وہ نادیدہ عاشق بنے ہوئے ہیں صرف یہی نہیں کہ اپنے شہر کے باشندوں کے ظالمانہ طرز عمل پر وہ ندامت کا اظہار کر کے پچتا رہے ہیں، بلکہ مافات کی تلافی کے لئے چاہتے ہیں کہ جن پر ظلم کیا گیا تھا اور صحیح دین کے قبول کرنے کے جرم میں ان پاس ہونے پر تعقیب جدید کیا گیا تھا ان کی کوئی دائمی یادگار قائم کریں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ٹھیک جن دنوں میں یہ انقلابی ہلچل اس شہر کے اندر برپا تھی، اچانک یہ عجیب و غریب حادثہ پیش آیا کہ جن سے ملاقات کا لوگوں کو سامان وگمان بھی نہ تھا کہف کے ان ہی نوجوانوں کے متعلق شہر والوں کو یہ خبر ملی کہ وہ تو اس وقت تک اس کہف میں جیتی جاگتی حالت میں پائے جا رہے ہیں۔ یہ صورت کیسے پیش آئی؟ قصوں میں تو عموماً یہ بیان کیا گیا ہے اور مشہور ہے کہ بازار میں جب کھانا لینے کے لئے کہف سے آدمی آیا، اور جو سکہ اس نے نانبائی کے حوالے کیا وہ دقیانوس نامی بادشاہ کے ٹھپہ کا سکہ تھا جو تین سو سال پیشتر اس شہر میں حکمرانی کرتا تھا، نانبائی نے اس نئے سکہ کو دیکھ کر پوچھ گچھ کی، لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا، آخر اس آدمی کو اقرار کرنا پڑا کہ ہمارا تعلق نوجوانوں کی اس جماعت سے ہے جو دشمنوں کے خوف سے کہف میں روپوش ہو گئے ہیں۔ اسی ذریعہ سے لوگ کہف میں ڈھونڈتے ہوئے اس مقام پر پہونچ گئے جہاں بخوہ میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے کھانے کا انتظار کر رہے تھے، ارباب حکایات و قصص اسی روایت کو کافی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کتابوں میں نقل کرتے ہیں، لیکن قرآن میں ہم ان تفصیلات کو نہیں پاتے اور سچ پوچھئے تو اس قسم کی دور از کار تفصیلات سے قرآن کا عام دستور ہے کہ عموماً تعرض نہیں کرتا، وہ تو صرف ایمانی اجر کی مختلف شکلوں کو اس موقع پر پیش کرنا چاہتا ہے چونکہ کہف والوں کے ایمانی اجر و معاوضہ کی یہ شکل بھی اپنی علیحدہ مستقل نوعیت رکھتی تھی، اس لئے "وکذلک" کے لفظ سے شروع کرتے ہوئے (یعنی یہ بتاتے ہوئے کہ جیسے گزشتہ قالبوں میں ایمانی اجر کہف والوں کے سامنے آیا، اسی طرح ایک نیا مظاہرہ ان کے ایمانی اجر کا اس شکل میں بھی ہوا) [فرمایا گیا] کہ

اعثرنا علیھم لیعلموا ان
وعد اللہ حق وان الساعۃ
لاریب فیھا اذ یتنازعون
بینھم امرھم فقالوا ابنوا
علیھم بنیانا ربھم اعلم
بھم قال الذین غلبوا علی

اچانک ان پر (یعنی کہف والوں پر) مطلع کر دیا
ہم نے تاکہ وہ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور
قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، قطعاً اس میں کوئی
شک نہیں ہے، (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ
اس وقت پیش آیا) جب دیکھو (شہر والے) باہم
جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق پس

امرھم لنتخذن علیھم مسجدا ۝ (الکہف)

(بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت، ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملہ پر قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد۔

بہرحال اصحاب کہف پر اعثار یعنی اچانک ان پر واقف ہونے کی صورت جو پیش آئی اس کی تفصیلی وجہ قرآن نے نہیں بیان کی ہے، بلکہ بجائے عداوت و دشمنی کے اسی شہر کے باشندوں میں کہف والوں کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی بلکہ نادیدہ عشق کا انقلابی سانحہ جو پیش آیا اور اسی جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر لوگ ان کی یادگار کی تعمیر کے متعلق مختلف تجویزیں جو پیش کر رہے تھے۔ قرآن نے صرف یہ خبر دی ہے کہ عین اسی زمانے میں ان سے واقف ہونے کا حادثہ اچانک رونما ہوا۔ اس سلسلہ میں اسی حد تک قرآن نے اپنے بیان کو محدود رکھا ہے، کیونکہ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایمان مومن کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے، اور یہ کہ ایمانی اجر کے ظہور کی شکلیں صرف ان ہی منطقی حدود تک محدود نہیں ہوتیں جہاں تک سوچنے والوں کی عقل عام معلومات و مشاہدات کی راہ نمائی میں پہنچتی یا پہنچ سکتی ہے، الغرض یہ جو دعویٰ قرآن میں کیا گیا ہے، یا اہل ایمان کے لئے صلائے عام دیا گیا ہے کہ:۔

وبشر المومنین الذین یعملون الصالحات ان لھم اجرا حسنا ماکثین فیہ ابدا ۝

اور بشارت دے دو، ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر و معاوضہ ہے جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔

اسی دعویٰ یا اسی صلائے عام کے عملی تجربات کی یہ شانی شکلیں ہیں جو مختلف رنگوں میں کہف کے ان مومن نوجوانوں کے سامنے مسلسل پیش آتی چلی گئی ہیں۔

حیات جاوید | اتنی دراز مدت جو کہف میں ان پر گزری، چاہئے تو یہ تھا کہ دنیا ان کو بھول جاتی، حافظوں سے لوگوں کے وہ نکل جاتے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، بجائے بھلانے کے قدرت ان کی یاد کے نقوش کو چمکاتی ہی چلی گئی، صرف دلوں اور دماغوں میں بلکہ جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آکر بیابان اور ٹاپو کی زندگی انھوں نے اختیار کی تھی اسی شہر کے رہنے والے ان کے لئے یادگار قائم کرنے کی کوششوں میں مست ہیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ جس شہر سے وہ نکلے تھے اسی کی حد تک یا اسی شہر کے باشندوں کی حد تک اصحاب کہف کے ساتھ دلچسپیوں کے یہ قصے محدود رہے بلکہ قرآن میں اسی کے بعد جو یہ خبر دی گئی ہے کہ:۔

سیقولون ثلاثۃ رابعھم کلبھم ویقولون خمسۃ سادسھم کلبھم

اور قریب ہے کہ وہ کہیں گے کہ (کہف والے) تین ہیں جو تھا ان کا کتا ہے، اور کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں، چھٹا

رجماً بالغيب ويقولون سبعة وثامنهم كلبهم — ان کا کتا۔ اٹکل پچو طریقہ پر، اور کہیں گے سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بعد بھی جب اچانک لوگ ان سے واقف ہوئے، کہف کے ان نوجوانوں کو آئندہ نسلوں میں بھی کافی اہمیت کا مقام حاصل رہا، اور کیسی اہمیت؟ کہ خود وہ ہی نہیں، بلکہ ان کے ساتھ جو کتا تھا، تاریخ انسانی کا ایک ایسا کتا بن گیا کہ کہف والوں کی تعداد اس کتے کے بغیر اور کتے کے ساتھ مختلف مکاتب خیال کی بنیاد بن گئی، امام رازی نے اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال بعد عرب میں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک بڑا اہم و خلافی مسئلہ کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ تھا۔[1]

اصحاب کہف کے قصہ کی حد تک قرآنی بیان گویا سمجھنا چاہیے کہ ختم ہو چکا ہے، اگرچہ آگے کی آیتوں کا بھی براہ راست ان کی سرگزشت سے خواہ تعلق نہ ہو لیکن کلیۃً اس قصہ سے وہ جدا بھی نہیں ہیں بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج میں ہم ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ اس کا ذکر تو آئندہ کیا جائے گا، سردست اصل قصہ کو ختم کر کے ایک ذیلی مسئلہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اس وقت تک تو حتی الامکان میں نے اپنے بیان کو قرآنی الفاظ کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے، ارباب قصص وحکایات نے کہف والوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے میں نے قصداً اس سے تعرض ہی نہیں کیا ہے یا ضرورۃً بعض چیزوں کا ذکر اگر آ گیا ہو تو اس کی حیثیت ایک ذیلی بیان کی ہے، اس وقت بھی ایک ذیلی بات ہی کا ذکر مقصود ہے۔

اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانہ کا ہے

اصحاب کہف کے لبث (یا مدت قیام) کو بتاتے ہوئے قرآن نے جو یہ طریقۂ تعبیر اختیار کیا ہے کہ تین سو سال وہ ٹھہرے اور بڑھا دیا انھوں نے ۹ سال، امام رازی کی تفسیر میں ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ [illegible] اور قمری سالوں کے تفاوت کی طرف اس پیرایۂ بیان سے اشارہ کیا گیا ہے[2] لیکن خود امام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حساب کے رو سے یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا، ایسی صورت میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر اس خاص طریقہ بیان کی مصلحت کیا ہے، اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کے الفاظ سے تو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانے میں پیش آیا، لیکن اسلامی و غیر اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے جب منادی شروع کی اور دنیا کے مختلف حصوں میں وہ

---

[1] عیسائیوں میں جو فرقہ اس زمانہ میں "یعقوبیوں" کے نام سے موسوم تھا، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے قول کا قائل اور معتقد تھا، کہتا تھا کہ تین تو اصحاب کہف تھے چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور "نسطوریوں" کے نام سے جو فرقہ ملقب تھا وہ پانچ تو تعداد کہف والوں کی بتاتا تھا اور کتے کو چھٹا قرار دیتا تھا (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۷۰۱) [2] جلد ۵ صفحہ ۷۰۲

پھیل گئے، تو ایشیاء کوچک کے اس مرکزی شہر افسیس میں بھی بعض لوگ پہونچے، اور حضرت عیسیٰؑ کے پیغام کی وہاں کے باشندوں میں تبلیغ شروع کی، عرض کر چکا ہوں کہ افسیس کے باشندے بت پرست تھے، ان ہی بت پرستوں میں سے چند نوجوان بھی پیغام سے متاثر ہوئے، قوم سے جھگڑا شروع ہوا اسی کش مکش سے تنگ آکر کہف میں پناہ لینے کے لئے وہ داخل ہو گئے اب یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، قدیم و جدید ہر قسم کے مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ مشہور محدث جلیل علامہ ابن حزم اندلسی نے (جن کی وفات ۴۵۶ھ میں ہوئی ہے) اپنی کتاب "ملل و نحل" میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ دین عیسوی کے ماننے والوں پر رومی بت پرستوں نے شروع شروع میں مظالم کے پہاڑ توڑے، لکھا ہے کہ :-

فبقوا على هذه الحالة لا يظهرون البتة ولا لهم مكان يأمنون فيه ثلاث مائة سنة بعد رفع المسيح عليه السلام۔

(ص۲ ج ۲)

(مظلومیت کے اسی حال میں عیسائی مبتلا رہے) دنیا کے سامنے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے، نہ ان بیچاروں کو ایسی جگہ ملی جس میں امن کے ساتھ زندگی بسر کریں (اور یہ صورت حال) عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے تین سو سال بعد تک باقی رہی۔

آگے ابن حزم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تین سو سال گزرنے کے بعد کس طرح قسطنطین شاہ قسطنطنیہ نے عیسائی دین قبول کر لیا، اور اسی کے بعد عیسائیوں کو آزادی کے ساتھ رہنے سہنے چلنے پھرنے اور علانیہ تبلیغ کرنے کا موقع ملا بلکہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ جبر و زبردستی سے کام لے کر بھی لوگوں کو عیسائی بنانے لگے۔

اب ایک طرف تاریخ کے اس بیان کو رکھئے اور اس کو قرآن کی اس خبر سے ملائیے کہ کہف والوں کے قیام کی مدت کہف میں وہی تین سو سال مزید نو سال کے اضافہ کے ساتھ تھی، اگر اس سے یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ مظلومیت اور روپوشی کی جو مدت عام عیسائیوں پر گزری اسی زمانے میں کہف والے بھی کہف میں پناہ گزیں رہے، اور ان کے شہر کے باشندوں میں جو مذہبی انقلاب رونما ہوا، تا اینکہ اپنے شہر سے بھاگنے والے ان نوجوانوں کے ساتھ نادیدہ عشق و محبت عظمت و احترام کا تعلق پیدا ہوا، یہ سارے قصے اسی تین سو سال کے اندر پیش آئے، اس کے بعد اچانک لوگ ان سے جب واقف ہوئے تو ۹ سال کا زمانہ اس واقفیت کے بعد گزرا اور دونوں زمانوں کے اسی اختلاف کی طرف قرآن نے اپنے پیرایۂ بیان میں اشارہ کیا ہے، جہاں تک میرا خیال ہے دوسری توجیہوں سے یہ توجیہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مجھ میں یہ آتا ہے کہ کہف والوں کو ایمان اور ایمانی اجر کا تجربہ کرانا مقصود تھا اسی لئے اتنی طویل زندگی ان کو عطا کی گئی اور جہاں سے بیحد بیکسی و بے نوائی میں نکلے تھے اسی مقام کے باشندوں کی عجیب و غریب گرویدگیوں اور اپنے ساتھ غیر معمولی دلچسپیوں کا تماشا ان کو کرایا گیا، شاید اس کے بعد ۹ سال جینے کا موقع ان کو اور ملا، اور پھر کل نفس ذائقة الموت کے کلی قانون کے تحت ان کی وفات[1] ہو گئی واللہ اعلم۔

حاشیہ متعلق صفحہ ۱۷۵

ے مرزائی جماعت کے لاہوری اور قادیانی دونوں گروہوں کی تفسیروں میں اصحاب کہف کی شخصی و انفرادی زندگی کی جگہ تین سو نو سال کی اس مدت کو عیسائیوں کی قوم کی طرف منسوب کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ یہ مدت اشخاص و افراد کی نہیں بلکہ عیسائی امت یا قوم کی زندگی کا کوئی دور تھا جو قسطنطین کے عیسائی ہونے سے پہلے ان پر گزرا۔ مرزا بشیر صاحب نے عیسوی سن کے موجودہ کلنڈر کی غلطیوں کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ (۹) سال کا تذکرہ قرآن نے خاص طریقہ سے جو کیا ہو اس میں اشارہ کلنڈر کی ان ہی غلطیوں کی طرف ہو جو بالکل ایک انمل بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہو اور اس میں بھی زیادہ تعجب ان کی اس تحریفی جرأت پر ہو؟ قرآن کے واضح الفاظ سے معلوم ہوتا ہو کہ کہف میں نوجوانوں کی جوڑی پناہ لینے کے لئے داخل ہوئی تھی وہیں نیند سے اٹھی اچانک لوگ ان ہی سے واقف ہوئے ان ہی کی یادگار قائم کرنے پر لوگ اصرار کر رہے تھے ان ہی کے متعلق آئندہ عددی مکاتب خیال قائم ہوئے اور یہی تین سو نو سال اس کہف میں قیام پذیر رہے۔ مگر معلوم نہیں قرآن کے کس لفظ سے ان انفرادی شخصیتوں کو قادیانی ذہنیت نے قوم اور امت کا رنگ دے دیا۔ شاید اپنی اس تحریفی حرکت سے ان کی غرض یہ ہو کہ شخصی زندگی کی اتنی غیر معمولی طوالت کو جو کہ عام عقلیت برداشت نہیں کر سکتی اس لئے غلط عقلیت کی تصحیح سے زیادہ مناسب ان کو یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی غلطی کی تصحیح کر دی جائے۔ حالانکہ ایمانی اجر کے متعلق جن غیر معمولی توقعات کو قرآن مومن کے دل میں قائم کرنا چاہتا ہو اس غرض کی تکمیل ہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ ایمانی اجر کی عام شکلوں کے ساتھ ساتھ اسی کے غیر معمولی مظاہر کا تذکرہ نہ کیا جاتا۔ ان کی سرگزشت سے ایسے عناصر جن کا عام حالات میں تجربہ نہیں ہوتا اگر نکال دیے جائیں تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ کبوتر کے اسی پر کو گرا دیا گیا جس میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا گویا جس مقصد کے پیش نظر ان کے قصے کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہو اس کی روح ہی اس تحریفی طریقہ کار سے نکل جاتی ہو یہی تو بتانا مقصود ہو کہ ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی ایمان بہر حال ایک ذریعہ نجات کا ایسا رہ جاتا ہو کہ مومن جس سے ہر حال میں مدد حاصل کر سکتا ہو، ہاں قصہ کو اصحاب کہف کی انفرادی سرگزشت قرار دیتے ہوئے عیسائیوں کے عہد مظلومیت کی طرف بھی گو اشارہ اگر سے ٹھہرایا جائے تو باب الاشارہ کے لحاظ سے تھوڑی بہت گنجائش اس کی پیدا ہو سکتی ہو لیکن بجائے جزئی اور شخصی واقعہ کے کسی قوم کے کلی حادثے کی تعبیر قرآنی الفاظ سے نکالنی تحریفی خواب پریشاں کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ ۱۲۔

[اصحاب کہف کا قصہ ختم ہو چکا، اور یہاں تک کی آیتوں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ سمجھانا چاہتے تھے وہ خود مولانا ہی کے الفاظ میں آپکے سامنے آچکا، مگر سورت کا ابھی خاصا حصہ باقی ہے اور اس بقیہ حصہ کے متعلق بھی مولانا کا خیال ہو کہ اس کی آیتوں کا خواہ اصحاب کہف کی سرگذشت سے براہ راست تعلق نہ ہو۔

- لیکن کلیۃً اس قصہ سے وہ جدا بھی نہیں ہیں، بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج میں ہم ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں"۔

اور اسی خیال کے ماتحت مولانا نے آخری دو قسطوں میں، اس بقیہ حصہ کے مشتملات سے بحث فرمائی ہے، مگر قصہ کے بعد متصلاً جو تین چار آیتیں احکام کی شکل میں ہیں ان کی توضیح و تشریح سے فارغ ہو کر مولانا رقمطراز ہیں کہ:۔

"بہر حال واقعہ یہ ہے کہ کہفی زندگی کی ضرورت جن حالات میں پیش آتی ہے، ان حالات کی پیدائش کے اسباب، ان کے نتائج و عواقب، پھر خود کہفی زندگی کے لوازم و آثار، اسی زندگی کے فرائض و واجبات، یہ اور اسی قسم کے تمام سوالات جن کا کہفی زندگی سے تعلق ہو سکتا تھا، اگر سوچا جائے تو بعد ضرورت ان باتوں کے جوابوں کو ہم ان آیتوں میں پا سکتے ہیں جن پر اب تک بحث ہو چکی ہے، اسی لیے اب تک یہ التزام کیا گیا تھا کہ ایک ایک آیت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جائے، اسی التزام کی وجہ سے مضمون میں کافی طوالت پیدا ہو گئی ...... لیکن اب میں انھیں اس کی خوشخبری سناتا ہوں کہ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا بار ان پر نہ ڈالا جائے گا، کیونکہ مقصد پورا ہو چکا ہے"۔

مولانا کے اصل مضمون کی طوالت اور الفرقان کے اس نمبر کی محدود ضخامت کے پیش نظر یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جس طرح اب تک تقریباً پورا مضمون لفظ بلفظ لیا گیا ہے، بقیہ حصہ میں بھی یہی روش برقرار رکھی جائے، اس لیے اب ہم یہاں سے روش بدل کر اولاً ان تین چار آیتوں سے متعلق مولانا کے افادات کا تو خلاصہ پیش کرتے ہیں، جو قصۂ اصحاب کہف کے خاتمہ کے بعد متصلاً آئی ہیں اور جن کی تشریح کے بعد مضمون کا مقصد گویا چاہئے کہ پورا ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد بقیہ حصہ سے متعلق افادات میں سے صرف وہ خاص علمی نکات اور فکر افروز ذہنی انتقالات پیش کیے جائیں گے، جو مولانا مرحوم کی ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی کی یادگار کی حیثیت سے محفوظ کر دیے جانے کے قابل ہیں۔

شاالله ولی الامر والتوفیق!]

قصۂ اصحاب کہف سے فراغت کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"اصحاب کہف کی سرگذشت کو ختم کر کے آگے چند احکام ہیں، آئیے اور ان کا مطلب سمجھئے، اور دیکھئے کہ

کہف والوں کے قصہ سے ان احکام کا کیا تعلق ہے۔ - پہلا حکم اس سلسلہ کا یہ ہے کہ

اور پڑھتا رہ جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب
سے، نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور
ہرگز نہ پائے گا اس کے سوا تو یکسوئی کی کوئی جگہ؛

وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ
لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِہٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ
مُلْتَحَدًا۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ حرف عطف واؤ سے سلسلۂ کلام کی ابتدا اور اس بات کی دلیل ہو کہ یہ سلسلۂ کلام ماقبل کی آیات کے مضمون سے مربوط ہے۔ اس ربط کو اگر تلاش کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی ابتداء میں جو ایک لفظ "الرقیم" آیا تھا جس کی تفسیر "کتاب" سے کی گئی تھی اور دوسرا لفظ "فتیۃ" تھا جس کا ترجمہ "نوجوانوں کی ٹولی" سے کیا گیا تھا، اور ان دونوں سے یہ اشارہ حاصل کیا گیا تھا کہ کہفی زندگی میں فکر و نظر کے جمود اور تعطل کا جو خطرہ ہو اس سے حفاظت کی تدبیر یہ ہے کہ اس زندگی کے دور میں اولاً تو کتاب سے شغل رکھا جائے، اور دوسرے تنہائی کے بجائے یہ عرصہ چند رفیقوں کی رفاقت میں گزارا جائے، مگر سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مطالعہ میں کتابیں کس قسم کی رکھی جائیں اور رفاقت کے لیے کس قسم کے رفیقوں کا انتخاب کیا جائے؟ —— اس لیے کہ فتنہ کے جن ایام میں کہفی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہو کہ "خود رائی" کی عام وبا بھی ان دنوں میں پھوٹ پڑتی ہے اور جن لوگوں میں تھوڑا بہت سلیقہ بھی لکھنے لکھانے کا ہوتا ہو۔ وہ اپنے فتنہ انگیز افکار سے کتابوں کے ڈھیر لگانے لگتے ہیں، پس ان ایام میں اگر مطالعہ کا دائرہ ہر قسم کی کتابوں کے لیے وسیع کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ کہفی زندگی کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

اسلیے مذکورہ بالا پہلے حکم میں غالباً "الرقیم" کے اجمال و ابہام ہی کے دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کہفی زندگی میں صرف اپنے پروردگار کی نازل کی ہوئی کتاب سے شغل رکھو جو اٹل اور لازوال سچائیوں پر مشتمل ہے۔ اور یہی بنا پر فکری یکسوئی کی واحد ضامن ہے۔

علیٰ ہذا اس کے بعد والے دوسرے حکم کے الفاظ

اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو
پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام اور
مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ
رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ
وَجْھَہٗ۔

سے غالباً رفقاء کے انتخاب کے معیار کا مسئلہ حل کرنا اور یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کہفی زندگی کی رفاقت کے لیے کس قسم کے رفقاء کا انتخاب کیا جائے —— اس کی تشریح خود مولانا کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں۔

"دوسری اہم اس مسئلہ میں رفقاء کے انتخاب کا معیار ہے، یعنی رفاقت کے لیے جن رفقاء کے انتخاب کا

قرآن نے حکم دیا ہے ان کو ہم کن نشانیوں اور علامتوں سے پہچانیں، اسی کے جواب کو آپ آگے ان الفاظ میں پاسکتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ　　جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام مراد بنائے ہوئے ہیں اسی پالنے والے کے رخ کو

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے مواقع پر شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی الفاظ کا کوئی خود ساختہ خلاصہ لوگ نکال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً مذکورۂ بالا الفاظ کا مطلب یہ نکال لیا جاتا ہے کہ رفاقت کے لیے حکم دیا گیا ہو کہ دینداروں کا انتخاب کیا جائے۔ لیکن کم از کم قرآنی الفاظ کے ساتھ تو اس قسم کی لاپروائیاں بڑی محرومی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جن میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ دیندار بھی ہوتے ہیں، لیکن ہر دیندار میں ان صفات کا پایا جانا جہاں تک میرا خیال ہے یہ ضروری نہیں ہے، دینی زندگی رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانہ میں پایا گیا ہو جو آئین و قانون کی شکل میں زندگی کی دینی تنظیم ہی کو مذہب کا آخری مطالبہ سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ بہشتی زندگی بطور طبعی نتیجہ کے اس کے سامنے اسی طرح آجائے گی، جیسے تریاق کا استعمال صحت کے نتیجے تک مریض کو پہونچا دیتا ہے، ان کی نظر صرف قانون کی اہمیت تک محدود رہتی ہے، اور قانون کے مقنن سے بجز قانونی تعلق کے نہ کوئی رشتہ وہ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے مریض صرف طبیب کی بتائی ہوئی دواؤں سے اپنا تعلق رکھتا ہے اور صحت کے لیے جانتا ہے کہ براہ راست طبیب سے تعلق پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اسی کے مقابلہ میں دینداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ہوتی ہے۔ جسے نشانی اور علامت ٹھہراتے ہوئے مذکورۂ بالا الفاظ میں قرآن نے ان کو روشناس کرایا ہو۔

یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی　　پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام

یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت و نشانی ہے، علامہ شوکانی ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کنایۃ عن الاستمرار علی الدعاء فی جمیع الاوقات۔ (ج ۳ ص ۲۷۰)　　سارے اوقات میں دعا کرتے رہنا اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہو۔

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں عربی زبان کے محاورے کا اقتضا بھی یہی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ پرورش کرنے والی قوت یعنی رب کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل، بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور

اسی کو پکارتے رہنا، یہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہوتا ہے، اور فقر تام، احتیاج مطلق، فقط سوال، صرف بھیک کی اس پستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی چلی جاتی ہو اور اس کمتری سے جو برتری پیدا ہوتی ہے۔

مراد بنائے ہوئے ہیں وہ اسی رب کے رخ کو۔　　　یریدون وجھہ

کے الفاظ میں اسی کی تصویر پیش کی گئی ہو، جس کا مطلب یہی ہوا کہ .... ان کی نگاہ کسی حال میں وجہ اللہ (رب کے رخ کو) سے نہیں ہٹتی، حتیٰ کہ بہشت بھی ان کے سامنے جب آئے گی تو وہ بھی رضوان اللہ ہی کا قالب ان کو محسوس ہوگا، وہ محسوس کریں گے کہ وہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے آگے بے نقاب ہو کر آگیا ہے، الغرض ربؐ کے ساتھ فقر و احتیاج کا دوامی تعلق، اور ہر حال میں "وجہ اللہ" ہی کو مراد بنائے ہوئے رہنا، ان ہی دو علامتوں سے ان رفقاء کی قرآن میں شناخت کرائی گئی ہو، جن کی ضرورت کا اشارہ اصحاب کہف کے قصہ میں "فتیۃ" کے لفظ سے کیا گیا تھا۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ "کہفی زندگی" جس کا مشورہ فتنہ کے خاص زمانہ میں دیا گیا ہو۔ اس میں ایمانی زندگی کے بچانے میں کچھ امداد اگر مل سکتی ہو تو اسی قسم کے دیندار رفیقوں سے مل سکتی ہو جن کی زندگی کا دین ناگزیر اندرونی اقتضا بن گیا ہو، ورنہ باہر سے لادے اور عاید کیے ہوئے آئین و قانون کی شکل میں دینی زندگی کو جو نباہ رہے ہوں، فتنہ کے طوفانی دور کے ان تھپیڑوں کی چوٹ کو صحیح معنوں میں وہ مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں"

یہ حکم اسی مذکورۂ بالا فقرہ پر ختم نہیں ہو بلکہ آگے تین چار فقرے اور ہیں، پہلا فقرہ ہے۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔　　　اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے حیات دنیا کی زینت کو۔

اس فقرہ سے مولانا نے رفقاء کے تعلقات کی نوعیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن ان الفاظ سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اہل دین کو اس کی تو اجازت نہیں ہو کہ وہ زینت[1] حیات دنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور صرف اسی کی جستجو میں اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں، البتہ اپنی خاص افتادِ طبع اور شخصی ذوق و رجحانات کے زیر اثر اگر دینی زندگی کی رفاقت میں کوئی رفیق

---

[1] زینۃ الحیوۃ الدنیا سے مولانا کے الفاظ میں وہ چیزیں مراد ہیں "جن کے استعمال پر آدمی مجبور تو نہ ہو مگر التذاذی احساسات کی تسکین وغیرہ کا سامان ان سے فراہم ہوتا ہو" جسے موجودہ معاشی اصطلاح میں (Luxury) کہتے ہیں۔

زینت کی مدد کی چیزوں کو زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس و طعام وغیرہ میں نصب العین بنائے بغیر، استعمال کرتا ہو یا استعمال کرنے کا عادی ہو تو اس کے اس طرز عمل کو دینی رفاقت کے رشتہ کے منافی نہیں قرار دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس معاملہ میں ذوق و طبائع کا اختلاف ایک حقیقت ہے اور اس کی رعایت اگر نہ کی جائے گی تو رفاقت کے رشتہ کا نبھنا مشکل ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہو مگر ان الفاظ قرآنی کا مقصد یہ سمجھنا ہمارے خیال میں محض مولانا کا انتقال ذہنی ہے۔ بظاہر اس فقرہ کا مقصد یہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ (جیسا کہ خود مولانا نے بھی آگے چل کر اس پہلو کو لیا ہے) زیادہ قرین قیاس یہی ہو کہ "عوامی معیار زندگی کی بلندی" وغیرہ جیسی معصوم اور خوشنما تعبیروں کے پردہ میں حیات دنیا کی زینت کو نصب العین بنالینے کا جو فتنہ جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے دجالی عصر میں پیدا ہو جاتا ہے، قرآن کے ان الفاظ میں اسی فتنہ سے خبردار کیا گیا ہے، اور اس کے بعد والے فقرے

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔	اور مت مان اس شخص کی بات جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنادیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا ہو اپنی "ہوا" کے اور ہے کام اس کا غیر متوازن، بے ڈھنگا۔

میں جن لوگوں کی اطاعت سے منع کیا گیا ہو، وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا نصب العین زینۃ الحیوٰۃ الدُّنْیَا، کو بنالیں۔ اس لیے کہ یہ اوصاف جو مذکورہ بالا فقرہ میں بیان ہوئے ہیں انھیں لوگوں کے خصوصی اوصاف ہیں جن کا نصب العین حیات دنیا کی زینت بن جائے۔ —— اس اجمال کی تفصیل مولانا کے الفاظ میں پڑھیے۔ فرماتے ہیں:۔

"عوامی زندگی کی بلندی و برتری کا صور انسانی آبادیوں میں آج جو پھونک رہے ہیں اور اسی کا شور دنیا میں مچائے ہوئے ہیں اُن کی پیشانی کی یہ قرآنی لکیریں کیا ایسی لکیریں ہیں جن کے لیے کچھ زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہے وہ جو بھی ہوں، اور جہاں بھی کھڑے ہوں ان کے تمام خصوصیات میں شاید سب سے نمایاں یہی خصوصیتیں ہیں جنھیں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے، اور ان ہی قرآنی الفاظ سے ان کو پہچان سکتا ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حدیثوں میں جیسے المسیح الدجال کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "ک ف ر" "کفر" اس کی پیشانی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہوگی جسے پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی پڑھ لیں گے، کچھ یہی خیال ان الفاظ کا نظر آتا ہے جنھیں پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی اس قول کے قائلین کی پیشانیوں میں چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

دیکھئے یہ فقرہ تین اجزا پر مشتمل ہے۔ اور مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر پچھلا جزء پہلے جز کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے:

جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا .. من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا

یہ اس فقرے کا پہلا جزء ہے۔ ارادی طغیانیوں اور اختیار و اقتدار کی بدمستیوں کے عذاب کی یہ عام قرآنی تعبیر ہے، ان مجرموں کو پہلی سزا قدرت کی طرف سے یہی ملتی ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل و مفلوج ہوتے ہوئے تباہی کے ان حدود تک پہونچ جاتا ہے جن کے مختلف مدارج کو قرآن نے ختم و رین، غشاوہ و اضلال و اغفال کے ناموں سے موسوم کیا ہے، قرآن میں انسانی نفسیات کے جو مسائل ہیں ان میں ذہنی اور فکری سزاؤں کی ان شکلوں اور ان کے باہمی امتیازات کو خاص اہمیت حاصل ہو جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہو۔

بہرحال سزایابی کی اس نفسیاتی گرفت کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہو کہ جینے کا جو دستور بھی ذہنی عذاب کی اس حالت میں بنانے والے بنائیں گے اس کا زندگی کے بنیادی حقائق سے کوئی تعلق نہ ہو گا، جیسا کہ معلوم ہو عربی زبان میں اسی قسم کے بے بنیاد، یا در ہوا، من مانی باتوں کو "ھویٰ" کہتے ہیں۔ فقرۂ بالا کے دوسرے جز

اور پیچھے چل پڑا وہ اپنی "ہوا" کے .. واتبع ھواہ

کے الفاظ سے اسی لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے .. ..

تیسرا جز رفقرے کا

اور ہے کام اس کا "فرط" .. وکان امرہ فرطا

ہے، ہر وہ بات یا چیز جو اپنی قدرتی حدود مقدار سے ہٹ گئی ہو، بالفاظ دگر ہر بے ڈھنگے، غیر متوازن امر کو عربی میں "فرط" کہتے ہیں، اور جب بنیاد سے الگ ہو کر "ہوائی ضابطہ" کے تحت زندگی گزاری جائے، تو یقین مانئے کہ اس کا انجام فرط اور غیر متوازن ہی شکل میں سامنے آئے گا، آج دنیا افراط و تفریط کے ان ہی ہچکولوں میں جھول رہی ہے۔

"عوامی زندگی کے برتری" کی نصب العین والوں ہی کو دیکھئے، سرمایہ داری کے خبط میں فیصلہ کیا گیا، کہ ایک کی امیری کے لیے سارے غربا کو مرنا پڑے تو ان کو مر جانا چاہیے۔ اور اشتراکیت کا بھوت جب سے سوار ہوا ہو تو اب دعوٰی جا رہا ہو کہ ایک غریب کے لیے سارے امیروں کو غریب بنا دیا جائے گا اور عدم توازن یا فرطیت کی یہ کیفیت زندگی کے کسی ایک شعبہ ہی کے ساتھ مختص نہیں ہو، بلکہ جس راہ میں بھی ان کا جو قدم "ہوائی دستور" کے زیر اثر اٹھا ہو وہ قرآن کی بیان کی ہوئی صفت "فرط" کی خصوصیتوں ہی کے ساتھ اٹھا ہے۔"

بہرحال جو لوگ حیات دنیا کی زینت کو مقصود بنا کر زندگی گزاریں، ان کے متعلق ایک تو یہ منفی حکم (اطاعت نہ کرنے کا) دیا گیا ہو جس کا حاصل مولانا کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"انھیں کو دیکھ دیکھ کر قدم اٹھانا اور زندگی کے ہر پہلو میں ان ہی کے عملی نمونوں اور علمی مشوروں کی طرف تاکتے جھانکتے رہنا، اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے"۔

اور اس کے مطابق مومن کا فرض ہو کہ ان لوگوں کی جو علامات بیان کی گئی ہیں وہ جن لوگوں میں بھی پائی جاتی ہوں خواہ ان کی پیروی کی طرف بلانے والے "شائستہ و متمدن اقوام" جیسے کتنے ہی خوشنما عنوانوں سے انھیں روشناس کرائیں، ان کی نافرمانی کے "ربانی فرمان پر عزم و ارادہ کی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جائے"۔

اور مومن کا فرض "پرہیز و گریز" کے منفی عمل ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ آگے ایک مثبت حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ		کہہ! جو حق ہو تمھارے پالنے والے کی طرف سے

"جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حالات کیسے ہی گئے گزرے ہوں، اور جو کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن بہرحال الحق اور زندگی کی جو حقیقی سچائیاں ہیں، ان کا اعلان بھی کیے چلا ہی جانا چاہیے، تقریر سے ہو یا تحریر سے، یا قول کا جو بھی ذریعہ ہو، مومن مکلف ہے کہ وہ ان سچائیوں اور صداقتوں کو دوہراتا رہے"۔

پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کر دے۔		فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

یہ تھیں قصہ اصحاب کہف کے بعد کی وہ آیتیں جن کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ "مقصد پورا ہو چکا ہے"۔ لہذا اب ہم طوالت سے بچنے کے لیے بقیہ مضمون میں سے مولانا کے صرف اہم اور خصوصی افادات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

بقیہ مضمون کے اہم افادات

(۱)

گزشتہ آیات کے بعد صرف دو تین ہی آیتوں کو چھوڑ کر اس سورت میں " وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ " کے الفاظ سے دو آدمیوں کا ایک تمثیلی قصہ شروع ہوا ہے، جن میں سے ایک کے پاس دو سرسبز و شاداب باغ تھے، جن کے بیچ میں ایک نہر بھی جاری تھی، جو ان کی سرسبزی و بار آوری کی بڑی ضمانت تھی۔ ان باغات کے علاوہ بھی کافی مال و دولت اور جاہ و عزت اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش رکھی تھی۔ دوسرے کا حال اس سے مختلف تھا، غربت تھی یا نسبتاً قلت، بہرحال اول الذکر جو اپنے تمول اور خوش حالی کے متعلق اس خبط میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ سب بجائے اس کے خالق و مالک کے فضل و کرم کے، اس کی اپنی دماغی اور جسمانی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور جب تک اس کے جسم و دماغ کی قوت باقی ہے یہ سب یوں ہی رہے گا، اس نے ایک موقع پر اپنے باغ پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی ذہانت و قوت کے پندار میں ڈوب کر ثانی الذکر کے سامنے ان خیالات کا اظہار کیا، دوسرا شخص جسے ایمان و عرفان کی دولت نصیب تھی اس نے اسے اس پندار بے جا پر ٹوکا اور کہا کہ یہ سب اللہ کا فضل سمجھنا چاہیے۔ اصل قدرت اسی کی قدرت ہے، وہ اگر چاہے تو تمہاری ساری حکمت و جدوجہد کے باوجود ان ہرے بھرے باغات کو چٹیل میدان میں تبدیل کر دے اور تم دیکھتے رہ جاؤ۔

آگے فرمایا گیا ہو کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور پھر بیچارہ نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا — اے کاش! نہ شریک کرتا میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرک کی گمراہی میں مبتلا تھا، اور اپنی تباہ حالی کو وہ اپنے اس جرم کی سزا سمجھ رہا تھا، مگر قصہ میں جو باتیں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں اُن میں کوئی بات بھی بظاہر مشرکانہ قسم کی نہیں ہے پھر اس شرک کی آخر کیا حقیقت تھی جس پر وہ اس بری طرح پچھتا رہا تھا؟ یہ ایک سوال ہے جس پر بقول مولانا مرحوم "مفسرین بھی حیران ہیں"۔

مولانا اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس شخص کا شرک غیر خدائی قوتوں کی پوجا پاٹ والا شرک نہیں تھا۔ بلکہ اس کا شرک یہ تھا، جو قصہ میں پوری طرح مذکور ہے، کہ اُس نے کارخانۂ کائنات کے اندر بجائے خالق کائنات کے اسباب اور انسانی تدابیر کو کار فرما ٹھہرا لیا تھا، چنانچہ وہ اپنے باغات کی سرسبزی و شادابی اور اپنی دولتمندی کو محض

اپنی اسبابی تدابیر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا اور ان کے بھروسے پر یہاں تک کہنے کی جرأت کر رہا تھا کہ۔

مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هٰذِهِ أَبَدًا — میں نہیں سمجھتا کہ میری محنت و تدبیر کا یہ پھل کبھی برباد ہوگا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کے خیال میں کاروبارِ دنیا میں مشیتِ الٰہی کو کوئی دخل ہی نہیں تھا، جو حقیقت میں شرک کی بدترین قسم ہے، کیونکہ پوجا پاٹ والے شرک میں صرف عبادت و دعا میں غیر خدائی قوتوں کو شریک کیا جاتا ہے، باقی اس عالم کے نظام کو اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کے تابع سمجھا جاتا ہے۔

اس عقدہ کو حل کرنے کے بعد مولانا نے اس ذیل میں ایک اور بصیرت افروز بات فرمائی ہے —— فرماتے ہیں کہ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کا دجالی فتنہ سے جو خاص تعلق بتایا ہے وہ اس موقع پر کتنا صاف نظر آ رہا ہے، ادھر جب سے دجالی فتنہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ پرانے قسم کے پوجا پاٹ والے شرک کا رواج تو گھٹ رہا ہے مگر یہ ماڈرن قسم کی مشرکانہ ذہنیت برابر لوگوں پر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ جس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اسی سورت میں کیا گیا ہے، اور پھر تمثیلی انداز میں اس کا انجام دکھا کر کم از کم اہلِ ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہو کہ

"دنیا ہو یا آخرت، کسی میں [بھی] بہترین نتائج اور بہترین انجام کی ضمانت صرف اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ عالم کی ولایت اور کارفرمائی صرف حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے ساتھ محدود و مختص ہے۔ ..... یہی مفاد و مطلب ہو قصہ کے آخری فقرہ کا هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا"

---

(۲)

اس سورت کے مشتملات میں حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا مشہور قصہ بھی ہے۔ یہ قصہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) حضرت خضر علیہ السلام کا غریب ملاحوں کی کشتی کو ایک ظالم حکمراں کی دستبرد سے بچانے کے لیے اس میں شگاف ڈالنا۔

(۲) ایک بے گناہ لڑکے کو اس اندیشہ سے قتل کرنا کہ یہ اپنے کفر و سرکشی کے حال سے اپنے والدین کو مغلوب نہ کرلے۔

(۳) ایک نیک آدمی کے یتیم بچوں کے موروثی خزانے کی حفاظت کے خیال سے ایک شکستہ دیوار کی بلا معاوضہ مرمت کر دینا جس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔

مولانا نے قصہ کے ان تینوں اجزاء کو علمی درس کے تین نمونے قرار دے کر قریبی دور کی ایک مثال کے ذریعہ دکھلایا ہے کہ دجالی فتنہ کے عہد میں ان نمونوں کے مطابق عمل کر کے فتنہ کے بعض پہلوؤں کی پیدا کردہ مشکلات کا حل

کس طرح کیا جا سکتا ہے۔۔

یہ مثالی واقعات سے مولانا کی نکتہ آفرینی کی خوب ہی مثال ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جب یورپ و امریکا سے موجودہ دجالی فتنہ کا سیلاب مشرق کی طرف اُمنڈا، اور اس کے رُوح کُش، ایمان رُبا تھپیڑوں کی زد میں شاید سب سے پہلے ہمارا ملک ہندوستان ہی آیا۔ اور مسلمانوں کی حکومت اس ملک میں تہہ و بالا ہو گئی۔ چاہنے والوں نے پہلے تو یہی چاہا کہ ظلم ہی کا ازالہ کیا جائے، لیکن تجربے نے بتایا کہ ظالم کے ہٹنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، تب کہیں زندگی کے مذکورۂ بالا مشاغل کے لیے دینی مدارس کا نظام ملک کے مختلف گوشوں میں قائم کیا گیا، اور ایسے زمانہ میں قائم کیا گیا، جب اسی ہندوستان میں یورپ کے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے ملک کے طول و عرض میں، اسکولوں اور کالجوں کا جال مختلف یونیورسٹیوں کے تحت بچھایا جا رہا تھا، ان جدید جامعات اور کلیات مدارس کے طویل و عریض وفاقوں کے مقابلے میں غریب عربی مدارس کی جو حیثیت تھی وہ تو خیر تھی ہی، ماسوا اس کے عربی کی ان تعلیم گاہوں کے قیام میں نہ اخباروں میں پروپگنڈے سے کام لیا گیا، نہ پریس کی دنیا میں ہلچل پیدا کی گئی، دیواروں اور نمایاں مقامات پر نہ لمبے چوڑے پوسٹر آویزاں اور چسپاں کیے گئے۔ نہ شہروں اور قصبوں میں کانفرنسوں اور سالانہ اجتماعات کے سالانہ تماشوں کا نظم کیا گیا، نہ ان کے لیے اپنا کوئی خاص لٹریچر تیار کیا گیا، بلکہ انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے والے اور پڑھانے والے سمٹ گئے تھے، تعلیمی نصاب نہ صرف نقائص و عیوب سے معمور تھا، نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم و فنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں، اور نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن علوم کی وحی کی گئی تھی) ان کے ساتھ عہد قدیم کے بعض قدیم فرسودہ فنون کی کتابیں اور وہ بھی انتہائی بے دلی کے ساتھ ان عربی مدرسوں میں پڑھائی جا رہی تھیں، الغرض ظاہر ہو یا باطن اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مدارس میں ژولیدہ اور ژنگاف ہی ژنگاف اور خرق ہی خرق دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آ رہے تھے، اسی کا نتیجہ یہ تھا اور شاید اب تک ہو کہ یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک و اقالیم تک ہی نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہو کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے یا کم از کم ان کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہی رہا۔ میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں اپنے دینی مدارس کی ان شکستہ حالیوں اور پڑھنے پڑھانے والوں کی شکستہ بالیوں ان کی کس مپرسیوں، ناقدریوں کو دیکھ دیکھ کر خود میرا جی بھی ہمیشہ کڑھتا رہا، اور جو عیوب و نقائص ان میں ہیں ان کو میں اب بھی عیوب و نقائص ہی سمجھتا ہوں، لیکن جیسے کھلے دماغ کے ساتھ ان کوتاہیوں کا

مجھے اعتراف ہے، اسی کے ساتھ اس واقعہ اور مشاہدہ کا بھی کیسے انکار کروں کہ ہمارے ان مدارس کے جن شگافوں اور کوتاہیوں کو دیکھ دیکھ کر بہی خواہوں کی طرف سے نوحہ خوانیوں اور ماتم سرائیوں کا سلسلہ اس قسم کے الفاظ اور تعبیروں میں جاری تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں سے پڑھ پڑھ کر نکلنے والے ؎

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل۔ نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل (حالی)

اسی لیے بعض فیصلہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ تک کر دیا تھا کہ:۔ ؎

ان سے تواب تلافی مافات ہو چکی
بس لوٹ دو بساط کہ یاں مات ہو چکی (ڈپٹی نذیر احمد)

جہاں تک میرا خیال ہے، بجائے معاندانہ تعریضوں، رقیبانہ طنز اور طعنوں کے اس قسم کی تنقیدوں کی نوعیت بھی اگر وہی قرار دی جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اعتراض کی تھی جب کشتی کے شگاف اور خرق کو دیکھ کر انھوں نے خضر علیہ السلام کو مخاطب بنا کر فرمایا تھا، کہ:۔

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا۔ کیا تم نے کشتی میں شگاف اس لیے پیدا کر دیا کہ کشتی والوں کو ڈبو دو، تم نے بڑا نامناسب کام کیا۔

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورۂ بالا عیوب و نقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق اگر بنا دیا جاتا اور جن صلاحیتوں کے فقدان کا مرثیہ ان کے متعلق پڑھا جارہا تھا اگر ان میں ان صلاحیتوں کے پیدا کرنے کا سامان بھی کر دیا جاتا۔ تو دینی فتنے کے پھیلے تاریک تاردنوں میں بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں ان لوگوں کو جو میسر آتی رہی ہیں، جو ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہونچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں، کیا ہم نجات کی ان کشتیوں کو پا سکتے تھے، یہ ان ہی کس مپرس دینی مدارس کا طفیل ہے کہ اسلامی گھرانوں کے چند ایسے افراد کی دینی تربیت و پرداخت کا موقع مل گیا، جو سرفرازی اور سربلندی کے عصری سامانوں سے اگر لیس ہوتے، تو بجائے پرانے قصبات کی اجڑی ہوئی مسجدوں سونی خانقاہوں کے یقین مانئے کہ لندن کے انڈیا آفس اور پارلیمان میں وہ نظر آتے، یا کم از کم ہندستان کی اسمبلیوں، کونسلوں ہائی کورٹوں کی زیب و زینت بن کر وہ ختم ہو جاتے۔

بلکہ تجربہ یہ بتا رہا ہو کہ دین کے جن مدارس میں وقت کے تقاضوں کی رعایت کی گئی، حکومت کی نگاہوں میں وہ چڑھ گئے، پھر ان کے ختم ہی کر دینے کا ارادہ کیا گیا، یا ان کو بھی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیا گیا، جل تو وہ رہے ہیں اب بھی دینی مدارس ہی کے نام سے۔ لیکن جاننے والے

ہی جانتے ہیں کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے کام کس کے آرہے ہیں۔ یہ سامنے کے واقعات اور مشاہدات ہیں۔ ہر دیکھنے والی آنکھ ان نتائج کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ کہنی لنگ کے دینی مدارس کے خضر صفت بانیوں نے خرق و شگاف کے ان عیوب و نقائص کو ان میں کن مصلحتوں کے تحت باقی رکھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان باپوں اور مسلمان ماؤں کے بچوں کو ان کی گودوں سے چھین چھین کر عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں داخل کر کرکے طغیان و سرکشی، الحاد و ارتداد کے کافرانہ جراثیم ان کے دل و دماغ میں ایک طرف جہاں پرورش کرنے والے پرورش کر رہے تھے، تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں ہمارے یہی کہنی مدارس تھے جنھوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے ایک طبقے کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی کم ہو، اعتقادی و اخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی، میں کلی طہارت و تزکیہ و پاکیزگی کا مدعی نہیں ہوں، لیکن بایں ہمہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کہنی سلسلہ کی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں میں ایسے افراد عموماً پیدا ہوتے رہے ہیں جو قرآنی الفاظ "خَیْرًا مِّنْهُ زَکٰوةً" (بہتر ہو، اس سے (اعتقادی اخلاقی) پاکیزگی میں) کے مصداق بن سکتے ہیں، یعنی اعتقادی و اخلاقی پاکیزگی جیسی چاہیے اس کے وہ مالک ہوں یا نہ ہوں، لیکن فتنہ زدہ، دجالی یونیورسٹیوں کے طیلسانیوں کی اکثریت کے مقابلے میں نسبتاً اضافی پاکیزگی کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور گو معاشی نقطۂ نظر سے جدید تعلیم گاہوں کے پڑھنے والوں کی حالت بظاہر بہتر ہی کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن دین کے متعلق ان کی کافی تعداد نے اپنے طرز عمل سے خود یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اسلام کے لیے ان کا عدم ان کے وجود سے بہتر تھا جس قسم کے شکوک و شبہات کی چنگاریاں عام مسلمانوں میں ان کی طرف سے اڑائی گئیں، اسلامی عقائد و اعمال کی تحقیر و توہین کے سلسلہ میں جن ناگفتنیوں اور ناکردنیوں کے وہ مرتکب ہوئے، خود ان ہی نے ان کو اس فیصلہ کا مستحق بنا دیا کہ اسلام کے ان کپوت فرزندوں کی نیستی ان کی ہستی سے یقیناً بہتر تھی۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اجر و مزد کے خیال سے بالاتر ہو کر تعمیر دیوار کا جو عملی نمونہ اس آبادی میں پیش کیا تھا جس کے باشندوں نے ان کی تحقیر و توہین کو آخری حدود تک پہنچا دیا تھا، آپ

لہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاتے رہتے تھے، مسلمانوں کو چونکاتے کہ ؎

الحذر از دستبرد روزگار   گیر فرزندان خود را در کنار

چاہیں تو ان ہی گمنام مدارس میں جو دجالی فتنے کے استیلاء و تسلط کے بعد اس ملک میں قائم ہوئے ان میں اس نمونے اور اس کے سارے پہلوؤں کا کسی نہ کسی شکل میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہو کہ مسلمانوں ہی کے اسلاف نے معارف و علوم کا جو متروکہ سرمایہ دنیا میں چھوڑا تھا اور حکومت کی دیوار جس وقت اس ملک میں منہدم ہو رہی تھی اس وقت مسلمانوں کا یہ موروثی ترکہ بدترین خطرات سے دوچار ہو گیا تھا، آنے والی نسلیں جدید جامعات اور یونیورسٹیوں میں بھیڑیا دھسان شکل میں دھنستی چلی جا رہی تھیں، مسلمانان در گور، و مسلمانی در کتاب کا دردناک نظارہ بے نقاب ہو کر دھمکیاں دے رہا تھا کہ کچھ دن اور ابھی غفلت سے اگر کام لیا گیا تو کتابوں والی مسلمانی بھی کیڑوں کے پیٹوں میں دفن ہو جائے گی۔

لیکن چند خضر وش، خضر خصال بزرگوں نے کمر ہمت چست کی، اور یہ تو نہ کر سکے کہ جیسے تیرہ سو سال سے جو کتابیں حکومت کے آئین و دستور کی حیثیت سے استعمال ہو رہی تھیں، ان کی اس حیثیت کو باقی رکھیں، لیکن مسلمانوں کے صالح اسلاف کے اس موروثی ترکہ کی حفاظت اور ایک نسل سے دوسری نسلوں تک اس کو مسلسل منتقل کرنے کا ایسا بندوبست بہرحال انھوں نے کر دیا کہ جب کبھی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں سے کسی نسل کو اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جانے کا موقع کبھی مل گیا اور ایمانی جوش دینی جوش پھر ان میں کبھی واپس ہوا تو اس وقت بالکل تر و تازہ حالت میں اپنے اس موروثی ترکہ کی ایک ایک چیز انشاء اللہ تعالیٰ ان کو مل جائے گی۔ جس طرح چاہیں گے ان سے وہ اس وقت مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور گو خود مسلمانوں کی طرف سے ان کی عزت و آبرو کی دھجیاں اڑائی گئیں، ان کا نام مسجد کے ملانے، خیرات کی روٹیاں توڑنے والے، قل اعوذیے، ازیں قبیل تنابزبالالقاب کی جو صورتیں بھی ممکن تھیں شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ گئی ہے جسے اختیار کرنے والوں نے اس راہ میں اختیار نہ کیا ہو۔

لیکن بایں ہمہ اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند و بالا ہو کر یہ میرا مشاہدہ ہو کہ اس خدمت کو جس کی قیمت دوسری جگہ سیکڑوں اور ہزاروں کی شکل میں مل رہی تھیں، اسی خدمت کو، بخدا اسی خدمت کو اللہ کے یہ وفادار بندے اور رسول علیہ السلام کے سچے راست باز جاں باز خدام بغیر معاوضہ یا قلیل ترین معاوضہ کے [ساتھ] بصد خندہ جبینی انجام دینے میں مشغول رہے۔[۱]

---

[۱] مثلاً حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ ہی کو میں نے دیکھا ہی، جب دیوبند میں حدیث کا درس بغیر کسی تنخواہ کے دہ برسوں سے دے رہے تھے، اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ کے ساتھ پیش ہوئی لیکن یہی نہیں کہ خاموشی کے ساتھ انھوں نے اس کو مسترد کر دیا، بلکہ زمانہ تک خود مدرسہ کے ارکین کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۳)

قصۂ موسیٰ و خضر علیہما السلام کے بعد ذوالقرنین کا قصہ آتا ہے۔ جس میں "یاجوج و ماجوج" اور دیگر اقوام پر ان کی مفسدانہ کارروائیوں کی روک کے لیے ایک دیوار بنائے جانے کا تذکرہ بھی ہو۔ اس ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ.

اور چھوڑ دیا ہم نے (ان کو اس حال میں) کہ اس عرصہ میں بعض ان میں سے موج مارتے تھے بعض کے ساتھ۔

یعنی جب دیوار قائم ہوجانے کی وجہ سے دوسری قوموں تک ان کی رسائی بند ہوگئی تو اس عرصہ میں ان کا جو حال رہا قرآن اسے "بعضہم یموج فی بعض" کے ذریعہ ادا کرتا ہو ـــــ اس تعبیر کا مدعا کیا ہے، آیا وہ غیروں سے مایوس ہوجانے کے بعد باہم دست و گریبان رہنے لگے یا باہم امداد و مواساۃ کی زندگی بسر کرتے تھے؟ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک مفہوم کے لیے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں مل سکتی تھیں۔ لہذا

"ان میں سے کسی ایک ...... کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کردینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔"

اس کے بعد اس سوال کا کہ "پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟" جواب دیتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ موج کا لفظ سمندر یا دریا کی متلاطم سطح اور اس پر ابھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو بے نقاب کر رہا ہے اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اسے کیوں نہ سمجھیں، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں یاجوج و ماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب و بیقراری، ہنگامہ اور لرزش و جنبش بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے جن میں صبح و شام، شب و روز تگ و دو، دوڑ دھوپ، آمد و رفت، چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا غالباً نقشہ تھا، اور باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

حضرت شیخ الہند کے متعلق یہ کون باور کرے گا کہ ماہوار پچھتر روپے ان کے نام سے جو درج تھے ان میں سے کل پچاس روپے لے کر پچیس روپے جو چندہ مدرسہ کو واپس فرما دیتے تھے اور اسی پچاس میں اسرت و نشاط کی قابل رشک زندگی تقریباً نصف صدی تک بسر کرتے رہے۔ کوئی چاہے تو طویل فہرست دیوبند کے ان معماروں کی تیار کرسکتا ہو جنھوں نے مسلمانوں کے صالح اسلاف کے موروثی ترکہ کو آئندہ نسلوں تک بغیر کسی معاوضہ کے یا قلیل ترین معاوضہ کے ساتھ بہو نچانے کا انتظام کیا۔ نور اللہ ضریحہم۔

ساتھ الجھی بھی رہتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان میں کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیۃً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اس لیے نہیں کرسکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا، کچھ حالات اس قوم کے ایسے تھے، کہ نہ ایک دوسرے سے کلیۃً الگ ہی ہوسکتے تھے اور نہ ان میں سے کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہوکر فنا ہونے ہی کے لیے تیار تھا، گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں۔ بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو ڈھکیلتے بھی رہتے ہیں، لیکن اسی کش مکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک کو دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان بعضھم یومئذٍ یموج فی بعض کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض و تجزی یعنی باخود یا یاجوج و ماجوج کی تقسیم بھی محدود نہ تھی، بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گننا چاہے تو گن نہیں سکتا، ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی، کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہوگیا تھا کہ ان گنت، بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ غیروں میں تو فساد اور بگاڑ پیدا کرنا یہی یاجوج و ماجوج والوں کا شیوہ تھا اور خود باہم ایک دوسرے کے ساتھ موجی تعلقات رکھتے تھے۔"

اس کے بعد ان الفاظ میں کے پہلے لفظ "ترکنا" پر غور فرماتے ہیں اور یاجوج و ماجوج کے متعلق روایات کے ذخیرہ میں یہ جو روایت پائی جاتی ہے کہ

یاجوج وماجوج لم یکن فیھم صدّیق قطُّ ولا یکون ابدا .

یاجوج و ماجوج میں نہ کبھی کوئی "صدیق" ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

(درمنثور جلد ۴ صفحہ ۲۵۰)

اس روایت کی مدد سے یہ نکتہ لاتے ہیں کہ

زندگی کے اس دور میں جب وہ [یاجوج ماجوج] سراپا اضطراب اور ہمہ تن حرکت و گردش بن کر رہ گئے تھے قدرت نے بھی ان کو چھوڑ دیا تھا اور آسمانی راہنمائی نے ان کی دست گیری نہیں کی۔ اسی لیے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوات و رسالات اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہوگیا۔"

دیوار کی بندش کے ذریعہ غیر قوموں سے یاجوج و ماجوج کا رشتہ منقطع کیے جانے کے بعد دوبارہ ان کو غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

مولانا فرماتے ہیں۔

"سورۂ کہف میں تو نہیں، بلکہ سورۂ انبیاء کی مشہور آیت ہے، یعنی

حَتّٰى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم تا اینکہ کھول دیے گئے یاجوج و ماجوج اور وہ ہر

مِن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ حدب سے تیزی کے ساتھ چل نکلے۔

سے معلوم ہوتا ہو کہ غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہو جانے کے بعد پھر ان کو ایک موقع غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا دیا جائے گا۔"

اور متعدد دلائل و شواہد سے اس امر کو واضح فرماتے ہیں کہ یہ موقع قیامت سے کافی پہلے دیا جائے گا، بلکہ بقول مولانا کے "کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ [ان کے] ظہور کے آغاز کی کرن گویا عہد نبوت میں پھوٹ چکی تھی"۔

رہا اس ظہور اور خروج کی تکمیل کا سوال کہ کب جا کر یہ مکمل ہوگا؟ اس بارے میں خود قرآنی الفاظ "مِن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ" کی جانب توجہ دلاتے ہوئے "یوحنا عارف کے مکاشفہ" کا ذکر فرماتے ہیں جو ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں "نیا عہد نامہ" یعنی انجیل کے نام سے جو مجموعہ اہل کتاب میں موسوم ہے۔ اس کے آخر میں لگایا ہوا ملتے ہیں۔

"کتاب کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ یوحنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہیں، اور ان کو کچھ غیبی مکاشفات ہوئے ہیں، جنھیں قلمبند کر کے ساتوں کلیسا کے نام ایک ایک نسخہ روانہ کیا گیا تھا، بہر حال آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے زیادہ تر ان مکاشفوں کا تعلق ہو، منجملہ دوسرے مکاشفات کے ایک مکاشفہ کے الفاظ یہ ہیں، کہ:۔

"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا، اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہو، اور اُس پر ایک سوار ہو جو سچا اور برحق کہلاتا ہو، اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہو، اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اسکے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہو جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہو، اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہو، اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید صاف مہین کتانی کپڑے پہنے اُس کے پیچھے پیچھے ہیں اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منھ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہو اور وہ لوہے کی عصا سے ان پر حکومت کرے گا، اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں ان کو روندے گا، اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے

بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند"

(یوحنا کا مکاشفہ ۱۹: ۱۱-۱۶)

نہیں کہا جا سکتا، کہ سچا اور برحق "کن الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے، مگر "الصادق الامین" (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کون ناواقف نہیں ہے، ان سے بھی، ان بادشاہوں سے بھی، جن کے سر کے تاج ان کے نہیں، بلکہ اسی کے مقدس فرق مبارک کے تاج تھے، گھوڑوں پر چڑھے ہوئے فرشتوں کو بھی لوگوں نے بدر کے میدان میں دیکھا تھا جو الضاف کے مستحق تھے، ان کے ساتھ انصاف، اور جنھوں نے لڑنے کا ارادہ کیا ان کے ساتھ لڑائی، اور ان ہی لڑائیوں میں خون کے چھینٹوں کا دامن پر پڑنا، انھیں پہونچنے کے ساتھ ایسی حکومت قائم کرنا کہ شریروں کے حوصلے پست ہو گئے، اور جو مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے وہ گرائے گئے، روندے گئے، بادشاہوں کے اس بادشاہ اور خداوندوں کے اس خداوند کو کون نہیں پہچانتا،

صلوات اللہ علیہ وسلامہ

اسی مکاشفہ کے بعد دوسرا طویل مکاشفہ اور ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا، اور اس نے:-

"پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے پکڑ کر ہزار برس کے لیے باندھا، اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا، اور اس پر مہر کر دی تاکہ وہ ہزار برس پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے۔" (ب۲۰-۲-۳)

آگے اسی کے بعد یہ کہتے ہوئے، کہ:-

"اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لیے کھولا جائے۔"

اسی تھوڑے عرصہ کے متعلق جس میں شیطان کا کھلنا بیان کیا ہے کہ ضروری ہے، اسی مکاشفہ میں اسی کی یہ تفصیل بھی پائی جاتی ہو۔ لکھا ہے۔ کہ

"اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا۔"

چھوٹ کر کیا کرے گا، مکاشفہ میں ہے:-

"ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج وماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔"

قرآن کے رو سے تو "من کل حدب" کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ چاہیے تھا کہ یہاں ہوتے واللہ اعلم اصل مکاشفہ کی عبارت کیا تھی، جس کا مترجم نے "زمین کے چاروں طرف" کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:-

"اب بادشاہوں کے بادشاہ 'خداوندوں کے خداوند' "الصادق الامین" کو جو پہچانتے ہیں 'وہ حساب کرکے دیکھ سکتے ہیں' کہ یاجوج وماجوج والوں کی قومی زندگی کے اس تیسرے دور کی تکمیل کا زمانہ کیا ہونا چاہئیے؟"

اور پھر اس موقع پر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اس موقع پر بے ساختہ الفرڈ ہبر کا قول یاد آجاتا ہے، اُس نے اپنی کتاب "تاریخ فلسفہ" میں لکھا ہے کہ:-

"پندرھویں صدی کے وسط سے مغربی یورپ میں یکے بعد دیگرے متعدد حیرت انگیز واقعات ہوئے" (ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم ص۲۴۴)

چھٹی صدی کے وسط (۵۵۰ء) سے پندرھویں صدی کے وسط تک جوڑ لیجئے کہ اوسط مدت کیا ٹھہرتی ہے۔ کاش! تاریخ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے، یقیناً نشأت ثانیہ کے نام سے جو دور "مہذب ممالک" کا موسوم ہے اس کی ابتداء اور تدریجی ارتقاء کا مطالعہ اس نظر سے بڑا دلچسپ ہوگا۔"

اور پھر اس آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ خروج کا موقع پاکر یاجوج وماجوج کے مشاغل کیا ہوں گے؟ مولانا اسی مکاشفہ کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ:-

"وہی فتنہ وفساد، لڑائی جھگڑوں کے قصوں کو یہ چھیڑ دیں گے تاآنکہ "عزیز شہر"٭ کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔"

اور اس طرح مولانا اپنی خداداد ذکاوت اور استخراج نتائج کی غیر معمولی قوت سے یاجوجیت وماجوجیت کی (بقول خود) "ایک ٹوپی" تیار کر دیتے ہیں۔ جسے ہم دیکھ رہے ہیں کہ انھیں قوموں کے سر پر فٹ آرہی ہے جنھیں مولانا نے موجودہ عہد میں جاہلیت کا علمبردار یا "دجاجلہ" قرار دیا ہے۔

---

(۴)

سورت کے آخری حصہ میں ایک آیت آتی ہے۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا۔

کیا وہی لوگ جنھوں نے انکار کیا خیال کرتے ہیں کہ بنالیں میرے بندوں کو میرے سوا پشت پناہ۔ ہم نے تیار کر رکھی ہے جہنم ان کی مہمان نوازی کے لیے۔

٭ "عزیز شہر" کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ "عزیز" کا مادہ عزت ہے۔ "البلد الحرام" کے عربی لفظ کا ترجمہ اگر کیا جائے تو بھی "عزیز شہر" ہو سکتا ہے۔"

اس پر مولانا رقمطراز ہیں :-

"خالق عالم حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی یاد اور ذکر سے کلی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کا ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ ہو جیسے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہو، کم از کم خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہو، مطلب یہ ہو کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا کل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتلائی دعبوری دور میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ اپنے خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے۔ اور

"خدا کو کیا پڑی ، میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو"

کہتے ہوئے جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے. عموماً الحادی زندگی کے نیچے کچھ اسی قسم کی شعوری یا غیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں. الحاد اور بے دینی کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہو، لیکن اسی کے ساتھ وہی انسان جو سراسر احتیاج اور اپنے خاص حالات کے لحاظ سے صرف فقر اور کہیئے تو کہہ سکتے ہیں کہ مجسم بھیک اور صرف سوال ہی سوال کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہو، اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کر سکتا، کھانے، پینے، پہننے، حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی، غریب آدمی کی زندگی کا ایسا کھلا ہوا خاصہ ہو جس سے قطع نظر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، وہ بیمار پڑتا ہو، جس علاقے میں رہتا ہو وہاں عموماً وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں، قحط اور خشک سالی کے حملے ہوتے رہتے ہیں. جنگوں کا خلفشار مچا رہتا ہے بے آئینی اور بد امنی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے، یہ اور اسی قسم کے پیش آنے والے حوادث وواقعات کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ایک سوال ہے جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے بنی آدم کے دل و دماغ میں ہل چل مچائے ہوئے ہو۔ خالق عالم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی پشت پناہی یا ولایت میں اپنی زندگی کو ڈال دیا جائے، یہ حل تو اس سوال کا بظاہر آسان نظر آتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لیے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہو، اس کی ذمہ داریاں اس راہ میں قدرتاً عاید ہو جاتی ہیں، قرآن میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ

اذا سئلك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان	میرے بندے جب پوچھیں میرے متعلق تو کہہ دو کہ میں قریب اور پاس ہی رہتا ہوں اور پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلہم	بس چاہیے کہ وہ بھی مجھے جواب دیں، اور مجھے

یرشدون   مانیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔

اس میں کارروائی کے اسی دو طرفہ پہلو کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہو، حاصل یہی ہے کہ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ تم سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی پیش کرتے رہو "لعلہم یرشدون" تاکہ وہ سیدھی راہ پر چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے، راہ یابی کا فطری طریقہ یہی ہے، لیکن جو خود تو سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے کی لینا نہیں چاہتے، ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہو جنھوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان آلہہ یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر لیا، شعور اس کا ان کو ہو یا نہ ہو لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کاربراریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال میں انھوں نے نکال لی ہو، جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہو، مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لیکن ان درمیانی وسائط اور مخلوق معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا یہی ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی وقتی پیش کشوں سے خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو ہمارے یہی آلہہ یا دیوتا پوری کرا دیتے ہیں، لیکن ان کے معبودوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی آئینی مطالبہ ان پر عاید نہیں ہوتا، اور غرض ان کی ہوتی بھی یہی ہے کہ آئینی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے، اپنے ان معبودوں کی نذر و نیاز کے سلسلے میں بیش قرار رقوم صرف کر دینا ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہو کہ اپنے آپ پر اور اپنے نفس کی خواہشوں پر پابندیاں عائد کریں، یہ مشاہدہ کی بات ہو کہ مشرکانہ کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف سے ان پر عاید کی گئی ہو اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا بھی خرچ ہو جائے، گویا خدا کی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے تراش لی ہو کہ خدا کے سامنے انھیں آنا ہی نہ پڑے، بلکہ خود تو وہ اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہو اسلیے اللہ میاں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرا لیں گے۔

اس طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہو کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لیے وہ بھاگ جاتے ہیں، بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں، اور نہ ان کو وہ یاد ہی آتا ہو، باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے مشرکوں کے نادیدہ وخود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انھوں نے ہر ضرورت اور ہر حاجت کے لیے فنی حذاق یا ٹیکنیکل ایکسپرٹوں کا طبقہ کھڑا کر لیا ہے، جس کی تعلیم و تربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لیے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش

آنے والی ضرورت کے لیے وہ ان ہی حذاق اکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، ان ہی کی ولایت اور پشت پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہو، کسی ایسی جگہ قیام ان کے لیے دو بھر بلکہ شاید ناقابل تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیا، یا پشت پناہوں کے دستیاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا خطرہ ہو: ان ہی اکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے، اور عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہو، الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی بھی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آئے۔ اس کے لیے انہی مذکورۂ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے، قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرز عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں: مثلاً

اتخذوا من دونہ آلہۃ — انھوں نے میرے سوا معبود بنا لیے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جس کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے ان کو آپ دیکھیں گے، عموماً "آلہہ" کے نام سے قرآن کو موسوم کرتا ہے: لیکن سورۂ کہف کی مذکورۂ بالا آیت میں بجائے اس کے ہم "عبادی من دونی اولیاء" کے الفاظ پاتے ہیں یعنی یہاں بجائے آلہہ کے اولیاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور آلہہ کے متعلق قرآن میں جتلایا گیا ہو کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں لیکن ان ناموں اور اسماء کو مسمّے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بایں معنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کرتے ہیں، وہ معدوم اور کچھ نہیں ہوتیں، زیادہ تر مشرکوں کے معبودوں کی عام نوعیت یہی ہوتی ہو کہ وہ صرف مفروضہ اسماء اور نام ہی نام ہوتے ہیں۔ اور کبھی یہ ہوتا ہو کہ جن کمالات و تصرفات کو ان معبودوں کی طرف اپنے خیال میں مشرکین منسوب کرتے ہیں، ان سے قطعاً ان کو کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، گویا پتھر کا نام جیسے پانی رکھ لیا جائے، اور نام رکھ کر توقع دلائی جائے کہ پانی کا کام اس پتھر سے لیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی نام یا اسم بے مسمی ہی کی ایک شکل ہے، اور مشرکوں کے معبودوں پر قرآنی تنقید کے یہ الفاظ یعنی

ان ھی الا اسماء سمیتموھا — نہیں ہیں وہ لیکن صرف چند نام جو رکھ لیے ہیں خود

انتم و اباء کم — تم نے یا تمھارے باپ دادوں نے

ہر حال میں صادق آتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ اکسپرٹس (حذاق)، اور لیڈرس (قواد) وغیرہ ناموں سے بنا لیا ہے، ظاہر ہو کہ

اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس باب میں مختلف ہوتی ہو، یعنی حدائق و فواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات ہیں جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں، اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہو ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا جو مشرکوں کے معبودوں کا ہے، بلکہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے اسی علم کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے کا طریقہ ان فنی ماہرین کو سکھایا جاتا ہو، اور خواہ ہر حال میں ان سے متوقعہ ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں لیکن ان ضرورتوں سے مشرکوں کے خود تراشیدہ معبودوں کی طرح ان کو قطعاً بے تعلق بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہو مذکورۂ بالا آیت میں بجائے "آلھۃ من دونی" کے "ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء" (یعنی میرے بندوں کو میرے سوا یا مجھے چھوڑ کر انھوں نے اپنے اولیاء اور پشت پناہ بنا جو رکھا ہو) یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہو اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہو، جس میں بجائے خود تراشیدہ، نام نہاد آلہہ اور معبودوں کے اکسپرٹوں اور لیڈروں کو بنانے والے اپنا پشتیبان، اور اولیاء بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل و مجدہ سے بے تعلق و قطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انھوں نے نکال لی ہے۔"

---

(۵)

آخری آیت جس پر سورۂ کہف ختم ہو، یعنی

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔

کہدو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ میں بھی آدمی تم ہی جیسا ہوں، مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہو کہ تم لوگوں کا الٰہ (معبود) ایک ہو، پھر جو امیدوار ہو اپنے رب کی ملاقات کا تو اسے چاہیے کہ کرے بھلے اور سلجھے ہوئے کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو

اس پر مولانا رقمطراز ہیں ــــــ اور انھیں سطروں پر افادات عالیہ کا اختتام ہے ــــــ کہ

"جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس آیت کا ..... اس سے چنداں تعلق نظر نہیں آتا،

لیکن غور کیجیے اپنے پیدا کرنے والے کی آئینی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے، بجائے مشرکانہ کاروبار کے ایکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت اور پشت پناہی کا نظریہ جو تراشا گیا تھا اور قرآن نے اس پر جو تنقید کی تھی، بس تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدرتاً کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا؟ یا نہیں ہو سکتا کہ دون اللہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو اولیاء بنانا، اور ان ہی کی پشت پناہی ڈھونڈنی اگر جرم ہو تو اسی جرم کے مجرم وہ بھی تو ہیں جو رسولوں اور پیغمبروں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور ایلچی مانتے ہیں اور ان کی ولایت اور پشت پناہی سے امداد حاصل کرتے ہیں۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہو کہ

تمہارا ولی (پشت پناہ) اللہ اور اللہ کے رسول ہیں۔ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

یقیناً یہ ایک شبہ ہے اور چاہیئے تھا کہ جو واقعہ ہو اس کو واشگاف کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہو کہ بندوں اور ان کے خالق میں واسطہ کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہو جس کی واقعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک دیکھ رہا ہو کہ روشنی میں آفتاب کو، دودھ میں مثلاً گائے کو بھینس کو واسطہ بنایا گیا ہو۔ اس لیے بندوں اور خدا میں واسطہ نہیں، اس کا دعویٰ تو چشم دید بدیہی واقعہ کا انکار ہوگا، لیکن سوال اس واسطہ کے استعمال میں ہو۔ مشرکانہ کاروبار والوں کے طریقۂ عمل کی جو خصوصیت ہو اس کی تفصیل گزر چکی، یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ، انھوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے وہ ان ہی درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں، اور خود ان ہی درمیانی واسطوں کو کھلے ڈلے کر، ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت سماجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا۔

اور ان کے مقابلہ میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہو کہ انسانوں ہی کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی ایکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت پر بھروسہ کر لیا جاتا ہو۔ چونکہ دونوں صورتیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہو۔ اس لیے درمیانی وسائط کی ولایت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہو اور ولایت کا وہ طریقہ جس میں اپنے خالق اور اس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہو اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعے آدمی پہونچ جاتا ہو...... یہ طریقہ موجودہ ہبوطی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہو جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہونچ ہی نہیں سکتی۔ زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسان اول یعنی ہمارے پدر اول کو اسی لیے یہ وصیت کی گئی تھی [اور اس میں اسی طریقہ کی طرف اشارہ ہو] کہ

پھر آتے رہیں گے میری طرف سے تمہارے پاس راہ بتانے والے ان راہ بتانے والوں کے پیچھے پیچھے — فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ

جو چلیں گے نہ انکو ڈر ہو اور نہ وہ کبھی کڑھیں گے۔ یَحْزَنُوْن۔

بہر حال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہو، سورۂ کہف کی اس آخری آیت میں کیا گیا ہو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہو کہ صاف صاف کھلے لفظوں میں کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔۔۔۔ قدرت نے صرف اپنے اس منشار کے اظہار اور ترجمانی کے لیے میرا انتخاب فرمایا ہو جسکی جوہری روح اور مرکزی عنصر یہ ہو کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا الٰہ اور چھوٹی بڑی دینی و دنیاوی ضرورت کا مرجع و ماویٰ بنایا جائے اور وہی سب کا آخری ٹھکانا بن جائے۔

یہ تو

إِنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ

کا مطلب اور خلاصہ ہوا، لیکن آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہو کہ

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا
صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا

جہاں تک میرا خیال ہو خالق کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الٰہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے جو توجہ دلائی گئی ہو اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہو کہ واقعی ذات حق کے ساتھ براہ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن لوں میں اُمنگ و آرزو ہو، ان کو اپنی دینی زندگی میں اس ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے۔ اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہو لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہیے اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہو اسلیے مقابلۃً یہی سمجھنا چاہیے کہ [یہاں عمل صالح سے مخلوقات کے ساتھ تعلقات کی درستی اور استواری مراد ہو۔ اور] مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو سلجھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجہ تک آدمی کو پہونچائے گی۔

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ خالق کی عبادت (نماز روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپرواہیوں سے کام لیتے ہیں یا اس کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں، یہ دونوں ہی طبقے انسانی سلوک کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں، ٹھیک راستہ پر وہی چل رہے ہیں جن کی نگاہوں میں دونوں کی اہمیت ہو۔

هذا والسلام على من اتبع الهدىٰ

خاکسار مناظر احسن گیلانی

یوم الجمعہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء عند اذان العصر بمقام کہف الایمان المشہور بہ تکمرہ "سورۂ کہف کے متعلق ایک ظلوم و جہول کے واردات و احساسات پورے ہوئے ـــــ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم"۔

وفا شعاری کے دو نادر نمونے

از افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

حجّاج

طائف کے مکتب خانے میں بچوں کو پڑھاتا تھا، لیکن معلم الصبیانی کے اس پیشہ سے اتنی آمدنی جو ضروریات کے لئے کافی ہوتی، نہیں ہوتی تھی، پھر کیا کیا جائے، طائف سے اٹھا، دمشق پہونچا، وقت کے حکمراں کا جو وزیر باتدبیر تھا اس کے باڈی گارڈ کے سپاہیوں میں بھرتی ہوگیا، وزیر کا نام روح بن زنباع تھا، مروانی حکومت کے پہلے حکمران عبدالملک بن مروان نے روح کو اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ بھرتی ہونے والا سپاہی، یوسف ثقفی باشندہ طائف کا لڑکا تھا، نام اس کا حجاج تھا، یہ وہی حجاج ہے، جس کی یاد کو مسلمان اپنے حافظہ سے مٹانا چاہتے ہیں، لیکن بجائے مٹنے کے وہ تازہ ہی ہوتی رہتی ہے، امت اسلامی کے جگر کا وہ گھاؤ ہے جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح ہرا ہے، نہ اس کی ٹیس ہی کم ہوتی ہے اور نہ دکھ ہی اس کا بھلایا جا سکتا ہے، عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے۔

”دنیا کی ہر قوم اپنے اپنے فرعونوں کو لے کر کھڑی ہو، اور ان سارے فرعونوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے حجاج اگر پیش کر دیا جائے۔ تو مسلمانوں کا یہ فرعون سب پر بھاری ہو جائے گا۔“ (ابن عساکر ج ۴)۔

مگر باوجود بے دینی اور حد سے گزری ہوئی بے دینی کے یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کا الزام حجاج پر مشکل ہی سے لگایا جا سکتا ہے، غلط ہو یا صحیح، لیکن ایک ضابطہ اور آئین کو طے کر لینے کے بعد کرتا تھا جو کچھ بھی وہ کرتا تھا۔ اس کا شاید یہ فطری رجحان تھا کہ وقت کی حکومت خواہ کسی طرح قائم ہو گئی ہو رعایا کو چاہیئے کہ بے چون و چرا اس کے احکام کی پابندی کرے ظاہراً و باطناً اس کے وفادار رہیں۔ وہ اپنے نزدیک سمجھتا تھا کہ قرآنی آیت

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَاَطِيْعُوا　　ڈرو اللہ سے، جہاں تک تمہارے بس میں ہو، سنو اور فرمانبردار بنے رہو۔

(التغابن)

کا مطلب یہ ہو کہ اللہ سے ڈرنے کے لئے استطاعت کی شرط لگا دی گئی ہو یعنی جہاں تک آدمی کے بس میں ہو خدا سے ڈرے، لیکن حکومت کے احکام کے متعلق صرف یہی حکم دیا گیا ہو کہ سننے والے ان کو سنیں اور بے چون وچرا اس کے فرمانبردار بنے رہیں۔ اسی لئے کہتا تھا کہ میں جو حکومت کا نمائندہ ہوں اگر حکم دوں کہ لوگ مسجد کے فلاں دروازے سے نکلیں، اس حکم کے بعد بھی کسی دوسرے دروازے سے جو نکلے گا، میرے لئے اس کا خون بھی حلال ہو جائے گا اور اس کا مال بھی، یہی وہ کہتا بھی تھا اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔ عمر بن عبد العزیز کے سامنے ایک صاحب عنبسہ بن سعید نامی نے اپنی یہ بعض چشم دید شہادتیں بیان کی تھیں، حجاج نے حکم دے رکھا تھا کہ رات میں کسی کو کوفہ کی گلیوں اور سڑکوں پر فلاں وقت سے صبح تک نکلنے کی اجازت نہیں، گویا کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا تھا، عنبسہ کہتے ہیں کہ صرف ایک رات جب میں حجاج کے پاس بیٹھا تھا، لوگ گرفتار ہو ہو کر آتے تھے، بے چارے وجہ بھی بتاتے لیکن کسی کی شنوائی نہ ہوتی، اور یہ کہتے ہوئے کہ

نہیناکم وتعصونا — ہم تم کو منع کرتے ہیں اور تم ہماری نافرمانی کرتے ہو،

حجاج حکم دیتا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے، بے چارے قتل کر دیئے جاتے تھے، حجاج نے اپنے عہد حکومت میں واسط نامی شہر آباد کیا تھا جس میں میونسپلٹی کا قانون نافذ تھا، برسر راہ پیشاب کرنے والوں کی سزا حبس دوام تھی۔

حکومت کے ساتھ وفاداری کے اسی جذبہ کی شدت نے ترقی کی راہ بھی اس کے لئے ہموار کی تھی، جس زمانے میں عبد الملک کے وزیر کے باڈی گارڈ کا حجاج سپاہی تھا، وزیر نے یہ کہتے ہوئے عبد الملک کے سامنے پیش کیا تھا کہ نظم وضبط کے قائم کرنے میں میرا خیال ہو کہ اس شخص سے آپ کو مدد ملے گی۔ عبد الملک سفر میں تھا، حجاج کو حکم دیا کہ جس وقت میں سوار ہو جاؤں تم اس کی نگرانی کرو کہ کوئی میرے سوار ہونے کے بعد بیٹھا نہ رہے، حکم سن کر حجاج چلا گیا، کوچ کا نقارہ بجا، حجاج بھی سب کو سوار ہونے کا حکم دے رہا تھا، اور لوگ سوار ہوتے چلے جاتے تھے، لیکن جب وزیر کے ان ہی آدمیوں کے سامنے آیا جنہیں کا ایک سپاہی وہ بھی تھا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ آؤ! ابھی کچھ کھا پی لیں تب روانہ ہوں گے یہ سننا تھا کہ حجاج نے ایک ایک کی پیٹھ کوڑے سے پھاڑ دی۔ وزیر کے خیمہ میں آگ لگا دی، یہ خبر وزیر نے خود روتے ہوئے عبد الملک تک پہنچائی، حجاج بلایا گیا تو "یہ کیا کیا"؟ کے جواب میں جس وقت وہ کہہ رہا تھا۔

"امیر المومنین! میں نے تو کچھ نہیں کیا، میرا کوڑا میرا کوڑا نہیں آپ کا کوڑا تھا، میرا ہاتھ میرا ہاتھ نہیں آپ کا ہاتھ تھا"۔ (الیافعی صہ)

عبد الملک کی باچھیں کھل گئیں، جس آدمی کی تلاش تھی گویا وہی اس کو مل گیا، ترقیوں کی راہ حجاج پر کھل گئی، پہلے حجاز کا گورنر ہوا اور عبد الملک کی وفاداری میں عبد اللہ بن زبیر صحابی رضی اللہ تعالیٰ کو صحن کعبہ میں شہید کیا، مکعبہ تک میں آگ لگنے کی پرواہ اس نے عبد الملک کے حکم کے مقابلہ میں نہ کی تب عراق اور خراسان کی گورنری سے سرفراز ہوا گیارہ سال تک عبد الملک کی حکومت میں اور عبد الملک کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین ولید کے زمانہ میں ۹ سال تک مسلسل حکمرانی حکو

کے سب سے بڑے علاقہ میں حکومت کرتا رہا، اسی زمانہ میں دو سال کی مدت میں واسط کا شہر کوفہ اور بصرہ کے درمیان اس نے تعمیر کیا جو اس زمانہ میں دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا، اور خضراء واسط یعنی واسط کے سبزہ زار کے نام سے مشہور تھا جسے دیکھ کر بلکہ جو بے ساختہ زبانوں پر قرآنی آیت

اَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ	ہر ٹیلے پر نشانی کی عمارتیں جن کا کوئی فائدہ نہیں
وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ	کھڑی کرتے ہو، اور ایسے مکانات تعمیر کرتے ہو
تَخْلُدُوْنَ ہ	کہ شاید تم ہمیشہ دنیا میں رہو گے۔

... آجاتی تھی معلم الصبیانی کے مکتب خانے سے نکل کر عراق، ایران، خراسان جیسے ممالک کی حکومت تک پہونچنے کے بعد بھی حکومت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ حجاج کا ترقی پذیر ہی تھا۔ اس نے بڑے بڑوں کی بھی اس راہ میں پرواہ نہ کی جنگ کے بالڑائی کے مقتولوں کے سوا اس راہ میں بیان کیا گیا ہو کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار تعداد حجاج کے ان مقتولوں کی ہو جو اس کے سامنے باندھ کر قتل کئے گئے، اور جیل خانے سے حجاج کے مرنے کے بعد

(۸۱) ہزار قیدیوں کو رہائی بخشی گئی، جن میں ۳۳ ہزار تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے نہ چوری کی تھی اور نہ کوئی ایسا جرم کیا تھا جس کی سزا اسولی وغیرہ ہو۔ (ابن عساکر ۸)

حکومت کے حکم سے بال برابر تجاوز اس کے نزدیک قتل و جس کا مستحق لوگوں کو جب بنا دیتا تھا تو اس سلسلہ میں جو کچھ بھی اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہو بظاہر اس سے انکار کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی قانون بنا لینے کے بعد جو فعل بھی کیا جائے آئینی بن جاتا ہو، یہی اس کا خیال بھی تھا، پوچھنے والے نے ایک دفعہ اس سے پوچھا بھی کہ اپنے ضمیر میں تم اپنی خونریزیوں اور سفاکیوں کے متعلق کسی قسم کی خلش بھی محسوس کرتے ہو تو جواب میں اس نے کہا تھا۔

لبنان اور سنیر (شام کے دو پہاڑوں) کے برابر سونا خیرات کرنے سے زیادہ میں ثواب کا کام اپنے ان اعمال وافعال کو سمجھ رہا ہوں جو حکومت کی فرمانبرداری اور وفاشعاری کے سلسلہ میں مجھ سے اب تک بن پڑے ہیں۔ (ابن عساکر ۶۸/۴۴)

اس راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی صحابیت کے شرف کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گردن میں جیسا کہ مشہور ہو اس نے مہر لگائی تھی جو علامت تھی اس بات کی کہ ان کی وفاداری مشکوک ہو، اس نے بڑے جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو جس بے دردی اور قساوت قلبی سے قتل کیا، عام طور سے درد کی اس داستان کو لوگ بیان کرتے رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ اسی کے بعد اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا کچھ ایسے خواب دیکھنے لگا جو اس کی موت کی خبر دے رہے تھے، مگر بایں ہمہ اس نے اس کے بعد بھی جو وصیت نامہ ..... لکھوایا تھا، وہ یہ تھا،

"حجاج یوسف کا بیٹا (مرنے کے وقت) یہ وصیت نامہ لکھوا رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہو اس کی بھی میں گواہی دیتا ہوں، اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں"۔

اس رسمی تمہیدی فقرے کے بعد "وصیت نامہ" کے الفاظ یہ تھے۔

انه لا یعرف الا طاعة الولید بن عبد الملك علیها یحیا وعلیها یموت وعلیها یبعث

(ابن عساکر ص۶۶ ج۴)

اور حجاج ولید بن عبد الملک (وقت کے حکمراں) کی اطاعت (فرمانبرداری) کے سوا اور کچھ نہیں جانتا اسی پر وہ زندہ رہا، اسی پر مرے گا، اور اسی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

اور اس سے بھی دلچسپ لطیفہ "ضمیری مغالطہ" کا یہ ہو، حجاج ایک دفعہ بیمار ہوا، اور اتنا سخت بیمار، کہ کوفہ میں اس کے مرنے کی خبر مشہور ہو گئی، قدرتاً لوگوں نے اطمینان کی سانس لی، مگر بجائے مرنے کے حجاج چنگا ہو گیا، جمعہ کے دن منبر پر آ کر اس نے تقریر کی، جس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ

"تم نے مشہور کر دیا کہ حجاج مر گیا، خدا کی قسم اپنے متعلق ہر طرح کی بہتری اور بھلائی کی، امید مجھے اپنی موت ہی سے ہو"! (ابن عساکر ص۶۲ ج۴)

اسی لئے پسند بھی وہ ان ہی لوگوں کو کرتا تھا جو حکومت کے مفاد کی حفاظت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے تھے اور اس راہ میں سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، اصفہان کا گورنر بنا کر حجاج نے ایک بدوی عرب کو اس لئے بھیجا تھا کہ خراج کا بقایا سالہا سال سے اصفہان والوں پر چڑھا چلا آتا تھا، وصول نہیں ہوتا تھا، المسعودی نے لکھا ہو کہ اصفہان پہونچ کر نمبرداران اور مقدموں کو گورنر نے جمع کیا، آٹھ مہینوں کی مہلت ان لوگوں نے طلب کی، اس نے بجائے آٹھ کے دس مہینے تک کی مہلت دیتے ہوئے کہا کہ دس آدمیوں کی ضمانت پیش کرو، ضمانت دینے والوں نے ضمانت تو دے دی، لیکن مقررہ مدت تک رقم جب وصول نہ ہوئی، تو ضمانت دینے والوں کو طلب کر کے اس گورنر نے حکم دیا کہ خالی تھیلیاں خزانے سے لائی جائیں، اور ان ضمانت دینے والوں میں سے ایک ایک کو مُنڈی کاٹ کاٹ کر تھیلی بھری جائے، حکم کے مطابق ابھی دو ایک منڈیوں تک نوبت پہونچی تھی، تھیلیاں جو بھری گئیں، اور منہ ان کا بند کر دیا گیا تھا مہر لگا دی گئی، اور پشت پر گورنر نے لکھا۔

"فلاں ابن فلاں کے ذمہ جتنی رقم واجب الادا تھی وہ وصول ہو گئی"!

لوگوں میں ہلچل مچ گئی، اور چند گھنٹوں میں سالہا سال کا بقایا وصول ہو گیا۔

حجاج تک وصولی کرنے کے اس طریقہ کی خبر جب پہونچی تو اپنے انتخاب کی داد خود دے رہا تھا۔ لکھا ہو کہ جب تک حجاج زندہ رہا، اصفہان پر اس کا یہی بدوی گورنر مسلط رہا، حالانکہ عبادت میں حال اس کا یہ تھا کہ چار درم دے کر حجاج

نے حکم دیا کہ تین آدمیوں پر اس کو تقسیم کر دو، تین درم تک تو حساب صاف تھا لیکن جو تھے درم کو کیا کرے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

(المسعودی ص ۱۱)

اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ "ضمیر" کو دینی حدود سے آزاد کر دینے کے بعد بآسانی دھوکہ دیا جا سکتا ہے حجاج کی زندگی اس مغالطہ کی ایک عبرتناک تاریخی مثال ہے، وہ دین کا نہیں بلکہ آئین کا پابند بن کر حکومت کرنا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ آئین کے بنانے والے خود انسانی عقول اور دماغ ہوتے ہیں اپنی خواہش کے مطابق عقل اور دماغ سے مشورہ حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہیں، دین کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ عقل و دماغ نہیں بلکہ عقل و دماغ کا خالق حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک ہوتی ہے اسی لئے شعوری اور غیر شعوری خواہشوں کی آلودگیوں سے دین کے دفعات پاک ہوتے ہیں۔

حجاج نے حکومت کی بہی خواہی اور وفاداری کے سلسلہ میں یہ واقعہ ہے کہ وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا، دین کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی نصب العین پر اپنی دنیا بھی اس نے قربان کر دی تھی۔ ابن عساکر نے لکھا ہے۔

مات الحجاج ولم یترک الا ثلاثمائة درهم ومصحفا وسیفا وسرجا ورحلا ومائة درع موقوفة (ص ۳۴)

حجاج جب مرا تو اس نے نہ چھوڑا مگر صرف تین سو درم (نقد کی شکل میں) ان کے سوا ایک قرآن ایک تلوار، ایک زین، ایک کجاوہ، اور سو عدد زرہیں جو جنگ کے لئے وقف تھیں۔

اس کا خیال تھا اور کلیۃً بے بنیاد خیال نہ تھا کہ اسلام کی وجہ سے دولت و ثروت کا جو طوفان عربوں میں امنڈ پڑا تھا۔ اس نے عربی قبائل اور ان کے شیوخ منچلے لوگوں کے قلوب میں طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دی تھیں، ابتداء تو ان کی عہد نبوت ہی میں ہو چکی تھی، ملک کے مختلف حصوں میں متنبی (زبردستی جھوٹی نبوت) کے دعوے کرنے والے) اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے بعد حکومت کے باغیوں کا ایک طویل الذیل سلسلہ تھا، جو کسی طرح رکتا ہی نہ تھا، اسلامی تاریخوں میں حکومت کے ان ہی باغیوں کو الخوارج کہتے تھے۔ دراصل جزیرہ نما عرب کے مختلف حصوں میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ ان کی نظر اسلامی فتوحات پر جب پڑی اور محسوس ہوا کہ بظاہر عربی بدوؤں کے یہ کارنامے ہیں تو طرح طرح کے خیالات ان میں پیدا ہونے لگے۔

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔

قسمت آزمائی کے میدان میں لوگ اترنے لگے، ان میں عجیب و غریب صلاحیتوں کے لوگ تھے، علاقہ نجد کا ایک خارجی ڈاکو جحدر کے متعلق لکھا ہے کہ گرفتار ہو کر جب حجاج کے پاس وہ لایا گیا اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر حجاج مبہوت سا رہ گیا، ایک بھوکے شیر سے حجاج نے مقابلہ کا حکم دیا۔ ابن عساکر کی روایت ہے کہ جحدر ڈاکو کا سیدھا ہاتھ حالانکہ بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا، صرف بایاں ہاتھ کھلا ہوا تھا، تلوار اسی ہاتھ میں جحدر کے تھی شیر چھوڑا گیا۔ حجاج جحدر کے سے دیکھ رہا تھا شیر جحدر پر

بھپٹا اس نے تلوار پر اس کو روکتے ہوئے ایسی ضرب لگائی کہ۔

خر لاسندا کانہ خیمۃ صرعتہا الریح۔ (ص۴۲)	شیر چکرا کر اس طریقہ سے گر پڑا، جیسے آندھی نے کسی خیمہ کو اکھاڑ کر زمین پر گرا دیا ہو۔

جس کے بائیں ہاتھ میں اتنی قوت تھی، اور جیوٹ کا حال جس کے یہ تھا کہ ایسی حالت میں بھی غضبناک بھوکے شیر سے [illegible] پر آمادہ ہو گیا، اندازہ کیجئے کہ امکانات کے کیسے کیسے طلسمی ایوان اس کے دل و دماغ میں تیار ہوتے ہوں گے، خدا ہی جا[نتا] ہو کہ جدر جیسے خارجی اور باغی کتنے تھے، حجاج بیخ و بنیاد سے ان عناصر کو ختم کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا کہتے ہیں کہ کوفہ او[ر] بصرہ کے قرا (یعنی علماء کی اکثریت) ابن اشعث کو لیڈر بنا کر حجاج کے مقابلہ میں جب کھڑے ہوئے تو خواجہ حسن بصر[ی] فرماتے تھے۔

ان الحجاج عقوبۃ سلطہ اللہ علیکم فلا تستقبلوا عقوبۃ اللہ بالسیف (ص۲۶)	حجاج ایک قدرتی سزا ہو جسے خدا نے تم لوگوں پر مسلط کیا ہو، تم تلوار سے اللہ کی اس سزا کا مقابلہ مت کرو۔

خود بھی دوہی کہتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے حوالہ سے ایسی روایتیں نقل کیا کرتے تھے جن سے معلوم ہوتا [ہے] کہ کوفہ کے باشندوں کی سرکشیوں سے تنگ آکر حضرت علی نے بددعا کی تھی۔

اللھم سلط علیھم غلام ثقیف یحکم فی دمائھم واموالھم بحکم فیھم بحکم الجاھلیۃ "(ابن عساکر ص۴۲)"	اے اللہ ان پر ثقیف قبیلہ کے لونڈے (یعنی حجاج) کو مسلط فرما جو ان کے خون اور ان کے مال کے متعلق جاہلیت کے فیصلے کرے گا۔

مطلب خواجہ حسن بصری کا یہی تھا کہ بجائے باہر کے چاہیئے کہ ایسے مواقع میں مسلمان اپنے اندر کو ٹٹولیں، باہر کی آگ کو دیکھیں کہ خود ان ہی کے اندر سے تو کہیں بھڑک نہیں اٹھی ہو، لیکن یہ عجیب بات ہو کہ جو بات اپنے بس کی ہوتی ہو عمو[ماً] اسی سے لاپروائی اختیار کی جاتی ہو، اور بظاہر جس کا مقابلہ ناممکن نظر آتا ہو اسی سے مقابلہ کرنے کے لئے لوگ تیار ہو جا[تے] ہیں۔ ممکنات سے اعراض کرتے ہیں۔ اور ناممکنات کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں جسے کر سکتے ہیں وہی نہیں کرتے اور جو نہیں کر [سکتے] اسی کے کرنے کی تجویزوں میں اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں، مال بھی برباد کرتے ہیں، آبرو بھی لٹاتے ہیں اور اپنے خون کو بھی رائگاں کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، خواجہ حسن بصری کی تلقین عرب کے گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کو پسند نہ آئی، لکھا ہو کہ

نطیع ھذا العلج	اس گنوار پردیسی کی بات کیا ہم مان لیں؟

کہتے ہوئے لوگ آپ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے، حالاں کہ اس سے پہلے یہی خواجہ حسن بصری باوجود غیر عربی النسل مسلما[ن] ہونے کے بصرہ کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے متقی پرہیزگار، اور سب سے بہتر تقریر کرنے والوں میں شمار ہوتے تھے، جن[ھیں] ان پر بزدلی کا الزام لگایا، جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ تو نہ کیا گیا اور جو نہیں ہو سکتا تھا اسی کو کرنے کے لئے میدان میں اتر گئے

مروانیوں کی بے پناہ فوجی طاقت سے تھتے مسلمانوں کو ٹکرا دیا گیا، اس کا جو انجام ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ خواجہ حسن بصری ایک طرف عام مسلمانوں کو یہ سمجھاتے سمجھاتے تھکے چلے جاتے تھے کہ تلوار سے یہ مصیبت نہیں ٹلے گی جو تم پر ٹوٹ پڑی ہے، بلکہ

استقبلوها بالدعاء والتضرع ۔ اس مصیبت کا مقابلہ چاہیے کہ دعا، اور خدا کے حضور نالہ وزاری سے کرو۔ (ص۱۴۴)

دوسری طرف حجاج کو بھی جب موقع ملتا، یہ نصیحت فرماتے کہ

دیکھنا اللہ کے نیک بندوں سے بچتے رہنا۔ (الاغانی ج۱۹ ص۱۴)

لیکن اس پر تو خون سوار تھا، وہ اعلان ہی کئے ہوئے تھا، کہ غیر مجرم لوگوں کو مجرموں کے بدلہ میں پکڑوں گا۔ اور وہ لوگوں کو پکڑ رہا تھا بے دھڑک قتل کر رہا تھا، حکومت کے ساتھ جس کی وفاداری میں ہلکا سا شبہ کسی وجہ سے پیدا ہوتا ان پر علانیہ غداری کا الزام لگا دیا جاتا تھا، لوگ مارے جا رہے تھے، قید خانوں میں سڑ رہے تھے، ان کے گھر گرا دیئے جاتے تھے، ان کے بچے یتیم، عورتیں بیوہ ہو رہی تھیں، لیکن حکومت کی طاقت کو سب کچھ یقین کرتے ہوئے، حجاج بغیر کسی دغدغہ کے یہ سب کچھ کر رہا تھا کہتے ہیں کہ جیل خانے جو حجاج نے بنائے تھے کسی میں چھت نہ تھی، کھلے میدانوں میں چار دیواریوں کے اندر گرمی، سردی رات دن لوگ گزارنے پر مجبور کئے جاتے تھے، جو مر جاتے کتوں کی طرح ان کی لاش پھنکوا دی جاتی تھی اور یہ سب اس لئے کیا جا رہا تھا کہ اپنی حکومت کی بے پناہ طاقت پر بھی اس کو بھروسہ تھا، اور اسی کے ساتھ باور کئے ہوئے تھا کہ مروانیوں کی حکومت کے استحکام و استواری کی سیاسی تدبیر بھی یہی ہو۔ بظاہر حجاج کے زمانہ میں حکومت کی قوت میں قوت کا اضافہ جس طرح سے ہو رہا تھا اس کو دیکھتے ہوئے ہر دیکھنے والا شاید یہی باور کئے ہوئے تھا جو حجاج کا خیال تھا، لیکن اچانک واقعات کا رخ بدلنے لگا، حجاج نے خواب میں دیکھا کہ اس کی پیشانی سے دونوں آنکھیں اکھڑ کر باہر نکل آئی ہیں، بیدار ہونے کے بعد اپنے اس خواب سے کافی متاثر تھا، چند ہی دنوں کے بعد اس کے سامنے اس کے بیٹے محمد نامی نے دم توڑ دیا، ابھی اس کا جنازہ شاید اٹھا بھی نہ تھا کہ یمن سے قاصد پہونچا، خبر لایا کہ حجاج کا بھائی محمد بن یوسف جو یمن کا گورنر تھا، مر گیا ان جانگداز دو حادثوں کی خبر سے متاثر ہی تھا کہ دربار میں اتفاقاً کہیں سے ایک نجومی پہونچا، حجاج نے پوچھا کہ اس سال کسی والیٔ ملک کے مرنے کی خبر بھی تیرے زائچہ سے ملتی ہے، نجومی نے کہا ہاں ملتی تو ہے، لیکن میرے حساب سے اس مرنے والے کا نام "کلیب" (کتیا) ہو۔ حجاج چیخ اٹھا۔

"کہ اسی نام (یعنی کلیب یا میری کتیا) کے نام سے میری ماں مجھے پکارتی تھی"۔

(الاغانی ج۱۹ ص۱۴)

اب دنیا حجاج پر اندھیر تھی اسی عرصہ میں حضرت سعید بن جبیر رئیس الصالحین کی شہادت کا حادثہ فاجعہ پیش آیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے لوگ حجاج کے جور و ظلم سے تنگ آکر روپوش ہو چکے تھے۔ خود خواجہ حسن بصری بھی ان ہی

لوگوں میں تھے، کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر کو قتل کرنے کے بعد حجاج پر ایک قسم کے جنون کا دورہ پڑنے لگا۔ نیند میں بھی چیخ اٹھتا۔

"سعید سعید تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو"

اور بیداری میں بھی کبھی چلا اٹھتا، دیکھو دیکھو! سعید مجھے قتل کرنے کے لئے میری طرف چلا آرہا ہو۔ سر میں جنون کے ساتھ ساتھ پیٹ میں درد کی بھی کیفیت پیدا ہوئی، اور وہی حجاج جس کے متعلق دیکھنے والوں کا بیان ہو کہ کھاتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا کہ

"کف دست میں بھر بھر کر روٹی میں مکھن کو لپیٹتا اور ایک لقمہ اس کا بنا لیتا"

راوی کا بیان ہو کہ

عددت .... اربعة وثمانين لقمة (ابن عساکر ص ۴۲/۴) (۸۴) لقمے میں نے گنے۔

اللہ اللہ جو مکھن اور روٹی کے لقموں کو بغیر کسی دغدغہ کے یوں ہی ہڑپ کرتا جاتا تھا، اچانک اسی حجاج کو پایا گیا کہ پیٹ کے درد سے تڑپ رہا ہو، حلق کے پار کوئی چیز اتار نہیں سکتا، طبیب نے گوشت کے ایک ٹکڑے میں دھاگا باندھا، اور بولا۔

"اے امیر! اللہ آپ کو شفا بخشے، ذرا اس لقمہ کو کسی طرح فرو کرنے کی کوشش کیجئے"

بمشکل لقمہ فرو ہوا۔ طبیب نے دھاگہ کو پکڑ کر کھینچا، گوشت کا ٹکڑا باہر نکل آیا، مگر کس حال کے ساتھ باہر نکلا کہا ہو

علق به دود کثیرة (ایانعی ص ۱۹۵ ج ۱) بہت سے کیڑے گوشت کے اسی ٹکڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔

طبیب نے عرض کیا، معدے میں سرطان کا پھوڑا ہو جس میں کیڑے پڑ چکے ہیں، درد اور بے چینی اسی کی وجہ سے ہو۔ علاج ہو رہا تھا، لیکن بجائے فائدہ کے ایک نیا قصہ شروع ہوا، زخم کی وجہ سے یا خدا ہی جانتا ہو کیا اسباب تھے اچانک زمہریرہ (سخت سردی) کا احساس حجاج میں باشدت پذیر ہونے لگا، پہلے تو کمل اڑھا اڑھا کر لوگوں نے اندر سے ابھرنے والی سردی کو دبانا چاہا، لیکن وہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، آخری حال یہ تھا کہ

كانت الكوانين تجعل حوله مملوة نارا وتدنى منه حتى يحرق جلده وهو لا يحس. (ایانعی ص ۱۹۵ ج ۲)

انگیٹھیاں دہکتے ہوئے انگاروں سے بھری ہوئی چاروں طرف سے حجاج کے لگائی جاتیں، مگر کچھ اثر نہ ہوتا، لوگ بدن سے انگیٹھیوں کو اتنا قریب کر دیتے کہ کھال حجاج کی جل اٹھتی، مگر اس کو خبر بھی نہ ہوتی۔

حالانکہ اسی حجاج کو اسی کوفہ میں دیکھا گیا تھا کہ موسم گرما میں تازہ تازہ بید کی سرسبز شاخوں سے قبہ بنوایا تھا اور بید

کی ان شاخوں کے ساتھ کوئی ذہنی تدبیر کی جاتی تھی کہ پھاڑ پھاڑ کر بیچ بیچ میں برف کا بورا ان میں بھرا جاتا تھا۔ حجاج اسی قبہ میں آرام کیا کرتا تھا۔ (ابن عساکر ص ۲۰۰۔ ج ۴)

اور گرمیوں میں سردیوں کا لطف اٹھایا کرتا تھا، مگر آج اس کے معدہ کی سردی کو گرمی سے بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ بری سے بری بات کو اچھی سے اچھی تعبیروں میں پیش کرنے کی مہارت میں حجاج اپنی آپ نظیر تھا، اہم معاملات کو اپنی منہ زوری سے غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، موت کی پرچھائیاں شروع شروع میں جب اسے محسوس ہوئیں تو کہتا تھا۔

"اوہ، مرنا اگر کوئی اچھی بات ہوتی، تو شیطان کو خدا کبھی اتنی دراز زندگی عطا نہ کرتا"۔ (ابن عساکر ص ۲۰۰)

یعنی ابلیس کی دعا "انظرني الى يوم يبعثون" (مہلت دیجئے اس دن تک جب لوگ اٹھائے جائیں) اس کی قبول نہ ہوتی مگر جب نگلی سرطان، اور زہر یرہ نے ہوش و حواس اُسکے بگاڑ دیئے۔ تو اب نہ اسے حکومت ہی یاد آتی تھی اور نہ حکومت کا وہ حکمراں جس کی اطاعت و فرمانبرداری کو سب کچھ ٹھہرائے ہوئے تھا، عبد الملک جس نے اس کو آگے بڑھایا تھا وہ تو مر چکا تھا، ولید بن عبد الملک کا عہد تھا، بیعت نامہ میں اسی لئے ولید کا نام اس نے درج کیا تھا، لیکن اب ولید اور اس کی حکمرانی سب خواب خیال ہو چکی تھی، صرف ایک آدمی کو ڈھونڈ رہا تھا جو اس کے خوف سے روپوش تھے، یعنی خواجہ حسن البصری تلاش کرنے والوں نے آخر حضرت والا کا پتہ چلا لیا، عرض کیا گیا کہ حجاج بڑی بیچینی کے ساتھ آپ کو ڈھونڈ رہا ہے، آپ باہر نکل آئے، جہاں پڑا کراہ رہا تھا، پہونچے دیکھنے کے ساتھ رونے لگا، اور گڑگڑا کر کہہ رہا تھا، حسن! اللہ سے میری مشکل آسان ہو، اس کی دعا کر دو، دیکھ رہے ہو میں کس حال میں مبتلا ہوں۔

خواجہ رحمۃ اللہ نے فرمایا: "دیکھ اللہ کے نیک بندوں کو نہ چھیڑنا، ہمیشہ اس کی تاکید تجھے میں کرتا رہا، لیکن تو نے نہ مانا، پھر فرمایا کہ میں تیرے لئے دعا کروں گا، بلبلا کر حجاج نے کہا

حسن! شفا کی نہیں، اب شفا کی بھلا کیا امید ہے، تم دعا کرو کہ موت میری تکلیف کا جلد خاتمہ کر دے"۔

آئینی بنا لینے کے بعد ہر فعل قانوناً جائز ہو جاتا ہو، ضمیر کو اسی مغالطہ سے دھوکہ دینے والے پر اب واضح ہوا کہ یہ صرف مغالطہ تھا، جب دم نکل رہا تھا، تو لوگوں کا بیان ہے، زبان پر اس کے

"اللهم اغفر لي فان الناس يقولون انك لا تفعل"

یعنی اللہ میرے گناہوں کو بخش دے، لوگ کہتے ہیں کہ تو ایسا نہیں کرے گا"

اس کی طرف دو شعر بھی منسوب کئے گئے ہیں، جو کلمات کے وقت اس کی زبان پر جاری تھے، ترجمہ جن کا یہی ہے کہ "لوگوں کا فیصلہ ہو کہ میں جہنمی ہوں مگر وہ یہ فیصلے بے دیکھے کر رہے ہیں، ان کو کیا معلوم کہ بہت بڑے درگزر کرنے والے آمرزگار کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں"۔

اس کی سوانح عمریوں میں تو نہیں، لیکن دوسری کتابوں میں نظر سے یہ بھی گزرا ہے، کہ حجاج کی ماں اس کے مرنے کے وقت روتی تھی اور کہتی تھی، ہائے بچے تونے زندگی بھر یہ کیا کیا، کہتے ہیں کہ حجاج نے آنکھیں کھول دیں اور بولا: ماں میرا فیصلہ قیامت کے دن اگر تیرے ہاتھ میں دے دیا جائے، تو سب کچھ جاننے کے باوجود میرے ساتھ تو کیا سلوک کرے گی۔ ماں نے کہا بیٹا! اگر ایسا ہوا تو جہنم میں بھلا اپنے لخت جگر کو میں جانے دوں گی" حجاج نے خدا ہی جانتا ہے کہاں تک یہ روایت صحیح ہے، ماں سے یہ سن کر کہا تھا کہ

"تو ماں! تو مطمئن رہ، جس کے ہاتھ میں میرا فیصلہ ہے، وہ تجھ سے کہیں زیادہ اپنے بندوں پر مہربان اور ترس کھانے والا ارحم الراحمین ہے!"

بیان کیا جاتا ہے کہ سیدنا امام جعفر صادق کے سامنے حجاج کے اس آخری فقرے کو کوئی نقل کر رہا تھا کہ اپنی جگہ سے آپ اچھل پڑے اور فرمایا کہ رجاء (امید) کے اسی حال میں اگر وہ مرا ہے تو کون کہہ سکتا ہے، کہ نامراد مرا۔ (ذکا قال)

ہر حال تنگی سرطان اور زمہریرہ کی اسی بیماری میں حجاج کا کام تمام ہو گیا" اور جس حکومت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے لاکھوں لاکھ انسانوں کے خون کو بے دردی کے ساتھ اس نے بہایا تھا اپنی ساری قوتوں اور لامحدود وسائل کے باوجود حجاج کی موت کے بعد سال کا ایک چلّہ بھی وہی حکومت پورا نہ کر سکی یعنی ۳۰ سال کے اندر اندر مروانیوں کا سارا جاہ و جلال خاک و خون میں مل گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ دمشق پایۂ تخت میں۔

"مروانی حکومت کے ننانوے شہزادوں کو ایک ساتھ ساتھ گرز اور لاٹھیوں سے مار مار کر زمین پر لٹا دیا گیا تھا" اور ان ہی کی نیم مردہ لاشوں پر چرمی دسترخوان بچھا کر عباسی خاندان کے لوگ کھانا کھا رہے تھے، دسترخوان کے نیچے سے آہ و نالہ کی آوازیں آرہی تھیں، کھانا جب ختم ہوا تو ان کی جانیں بھی ختم ہو گئیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ دمشق پایۂ تخت ہی تک قصہ محدود نہ تھا، بلکہ ملک کے طول و عرض میں جہاں کہیں بنی اُمیہ اور بنی مروان کے کسی فرد کا بھی پتہ چلتا تھا حکم تھا کہ ختم کر دیے جائیں، یہی کیا گیا حتیٰ کہ

لم یفلت منھم الا رضیع، او من ھرب الی الاندلس۔ (کامل ابن اثیر ص۱۶۱)

بجز شیرخوار بچے کے ان میں کوئی باقی نہ رہا اور یہ کہ اندلس کی طرف جو بھاگ گئے۔

بصرہ میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ

"کمخواب کے پائجاموں اور زربفت، زرتار، زردوزی کے لباس میں بنی امیہ کے خاندان کے شہزادے مرے ہوئے گھوڑوں پر پڑے ہوئے ہیں، اور کتے ان کی لاشوں کو چیر پھاڑ کر کھا رہے ہیں"

اور زندے تو زندے سنا تو یہ ہے کہ حجاج بے چارا جس حکومت کا دامن قیامت کے دن سے باندھنے کے لئے ہر کردنی اور ناکردنی کا مرتکب ہوا تھا، اسی حکومت کے حکمرانوں کی مردہ لاشیں قبروں سے اکھاڑی گئیں۔ ان میں ہشام بن عبدالملک جس کی

لاش واللہ اعلم سڑنے سے کس وجہ سے محفوظ رہ گئی تھی، باہر نکال کر اس جرم کی سزا میں کہ امام زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی کو بلا وجہ سولی کی سزا دے کر ان کی ننگی لاش سال بھر تک بطور تشہیر کے لٹکا رکھا تھا اور آخر میں جلا کر ہشام نے حکم دیا تھا کہ ان کی خاک ہوا میں اڑا دی جائے۔ بجنسہ یہ ساری کارروائیاں ہشام کی اس لاش کے ساتھ بھی کی گئیں ہو شائد اسی لئے محفوظ رہ گئی تھی۔

ابراہیم تیمی

بہر حال یہاں سوچنے کی بات یہ حجاج کی موت ہو اور یہ لرزہ براندام کرنے والی اس کی بیماری، بجائے خود ان کی حیثیت بھی کچھ ہو، لیکن بروں کے ساتھ اچھوں کو بھی مرنا ہی پڑتا ہو۔ امراض کے شکار سب ہی ہوتے ہیں، نیک ہوں یا بد، اور کیسے کیسے امراض، کیسی کیسی بیماریاں کتابوں میں پڑھئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی جن سے بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہو ملائکہ مصافحہ کرتے اور سلام کیا کرتے تھے، نام ان کا عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا، بصرہ کے دینی علوم کے ایک بڑے اہم سرچشموں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں کے قاضی بھی تھے لیکن مہینہ دو مہینے نہیں ابن جوزی نے لکھا ہو کہ

سقی بطنہ فبقی ثلثین سنۃ	یعنی استقاء کے مرض میں مبتلا تھے۔ اسی لئے
علی سریر منقوب	تیس سال تک ایسے کھاٹ پر رہے، جو بیچ سے
(ص ۲۸۳)	کاٹ دیا گیا تھا۔

الذہبی نے لکھا ہو کہ ان کو بواسیر کا مرض بھی تھا (تذکرۃ الحفاظ) نالباً خونی بواسیر تھی، خون بہتا رہتا تھا۔ ان کے حال کا اندازہ اسی سے ہوتا ہو کہ ان کے خاص شاگرد مطرف نے ان سے کہا

"آپ جس حال میں رہتے ہیں، مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، اسی لئے عیادت و مزاج پرسی کی ہمت بہت کم ہوتی ہو"

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان ہی مطرف (اپنے شاگرد سے) خود حضرت عمران فرماتے تھے۔

"میاں! ایسا نہ کیا کرو، میرا یہ حال خود مجھے بھی محبوب ہو، اور میرے مالک کو بھی پسند ہو" صفوۃ الصفوۃ ص ۲۸۳ ج ۱

صحابہ کے دیکھنے والوں میں ایک بڑے نامی بزرگ ابو قلابہ نامی گزرے ہیں، علم حدیث کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں حکومت قاضی بننے پر اصرار کرتی رہی، لیکن اس عہدے کے قبول کرنے سے عمر بھر گریز ہی کرتے رہے، غیر معمولی فضائل و کمالات سے معمور تھے، آخر عمر میں بیمار پڑے اس کا تو علم نہ ہو سکا کہ مرض کیا تھا، لیکن الذہبی کا بیان ہو،

مات بعرش مصر سنۃ اربع ومائۃ	عرش (علاقہ مصر) میں آپ کی وفات سنہ ۱۰۴ھ

وقد ذهبت يداه ورجلاه وبصره
وهو مع ذالك حامد شاكر
(ص۹۶)

میں ہوئی، آپ کے دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں
غائب ہو چکے تھے، اور بینائی بھی جاتی رہی تھی
مگر اس حالت میں بھی خدا کے شکر گزار تھے۔

ابن سعد وغیرہ میں لکھا ہو کہ ابو قلابہ کی مزاج پرسی کو عمر بن عبد العزیز خلیفہ اور ابو العالیہ جیسے اکابر آتے، ان کو اس حال میں دیکھتے تو کہتے۔

"ابو قلابہ! جھوٹ اور نامردی سے کام لو، ارباب نفاق کو (اخلاص والوں) پر ہنسنے کا موقع نہ دینا" (ابن سعد ج۷ ص۱۳۵)

اسی کی طرف الذہبی نے اشارہ کیا ہو کہ ہاتھوں، ٹانگوں، آنکھوں سب ہی کو کھو دینے کے بعد بھی وہ اپنے مالک مولیٰ تعالیٰ جل مجدہ کا شکر یہ ہی ادا کرتے رہے اور اس کی حمد کا گیت ہی گاتے رہے۔ رحمہم اللہ

اور سچ تو یہ ہو کہ موت سے چارہ جب کسی کے لئے نہیں ہو، ہر سانس لینے والی زندہ جان موت کا مزہ بہر حال چکھ کر رہتی ہو تو موت کے مقدمات امراض میں نیکوں اور بدوں میں امتیاز کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہو، نتائج کے لحاظ سے اختلافات کے حدود تو مرنے کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ اسی لئے حجاج کے حالات میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق یہ پہلو ہو کہ اپنے سیاسی ماحول کی سازگاریوں کو دیکھ کر آئندہ اور مستقبل کے متعلق دھوکہ میں مبتلا ہو گیا۔ ذہن اور زبان کے زور سے ہر غیر آئینی فعل پر آئین کا خول چڑھا دیتا تھا، اور درحقیقت پس پردہ اپنی فوجی قوت پر اس کو بھروسہ تھا جس کی منطق کا جواب غریب نہتے عوام کے پاس نہیں ہوتا۔ تاریخ کا یہ سبق ہو، کہ اس قسم کی زیادتیوں کا انتقام قدرت کی طرف سے عموماً غیر معمولی مہیب شکلوں میں لوگوں کے سامنے آیا ہو، اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر اس وقت تو وہ منہ زوریوں سے کام لیتے ہیں ڈھیٹ بن کر جو جی میں آتا ہو کر گزرتے ہیں، لیکن بہت جلد اس کا خمیازہ بھی ان کو اسی طرح بھگتنا پڑا جیسے مروانی حکومت کے حکمرانوں اور کارندوں کو بھگتنا پڑا حجاج اس لحاظ سے اس کا مستحق ہو کہ قومیں اس کا مطالعہ کریں اور سیاسی طاقت کے استعمال میں جن غیر معمولی محتاط و نازک ذمہ داریوں کی ضرورت ہو، اس کا سبق سیکھیں۔

کچھ بھی ہو، حجاج اور حجاج کی ظالمانہ چیرہ دستیاں تو اتنی مشہور ہیں کہ تفصیلاً نہیں اجمالاً اس کے طرز عمل کی خصوصیتوں سے مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ عموماً واقف ہو، دنیا کی ایک حکومت کے ساتھ اس کی حد سے گزری ہوئی وفاشعاری کے مقابلہ میں اگرچہ ہم حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو قلابہ تابعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگوں کے حالات سے بھی عبرت حاصل کر سکتے ہیں، آدمی چاہے تو خدا کا بھی ایسا وفادار بندہ بن کر رہ سکتا ہو کہ تیس تیس سال کٹے ہوئے کھاٹ پر گلے گئے دونوں ہاتھ دونوں پاؤں، دونوں آنکھیں غائب لیکن ہر حال میں شاکر ہیں، اسی کو اپنا محبوب حال یقین کرتے ہیں، اسی کے مقابلہ میں حجاج تھا کہ خدا کے چند بندوں یعنی مروانی حکومت کے حکمرانوں (عبد الملک اور ولید) کی وفاداری میں اپنا سب کچھ تج دیا۔ اپنی زندگی، اپنی موت سب یہ ہو کہ آخرت تک کو ان ہی کے قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے مطمئن تھا گویا یہی کرنے کا کام تھا۔

لیکن درحقیقت جن صاحب کی عجیب و غریب موت کا ذکر اس قسط[عہ] میں میرے پیش نظر ہے وہ حجاج ہی کے عہد کے ایک گم نام غیر مشہور آدمی کی موت ہے، ان کا نام ابراہیم تھا، اپنے قبیلہ کی طرف منسوب ہو کر ابراہیم تیمی کے نام سے لوگ ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی موت میں وفاداری ہی کا دوسرا پہلو آپ کے سامنے آئے گا۔ صورت یہ پیش آئی کہ کوفہ جس کے دارالامارہ میں بیٹھ کر حجاج اپنی من مانی کارروائیوں میں مشغول تھا، یہیں ایک اور بزرگ ابراہیم ہی نامی تھے جو ہماری علمی اور فقہی تاریخ میں ابراہیم نخعی کے نام سے مشہور ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ فقہ حنفی کا اساسی نقشہ دراصل ابراہیم نخعی ہی کی اجتہادی کوششوں سے تیار ہوا تھا، امام ابوحنیفہ نے جو بیک واسطہ ان کے شاگرد ہیں چونکہ اپنے زمانہ میں باضابطہ ایک آزاد مجلس وضع قوانین قائم کر کے ابراہیم نخعی کے قائم کئے ہوئے نقشہ کو مکمل کیا اور آب و رنگ اس میں بھرا اس لئے حنفی مسلمانوں کی دینی زندگی جن فقہی مسائل کے زیر اثر گزر رہی ہے ان کو "حنفی فقہ" کے نام سے لوگوں نے موسوم کر رکھا ہے، وہ صحیح معنوں میں اس کا نام چاہیئے تھا کہ ابراہیمی حنیفی[1] فقہ رکھا جاتا۔

امام شعبی کے یہ الفاظ جو ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد ان کی زبان سے نکلے تھے یعنی

واللہ ما ترک بعدہ مثلہ بالکوفہ ولا بالبصرۃ ولا بالشام ولا بکذا ابکذا ولا بالحجاز ص ۱۹۰ (طبقات ابن سعد)	خدا کی قسم ابراہیم نے اپنا جیسا آدمی اپنے بعد کہیں نہیں چھوڑا، نہ کوفہ میں، نہ بصرہ میں، نہ شام میں، نہ یہاں، نہ وہاں، نہ حجاز میں۔

امام شعبی کی جلالت قدر سے واقفیت کے بغیر ان الفاظ کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا بہر حال ابراہیم نخعی کے تفصیلی حالات کا مطالعہ تو تفصیلی کتابوں میں کرنا چاہیئے، اس وقت میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ حجاج کی وجہ سے رست و خیز کا جو عالم کوفہ میں برپا تھا، حالانکہ حضرت ابراہیم سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے تعلیم و تدریس کے ساتھ زہد و ریاضت کی زندگی گزارتے تھے۔ اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی کہ حجاج کی نگاہوں پر وہ بے چارے بھی چڑھ گئے شاید اس قسم کے فقرے جو کتابوں میں ابراہیم نخعی کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، مثلاً جبابرہ (ڈکٹیٹر بن کر حکومت کرنے والوں پر) کبھی کبھی لعنت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ فقرہ بھی ان کی زبان پر جاری ہو گیا کہ

"اندھے ہونے کے لئے یہی کافی ہو کہ حجاج کے معاملہ میں کوئی اندھا پن سے کام لے"

(طبقات ص ۱۹۵)

عہ یہ مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا تھا، اشارہ دوسری قسط کی طرف ہے۔ مرتب

لہ فقہ حنفی کی یہ تعبیر واقعہ کے مطابق بھی ہوتی، اور بطور تفاؤل کے واتبع ملۃ ابراہیم حنیفا کی قرآنی آیت کی طرف ذہنی انتقال کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی، مگر لوگوں نے ابراہیم کی نسبت کو تو خیر حذف ہی کر دیا۔ ابوحنیفہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے بجائے حنیفی کے سہولت پسندوں نے حنفی کہنا شروع کر دیا۔ "حنیفہ" کے لفظ کی "یا" بھی کیوں ساقط ہو گئی بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۲

حجاج کے جاسوسوں نے شاید ان ہی باتوں کو حجاج تک پہونچا دیا۔ بھلا ان باتوں کو کہاں برداشت کر سکتا تھا" ابراہیم نخعی کے نام سے وارنٹ جاری ہو گیا کسی طرح وارنٹ کی تعمیل ہونے سے پہلے ان کو خبر ہو گئی۔ بے چارے اپنے بعض مخلصوں کے مکان میں روپوش ہو گئے۔ طبقات میں ہو کر

جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے بھی روپوشی کے اس زمانہ میں ابراہیم کو محروم ہونا پڑا۔

ج ۶ ص ۱۵۳

حکومت کے نمائندے ان کے سراغ میں لگے ہوئے تھے، اب یہیں سے سننے کی بات ہو جس زمانہ میں یہ واقعہ میری نظر سے کتابوں میں گزرا حیران ہو کر رہ گیا، سوچتا تھا کہ دین اور حقیقی علوم کی وفاداریوں میں لوگ کیا اس حد تک بھی جا سکتے ہیں؟ عرض کر چکا ہوں کہ اسی کوفہ میں ابراہیم نخعی کے ایک ہم نام بزرگ ابراہیم تیمی بھی رہتے تھے۔ غریب آدمی تھے بسا اوقات گزر جاتے اور باضابطہ کھانا کھانے کا موقعہ نہ ملتا جو کچھ بھی مل جاتا اسی سے سد رمق کا کام لیتے۔ آخر میں کوفہ کی مسجدوں میں گھوم گھوم کر وعظ کہا کرتے تھے۔ ان کی عبادت زہد و ریاضت کے قصے کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں جس چیز کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہو کہ حجاج کے کارندے جو ابراہیم نخعی کی تلاش میں تھے ایک دفعہ ابراہیم تیمی کے پاس پہونچے اور بولے کہ ابراہیم کو تم جانتے ہو۔ امیر یعنی حجاج کا حکم ہو کہ ان کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے" ابراہیم تیمی کا بیان ہو کہ میں یہ جانتا تھا کہ ابراہیم نخعی کے متعلق مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں لیکن نخعی کے لفظ کا اضافہ انہوں نے نہیں کیا تھا اس لئے جواب میں میں نے کہا کہ۔

انا ابراھیم۔ ابراہیم کو پوچھتے ہو، تو وہ میں ہوں یعنی میرا نام ابراہیم ہو۔

پکڑنے والوں نے آپ کو پکڑ لیا اور گرفتار کر کے خونی حجاج کے دربار کی طرف لے چلے۔ حجاج کے سامنے پیش کر دیئے گئے جانتے ہیں کہ صرف اتنی بات کہ میں" نخعی ابراہیم نہیں ہوں" ان کی برأت کے لئے کافی ہو سکتی ہو، لیکن خاموش حجاج کے سامنے کھڑے رہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ واسط کے جیل خانہ دیماس نامی میں ان کو قید کر دیا جائے۔ واسط روانہ کر دیئے گئے بیان کیا گیا ہو طبقات میں بھی ہو کہ واسط کا یہ جیل خانہ اس طریقہ سے بنایا گیا تھا کہ نہ اس پر چھت ڈالی گئی تھی اور نہ ایسے حجرے اور مکانات بنائے گئے تھے جن میں قیدیوں کو کم از کم دھوپ، بارش، سردی سے پناہ ملتی۔ بلکہ صرف چار دیواری تھی، اسی کے میدان میں لوگوں کو ڈال دیا جاتا تھا۔ خصوصیت اس قید خانے کی یہ بھی تھی کہ ایک قیدی کے ساتھ دوسرے قیدی کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا تھا بے چارے ابراہیم تیمی کے ساتھ یہ سب کچھ کیا گیا کسی اجنبی قیدی کے ساتھ ان کو بھی باندھ دیا گیا اور اسی حال میں وہ جیل کے اندر ڈال دیئے گئے۔ ماں کو ان کی خبر ہوئی، بچے کی محبت میں بیچاری کوفہ سے کسی نہ کسی طرح جیل تک پہونچیں، جیل والوں کی اجازت سے بیٹے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی اجازت مل گئی لیکن اس عرصہ میں ابراہیم تیمی کی شکل و صورت اتنی بدل چکی تھی کہ ماں بھی اپنے بیٹے کو پہچان نہ سکی ماں کو دیکھ کر خود ہی ابراہیم نے ان کو مخاطب

گیا" تب آواز سے انہوں نے اپنے بچے کو پہچانا۔ ناقابل برداشت حد سے گزری ہوئی ان تکلیفوں کے بعد بھی ماں کمک پر راز انہوں نے ظاہر نہیں کیا کہ نام سے دھوکا کھا کر ابراہیم نخعی کی جگہ اس جیل میں مجھے لوگوں نے ٹھونس دیا ہے۔ بس ماں اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی اور بچہ اپنی ماں کو۔ ابراہیم تیمی کو چھوڑ کر ان کی والدہ ماجدہ روتی ہوئی واپس ہوگئیں۔ ان کی لا پتہ کے بعد کہتے ہیں کہ اپنے سینے میں اسی راز کو دبائے ہوئے ابراہیم تیمی کا جیل خانے ہی میں انتقال ہوگیا۔ حجاج واسط ہی میں تھا، خواب میں دیکھا کہنے والا کہہ رہا ہے۔

"آج واسط میں ایک جنتی آدمی مرگیا"

صبح کو معلوم ہوا کہ جیل میں ابراہیم نامی قیدی کا انتقال ہوگیا۔ ہٹ دھرم حجاج جھنجھلا کر بولا۔

"شیطانی خواب تھا جو رات میں نے دیکھا"

لکھا ہے کہ ابراہیم تیمی بے چارے کو ابراہیم نخعی باور کرتے ہوئے شتر کینہ حجاج نے حکم دیا کہ واسط کے گھورے پر ابراہیم کی لاش پھینک دی جائے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ حجاج کی اس مذبوحی حرکت پر ابراہیم کی بہشتی روح ہنستی ہوگی۔ جو ابراہیم نہیں تھا ابراہیم کا خاکی لباس تھا۔ حجاج اسی کو گھورے پر ڈال کر خوش ہو رہا تھا، المسعودی نے مروج میں نقل کیا ہے کہ جس وقت ابراہیم تیمی واسط کے جیل خانے میں داخل ہوئے تو سامنے ایک ٹیلہ تھا جس پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکار رہے تھے۔

جو آج اللہ کی آزمائش میں ہیں ان لوگوں کو خدا ہی کی طرف سے عاقبت وراحت کی خوش خبری ہو اور آج اپنے آپ کو جو عافیت میں پا رہے ہیں خدا کی آزمائش کا ان کو انتظار کرنا چاہیئے۔ لوگو! ذرا صبر سے کام لو، ذرا ٹھہر جاؤ۔"

(ابن کامل ۶ صفحہ ۱۰۵)

حجاج بھی چلا گیا اور ابراہیم بھی چلے گئے۔ حجاج نے دنیا کی حکومت کے حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کا ایک ریکارڈ قائم کیا، لیکن دیکھا گیا کہ حجاج اور جس حکومت کے لئے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا، ایک چلہ بھی سالوں کے حساب سے پورا نہ کر سکی اور جو کچھ انجام اس کا ہوا اسے بھی دنیا دیکھ چکی، اجمالی الفاظ میں اس کا ذکر گزر چکا اور ابراہیم تیمی نے اپنے آپ کو ختم کر کے ابراہیم نخعی کو اور ان کے فقہی کارنامہ کو بچا لیا۔ شاید کہا جا سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے گرد و پیش کے کروڑ حنفی مسلمانوں کی دینی زندگی کے نظام کی بقا میں دوسرے اسباب کے ساتھ ابراہیم تیمی کی یہ حیرت انگیز تاریخی وفاداری بھی شریک ہے۔ ولمثل

ھذا فلیعمل العاملون۔

شاید دنیا کی قوموں میں ابراہیم تیمی کی استقامت وتحمل ورازداری کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہو۔ وفی

ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

شائقین الفرقان کے لیے

مژدہ

جنوبی افریقہ کے ایک صاحب خیر نے یکصد روپیہ بد زکوٰۃ دفتر کو ارسال فرمایا ہے، الفرقان کے جو شائقین پورا چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اگر صرف تین روپے ارسال کریں گے تو ان کے حساب میں ڈھائی اس رقم سے شامل کرکے انکے نام الفرقان سال بھر کے لیے جاری کردیا جائے گا۔ اس طور پر پچاس اشخاص اس رقم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

تین روپے منی آرڈر سے پیشگی آنے چاہئیں اور کوپن پر اس اعلان کا حوالہ ہونا چاہیے۔

منیجر الفرقان لکھنؤ

مختصر فہرست کتب خانۂ الفرقان۔ لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ضرور ملاحظہ فرمالیجئے!

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اُردو میں ضرور لکھئے، اور اگر ہو سکے تو انگریزی میں بھی لکھ دیجئے!۔
(۲) اگر آپ صرف ایک دو روپئے کی کتابیں منگوائیں گے تو محصول ڈاک کا بار بہت زیادہ پڑ جائے گا اور اگر زیادہ منگوائیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوائیں گے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے بہت کم ہو جائے گا، اور آپ نفع میں رہیں گے۔

پاکستانی احباب کی خدمت میں!

(۳) آپ حضرات کو جو کتابیں منگوانی ہوں اُن کی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے، پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور دس آنے رجسٹری فیس و صرفہ پیکنگ کا اضافہ کر کے کل رقم ذریعۂ منی آرڈر "ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور" کے نام روانہ کر دیجئے اور ڈاک خانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیجدیجئے، یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو روانہ کر دی جائیں گی۔
(۴) یاد رکھئے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے ہندوستان سے پاکستان جا سکتے ہیں، لیکن ایک کتاب کے دو نسخے بھی نہیں جا سکتے۔

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

جلد اوّل معارف الحدیث	اسلام کیا ہے؟ نیا اڈیشن	کلمۂ طیبہ کی حقیقت	نماز کی حقیقت	آپ حج کیسے کریں	آسان حج
مجلد [illegible]، غیر مجلد [illegible]	قسم اعلیٰ مجلد [illegible]، قسم دوم غیر مجلد [illegible]	قیمت:- ۶ر آنے	قیمت:- ۱۲ر آنے	قسم اول مجلد [illegible]، دوم غیر مجلد [illegible]	حج کیسے کریں کا خلاصہ جیبی سائز، قیمت:- ۱ر آنے

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت	ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ	امام ولی اللہ دہلویؒ از مولانا سندھی مرحوم	اسلام اور نظام سرمایہ داری	بوارق الغیب حصۂ دوم
قیمت:- [illegible]	قیمت:- [illegible]	قیمت:- [illegible]	قیمت:- ۸ر	قیمت:- [illegible]

دیوبند اور بریلی کے اختلافات پر فیصلہ کن مناظرہ	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ
اکابر جماعت دیوبند پر سنگین الزامات مولانا احمد رضا خانصاحب کے قلم سے اور تحقیقی و تشفی بخش جوابات مولانا نعمانی کے قلم سے قیمت [illegible]	قادیانی مذہب اور اسکے بانی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مولانا نعمانی کا یہ مختصر رسالہ کافی ہے۔ قیمت صرف:- ۶ر

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

اس رسالہ میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے دلنشین اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر کے مطالعہ سے نور یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اُردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں تو کلمہ کے متعلق کوئی اور ایسا محققانہ اور عارفانہ رسالہ موجود نہیں ہے جس سے عقل اور جذبات اور دل و دماغ یکساں طور پر متاثر ہوں۔

تازہ اڈیشن —— قیمت:- [illegible]

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا محمد منظور نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی رُوح و حقیقت سے واقف ہونے کے لئے اور اپنی نمازیں روحانیت اور نورانیت پیدا کرنے کیلئے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ نماز کے متعلق کتاب و سنّت کے لطیف اشارات، اور ائمہ دین و معرفت خصوصاً امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عارفانہ افادات کا عطر کھینچ کر اس رسالہ کی صورت میں پیش کردیا گیا ہے۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ قیمت ۱۲/

آپ حج کیسے کریں؟

مرتبہ

مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حج و زیارت کے موضوع پر اب اُردو میں بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اس کا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے، اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے۔ قیمت:- مجلد قسم اوّل (۱۲/) غیر مجلد قسم دوم ([illegible])

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ ہے، کم تعلیم یافتہ حضرات کیلئے اپنے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے۔ قیمت:- ۶/

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی دینی دعوت

"تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی"

اس کتاب میں مولانا مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ ان کی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔

شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ نفیس۔

قیمت:- [illegible]

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ

"مولانا محمد منظور نعمانی"

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور ان کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعۂ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق و معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے ——— اس سے مولانا مرحوم کی دینی دعوت کی روح و حقیقت اور اس کے اصول و مقاصد اس کی گہرائیاں بھی معلوم ہوں گی اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور حکمت دین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا، اور امت مسلمہ کے امراض کی مولانا نے کیسی صحیح تشخیص کی تھی۔

کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ۔

قیمت:- ۱۲/

قرآن مجید سے متعلق کتابیں

تفسیر ابن کثیر (اردو)

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کی تفسیر جو عربی تفسیروں میں بھی بے نظیر اور مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے، اور جو سلف صالحین کی تفسیری محنتوں کا قابلِ اعتماد ذخیرہ ہے، اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر وہ پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں، اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے، پھر صحابہؓ کرام اور تابعین اور بعد کے ائمہ تفسیر کے ارشادات سے، یہ اس کا مکمل اردو ترجمہ ہے پانچ ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت مجلد مکمل سیٹ ([illegible] روپے)

تفسیر بیان القرآن

(از حکیم الامت حضرت مولٰنا تھانویؒ)

مکمل بارہ جلد۔ طبع ہندوستان [illegible] روپیہ

بیان القرآن مطبوعہ تاج کمپنی پاکستان

لاہور کی تاج کمپنی اپنے خاص طرز پر نہایت اہتمام کے ساتھ بیان القرآن کو چھاپ رہی ہے اب تک چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں ہر جلد میں ڈھائی پارہ کی تفسیر ہے۔ قیمت فی جلد [illegible] (واضح رہے کہ اس میں بیان القرآن کا عربی حصہ نہیں لیا گیا ہے)۔

تفسیر ماجدی

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی اردو تفسیر قرآن کی دو جلدیں تاج کمپنی لاہور کی طرف سے چھپ گئی ہیں حسنِ طباعت کیلئے تاج کمپنی کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت جلد اول مجلد [illegible] جلد دوم مجلد [illegible] جلد سوم [illegible]

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

قرآن پاک میں انبیاء علیہم السّلام کے سوانح حیات، ان کی امتوں اور مختلف قوموں کی شخصیتوں کے جو قصص و واقعات مذکور ہیں اس کتاب میں انھیں بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بلاشبہ یہ کتاب ایک مذہبی و تاریخی شاہکار ہے ——

جلد اوّل: حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک۔ قیمت: [illegible]

جلد دوم: حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات۔ قیمت: [illegible]

جلد سوم: انبیاء علیہم السّلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان۔ [illegible]

جلد چہارم: حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات۔ قیمت: [illegible]

الحیوانات فی القرآن

(از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

قرآن مجید میں جتنے حیوانات کا کہیں ذکر آیا ہے، ان کے متعلق لغوی تحقیقات اور تاریخی و تفسیری مباحث کا ایک علمی مرقع۔ قیمت: [illegible]

قرآنی جغرافیہ: از مولانا موصوف قیمت [illegible]

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کو سمجھنے کیلئے اپنے انداز کی بالکل ہی نئی کتاب۔ اصل [illegible] انگریزی میں تھی، اردو ترجمہ ڈاکٹر [illegible] [illegible]

لغات القرآن

(تالیف مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی)

اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے، اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے —— چار جلدیں تیار ہیں۔ آخری پانچویں جلد عنقریب تیار ہونے والی ہے۔ قیمت جلد اوّل [illegible]، جلد دوم [illegible]، جلد سوم [illegible]۔ جلد چہارم [illegible]۔

قاموس القرآن

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

اس میں تمام الفاظِ قرآنی کا صحیح اردو ترجمہ اور ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کی گئی ہے، نیز قرآن کریم کے تمام وضاحت طلب الفاظ پر سلیس و شیریں زبان میں مختصر مگر جامع اور مستند نوٹ لکھے گئے ہیں۔ قیمت [illegible]

ترجمۂ قرآن کا مکمل نصاب

(از جناب مولانا محفوظ الرحمٰن نامی)

مفتاح القرآن حصّہ اوّل [illegible]، دوم [illegible]، سوم [illegible]، چہارم [illegible]، پنجم [illegible]

معلم القرآن ... ... [illegible]

مصباح اللغات اردو میں عربی زبان کا سب سے زیادہ جامع اور مبسوط لغت، مجلد [illegible]

اردو عربی ڈکشنری ... ... [illegible]

قرآن اور تعمیرِ سیرت از ڈاکٹر میر ولی الدین [illegible]

قرآن اور تصوف از ڈاکٹر [illegible]

حدیث شریف سے متعلق کتابیں

صحیح بخاری شریف (مکمل اُردو)

سات ہزار سے زائد صحیح حدیثوں کا مجموعہ
یہ بخاری شریف کا مکمل اُردو ترجمہ ہے جو بہت اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ تین ضخیم جلدیں ہیں۔ قیمت کامل مجلد /۲۷ روپیہ

جامع ترمذی شریف (اُردو)

ترمذی شریف کو صحاح ستہ میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ امام ترمذی نے اس کا التزام کیا ہے کہ ہر باب میں حدیثیں درج کرنے کے ساتھ وہ ائمہ امت کا مذہب بھی لکھتے ہیں ——— یہ اس کا مکمل اُردو ترجمہ ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔
قیمت مجلد /۱۸ روپیہ

مشکوٰۃ شریف (اُردو)

چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا مجموعہ
مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتبخانہ کا جامع انتخاب کہا جا سکتا ہے، اس میں حدیث کی گیارہ کتابوں، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، مؤطا امام مالک، مسند شافعی، مسند احمد، بیہقی و دارمی کی منتخب حدیثیں آگئی ہیں، یہ اس کا مکمل ترجمہ ہے جو پورے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ دو ضخیم جلدیں۔ قیمت مجلد [illegible] روپیہ۔

الابواب والتراجم

صحیح بخاری شریف کے تراجم ابواب پر حضرت شیخ الہند کا قابل قدر رسالہ۔ اُردو زبان میں۔
قیمت :- [illegible]

افادات محمود از شیخ الہند قیمت [illegible]

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی

حجۃ اللہ البالغہ

مع ترجمہ اُردو

اسلامی اسرار و حقائق کے بیان اور احادیث نبویہ کی عارفانہ اور حکیمانہ تشریح میں یہ کتاب بلا شبہ پورے اسلامی کتبخانہ میں بے نظیر ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اسکے بارہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار کردہ و حکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق واقع شدہ"

اس کتاب کے دو اُردو ترجمے پہلے بھی شائع ہوئے تھے، لیکن اب اصح المطابع کراچی نے اس کو تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی مرحوم کے بہترین ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اصل عربی متن بھی ساتھ چھاپا گیا ہے۔ علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بہترین علمی تحفہ ہے۔ اعلیٰ کاغذ اعلیٰ کتابت و طباعت۔ دو ضخیم جلدیں
قیمت مجلد :- [illegible]

نصرۃ الحدیث

از حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

حدیث پر منکرین حدیث کے حملوں کے جواب میں اب بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن اپنی علمی اور تحقیقی خصوصیات کے لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر اب بھی ممتاز ہے۔ بہترین کتابت و طباعت۔
قیمت :- [illegible]

ترجمان السنّہ

از حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مدینہ منورہ

حدیث کی ایک نہایت مبسوط اور جامع کتاب اردو ترجمہ اور تشریح کیساتھ، ہر جلد بجائے خود بھی علوم و معارف کا ایک مستقل خزانہ ہے۔ قیمت جلد اول [illegible] جلد دوم [illegible] جلد سوم بھی تیار ہو کر آگئی ہے۔ قیمت :- [illegible]

حدیث کا ایک اہم تاریخی مجموعہ

صحیفۂ ہمام بن منبّہ

ہمام بن منبہ، مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیا تھا، اور یہ اسی سے روایت کیا کرتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اس کا صرف تذکرہ ملتا تھا، ہمارے زمانہ کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے اس کا نسخہ کسی طرح حاصل کیا اور اپنے فاضلانہ مقدمہ اور ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قدر دانوں کیلئے بڑا قابل قدر تحفہ ہے۔ قیمت :- [illegible]

زادِ سفر

امام نوویؒ کی بہترین کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے قلم سے (اردو جلدوں میں)، شروع میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت جلد اول مجلد کاغذ بہتر [illegible] غیر مجلد کاغذ معمولی [illegible] جلد دوم مجلد کاغذ بہتر [illegible]

[illegible] غیر مجلد کاغذ معمولی [illegible]

اپنی حالت اور ضرورت کے مطابق کتابوں کا انتخاب کیجئے!

فقہ و فتاوی

فتاوی دار العلوم دیوبند مرتبہ مفتی مولانا محمد شفیع صاحب دار العلوم دیوبند کا یہ مستند فتاوی آٹھ جلدوں میں ہے۔ قیمت۔ کامل ... ... عنٰعہ/
اختری بہشتی زیور مکمل، مجلد ... لٰعہ/

"الجواب المتین"
اس میں ڈیڑھ سو فقہی سوالات کا جواب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے دیا گیا ہے۔ قیمت ۸/

"احکام العیدین" ... ۸/

چند قابل مطالعہ کتابیں
"دین و دانش" از پروفیسر محمود علی سائنس کی روشنی میں اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی ہے، اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ جواب نایاب ہے۔ قیمت:۔ صہ/

"معارف القرآن" اسلامی تعلیمات کا فلسفہ۔ قیمت عہ/

"عہد نبوی میں نظام حکمرانی" (از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب) مجلد للعہ/

"سد باب ذریعہ" (اردو) علامہ ابن قیم کی ایک اہم کتاب کا ترجمہ۔ قیمت ۱۰/

"ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" (از مولانا مسعود عالم مرحوم) عہ/

"یہ مظلوم اور بر ما و ..." [illegible] (ہمارے ہندوستانی بھائیوں کا حال)

قیمت ... [illegible]

بہت مفید چند کتابیں

ارشاد السالکین:۔
ہر دیندار اور طالب خدا کے پاس رہنے کے لائق۔ یہ نہایت مفید اور موثر کتاب ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کو بجا طور سے تصوف کے مکتب خانہ کا عطر کہا جا سکتا ہے۔
قیمت مجلد ... ... عیہ/

ہر مسلمان کے گھر میں
یہ کتابیں رہنی چاہئیں
زبان آسان، معلومات مستند

سراپائے رسول ... ۱۴/
رسول پاک کی صاحبزادیاں ۱۲/
ہمارے نبی کے صحابہ ... عنہ/
رسول اللہ کے دو محبوب ۸/
عہد نبوی کے دو بچے (حضرت عبد اللہ بن عمرؓ و حضرت ابن عباسؓ) عہ/
درگاہ رسول کے دو طالب علم (حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت ابن مسعودؓ) ... ... عہ/
سیرت حضرت امام حسنؓ ۱۳/

ہمارے بچوں کا نصاب
جس کا پڑھنا دل میں ایمان کی جڑ مضبوط ہونے کی ضمانت ہے

اللہ کے رسول ۶/
حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، عثمانؓ ۶/، علیؓ ۶/
اچھا قاعدہ ۲/، اچھے قصے ۶/
اچھی باتیں ... ۸/
[illegible] ۸/
[illegible]

اکابر علماء اور مشاہیر امت کی تالیفات

عقد الجید (مع ترجمہ اردو)
اجتہاد اور تقلید کے موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی محققانہ تالیف ہے۔ قیمت ... عہ/

"سطعات" شاہ صاحب موصوف کی اہم عارفانہ تصنیف سطعات کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۱۴/

"مسئلہ تفضیل شیخین" حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ کا فارسی رسالہ (مع اردو ترجمہ) ۴/

تالیفات مولانا محمد قاسمؒ
تقریر دلپذیر ۸/ہے
حجۃ الاسلام ۱۰/
مباحثہ شاہجہانپور عہ/
میلہ خدا شناسی ۴/
انتصار الاسلام ۸/
تصفیۃ العقائد ۴/
الدلیل المحکم ۴/
"اوثق العریٰ" از حضرت گنگوہیؒ ۲/
سبیل الرشاد ۳/
فتاوی میلاد شریف ۳/
"التصدیقات" از حضرت سہارنپوریؒ ... ... عہ/
"الابواب والتراجم" از شیخ الحدیث ... ... عہ/
[illegible] ۸/
[illegible] ... عہ/
[illegible]

ضیاء القلوب (فارسی) از حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ ۸/
ضیاء القلوب مع ترجمہ اردو عہ/
ارشاد مرشد مع فیصلہ ہفت مسئلہ

حضرت تھانوی
بہشتی زیور (اختری) للعہ/
تعلیم الدین (کاغذ معمولی) مجلد عہ/
حیات المسلمین ۱۴/
اصلاح الرسوم عہ/
اعمال قرآنی (مکمل) ۱۰/
احکام العمل ۸/
الانتباہات المفیدہ ۸/
شوق وطن ۶/
قصد السبیل ۳/
مناجات مقبول (مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ترجمہ اور شرح کے ساتھ، مطبوعہ کلکتہ) مجلد عہ/

حکیم الامت (از مولانا دریابادی) للعہ/
الحیوانات فی القرآن عہ/
قرآنی جغرافیہ عہ/
سفرنامہ حجاز صہ/
مشرق اوسط میں کیا دیکھا؟ مجلد عہ/
حسن معاشرت ۱۲/
غسالی حکمران مجلد للعہ/
مضامین مولانا احمد سعید صاحب عہ/
فضائل الشہور والایام ۸/
[illegible] ۶/
[illegible]
[illegible]

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.